مقالاتِ گیلانی



محققُ العصر حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کے علمی و تحقیقی، تبلیغی و اصلاحی
اور تاریخی و سیاسی مقالات و مضامین کا نہایت مفید اور حسین مجموعہ

مرتبہ
سید حافظ اکبر شاہ بخاری



مکتبہ عمر فاروقؓ

مقالاتِ گیلانی

محقق العصر حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے علمی و تحقیقی،
تبلیغی و اصلاحی اور تاریخی و سیاسی مقالات و مضامین کا نہایت مفید اور حسین مجموعہ

مرتبہ
سید حافظ قاری اکبر شاہ بخاری

مکتبہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ
4/491 شاہ فیصل کالونی کراچی
Tel: 021-34594144 Cell: 0334-3432345

نام کتاب .... مقالاتِ گیلانی
افادات .... سید حافظ قاری اکبر شاہ بخاری
اشاعتِ اول .... اگست 2012ء
تعداد 1100
طابع .... القادر پرنٹنگ پریس کراچی
ناشر .... مکتبہ عمر فاروق 4/491 شاہ فیصل کالونی کراچی
021-34594144 Cell: 0334-3432345
ای میل .... M farooq.12317@yaho.com



ملنے کے پتے

دارالاشاعت، اردو بازار کراچی
اسلامی کتب خانہ، علامہ بنوری ٹاؤن کراچی
قدیمی کتب خانہ، آرام باغ کراچی
ادارۃ الانور، علامہ بنوری ٹاؤن کراچی
مکتبہ رشیدیہ، سرکی روڈ کوئٹہ
کتب خانہ رشیدیہ، راجہ بازار راولپنڈی
مکتبہ العارفی، جامعہ امدادیہ ستیانہ روڈ فیصل آباد
مکتبہ رحمانیہ، اردو بازار لاہور
مکتبہ سید احمد شہید، اردو بازار لاہور
مکتبہ علمیہ، جی ٹی روڈ اکوڑہ خٹک ضلع نوشہرہ
وحیدی کتب خانہ، محلہ جنگی قصہ خوانی بازار پشاور

فہرست مقالاتِ گیلانیؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

محقق العصر مؤرخ اسلام مولانا سید مناظر احسن گیلانی ؒ دارالعلوم دیوبند کے مایۂ ناز فضلاء میں سے تھے، ان کا علم وفضل اور زہد وتقویٰ مسلم تھا، ساری عمر تدریس وتبلیغ اور تصنیف و تالیف میں گزاری تھی، متعدد تصانیف اور سینکڑوں مقالات ومضامین منظر عام پر آئے۔ حضرت شیخ الہندؒ، مولانا محمود حسنؒ، امام العصر علامہ انور شاہ کشمیریؒ اور شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا اور ان کے عمل وعلم سے خوب استفادہ حاصل کیا تھا۔ حکیم الامت تھانوی اور دیگر اکابر سے خاص باطنی تربیت حاصل کی۔ ماہنامہ القاسم دیوبند اور ماہنامہ الرشید دیوبند کے مدیر بھی رہے اور مقالہ نگار بھی، دارالعلوم دیوبند میں رہ کر تبلیغ واشاعت کی خدمت سرانجام دی اور آخری تصنیف ''سوانح قاسمی'' دو جلدوں میں حکیم الاسلام حضرت قاری محمد طیب قاسمی کی فرمائش پر تالیف کی۔ زیر نظر کتاب ''مقالات گیلانی'' میں حضرت کے قلم سے لکھے ہوئے چند مقالات و مضامین جمع کئے گئے ہیں، جو ماہنامہ القاسم دیوبند، ماہنامہ الرشید دیوبند، ماہنامہ الفرقان لکھنؤ اور دیگر رسائل وجرائد میں طبع ہوئے تھے، اب ان کو یکجا کتابی صورت میں مکتبہ معارف القرآن کراچی سے شائع کیا جارہا ہے۔ جزاکم اللہ احسن الجزاء۔

حق تعالیٰ شانہ مولانا جلیل اشرف زید مجدد کو اسکا اجر عظیم عطا فرمائیں کہ انہوں نے اپنے مکتبہ معارف القرآن سے اس عظیم الشان مجموعہ کو شائع کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے سب مسلمانوں کیلئے نافع ومفید فرمائے، آمین۔

احقر محمد اکبر شاہ بخاری
مرکز تبلیغ مجلس
مدرسہ اشرفیہ احتشام العلوم
جامع مسجد عثمانیہ جام پور
ضلع خیر پور (پنجاب)

محقق اسلام
حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ

محقق اسلام حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ موجودہ صدی کے عظیم اسلامی متکلم، مفکر اور مؤرخ تھے، ان کے بزرگ دو ڈھائی صدی پہلے عرب سے ایران ہوتے ہوئے برصغیر پاک وہند وارد ہوئے، اس خاندان کی ایک شاخ نے ضلع پٹنہ میں ایک بستی ''گیلانی'' کے نام سے بسائی، اگر اس بستی میں مولانا مناظر احسن جیسی نادرۂ روزگار ہستی نے جنم نہ لیا ہوتا، تو عین ممکن ہے کہ اس کی شہرت ضلع پٹنہ کی حدود سے متجاوز نہ ہوتی۔ مولانا موصوف ۹ ربیع الاول ۱۳۱۰ھ بمطابق ۱۸۹۲ء میں پیدا ہوئے۔ مولانا کے نام کے ساتھ ''گیلانی'' اسی بستی کی نسبت ہے، یہ نسبت ہرگز، یعنی: شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے متعلق نہیں ہے۔ مولانا گیلانی کا خاندان ذی وجاہت تھا، مالی فارغ البالی اور علمی اعتبار سے گردونواح کے دیہات میں نمایاں تھا، ان کے والد ماجد ابوالخیر صاحب زمینداری میں مشغول تھے، مگر ان کے چچا ابونصر صاحب شعر وسخن کی مجلسیں جماتے اور علم وفضل کی محفلیں برپا کرتے تھے، ان کے جد امجد سید احسن صاحب اس علاقے میں جید عالم گزرے ہیں، غالبًا انہی کی مناسبت سے ان کا نام رکھا گیا تھا۔ مولانا گیلانی کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ تیرہ چودہ سال کی عمر میں راجپوتانہ کی مسلم ریاست ٹونک بھیج دیئے گئے، جہاں خیرآبادی سلسلہ کے چراغِ سحر اور جامع معقولات مولانا سید حکیم برکات احمد کی مسندِ درس علم کے پروانوں کو سمیٹے ہوئے تھی۔ مولانا مناظر احسن صاحبؒ نے ان سے چھ سال تک دینی علوم کے علاوہ منطق وفلسفہ کا درس لیا۔ کچھ عرصہ اجمیر میں مولانا ٹونکیؒ کے شاگرد مولانا معین الدین صاحب سے مذاکراتی استفادہ کیا، لہذا انہیں بھی ''استاذ'' کہہ کر یاد کیا کرتے تھے۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے بعد حدیث کی تحصیل کیلئے دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے اور یگانۂ روزگار علماء سے استفادہ کیا۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ سے نہ صرف ترمذی اور بخاری شریف کا درس

لیا، بلکہ ان سے بیعت بھی کی۔ امام العصر محمد انور شاہ کشمیریؒ سے مسلم شریف کا درس لیا۔ ان کے علاوہ دوسرے اساتذہ میں شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، مفتی اعظم مولانا عزیز الرحمٰن عثمانیؒ، فخر الہند مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ اور سید العلماء مولانا سید اصغر حسین دیوبندیؒ شامل ہیں۔

آپ نے ۱۳۳۱ھ میں دارالعلوم میں داخلہ لیا اور ۱۳۳۲ھ میں دورۂ حدیث میں شریک رہ کر کتبِ حدیث کی سند حاصل کی، دورانِ تعلیم میں آپ اپنی خداداد صلاحیتوں کی وجہ سے اپنے اساتذۂ گرامی کے منظورِ نظر رہے اور ان کے فیضِ علمی و روحانی سے خوب خوب مالامال ہوئے۔

علمی وتدریسی خدمات

دورۂ حدیث کے اختتام کے ساتھ ہی آپ دارالعلوم دیوبند کے ماہانہ مجلہ ''القاسم'' سے منسلک ہوگئے، یہ تعلق ۱۳۳۹ھ تک قائم رہا۔ دارالعلوم کے آرگن کے کرتا دھرتا بننے کا شرف مولانا کیلئے کچھ کم نہ تھا، لیکن اسکے ساتھ ساتھ آپ نے اپنے علمی اور تحقیقی مضامین اور والہانہ طرزِ نگارش سے علمی و ادبی حلقوں میں نمایاں مقام حاصل کرلیا تھا۔ ''سوانح ابوذر غفاری'' اور ''کائنات روحانی'' دونوں کتابیں آپ کے اسی دور کی یادگار ہیں، پھر حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ کی سفارش سے مولانا گیلانی کا حیدرآباد دکن کے جامعہ عثمانیہ میں تقرر ہوگیا، جہاں جلد ہی شعبۂ دینیات کے صدر منتخب ہوگئے اور تقریباً پچیس برس تک حیدرآباد میں علمی وتدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ اس دوران ہزاروں افراد نے آپ کے درس وتربیت سے فیض حاصل کیا۔ حیدرآباد دکن کے قیام کے بارے میں جناب اختر راہی ایم اے لکھتے ہیں:

''حیدرآباد دکن نے اردو یونیورسٹی ''جامعہ عثمانیہ'' کے نام سے قائم کی تھی، جو اپنے مخصوص طرزِ تعلیم کی وجہ سے ہندوستان بھر میں اپنی مثال آپ تھی اور روز بروز ترقی کررہی تھی، روزافزوں ترقی کے ساتھ شعبۂ دینیات میں ایک عالم کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اتفاقاً مولانا گیلانیؒ حیدرآباد گئے اور اپنے دور کے بڑے مفسر مولانا حمید الدین فراہیؒ سے

ملاقات ہوئی۔ مولانا فراہیؒ نے انکی ذات میں جوہرِ قابل تلاش کرلیا اور جامعہ عثمانیہ چلے آنے کی خواہش کا اظہار کیا، مگر مولانا گیلانیؒ دارالعلوم دیوبند چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوئے، لیکن جب خود دیوبند کے بزرگوں نے اس مشورے کی تائید کی، تو وہ جامعہ عثمانیہ جانے پر رضامند ہوگئے"۔

۱۳۳۸ھ م ۱۹۲۰ء میں لیکچرار دینیات کی حیثیت سے مولانا کا تقرر ہوا، ترقی کرتے کرتے ریڈر بنے، پروفیسر ہوئے اور آخر کار کئی سال تک صدر شعبۂ دینیات کے فرائض انجام دے کر ۱۳۶۸ھ میں ریٹائر ہوئے اور وظیفہ یاب بھی ہوئے۔ حیدرآباد دکن میں مولانا گیلانی کو مولانا حمید الدین فراہیؒ کی صحبت میسر آئی، مطالعہ قرآن میں ان سے مدد لی، ان کی طرزِ فکر اور اعتدالِ نگاہ، مولانا فراہیؒ کی صحبت کا نتیجہ ہے۔ مولانا گیلانی حیدرآباد کے بارے میں لکھتے ہیں:

"یہ کورنصیب گو حیدرآباد میں پیدا نہیں ہوا تھا، مگر میرے جسم میں جو کچھ ہے، حیدرآباد ہی کا ہے۔ اب بھی حیدرآباد ہی میرے سدِ رمق کا ذریعہ ہے، پھر اپنی محبوب تعلیم گاہ ہے، ہماری جامعہ عثمانیہ جس میں میرے دماغ و دل نے آنکھیں کھولیں، اسی کے ماحول میں میری پرورش ہوئی"۔ (ماہنامہ الحق، اکوڑہ خٹک، دسمبر ۱۹۷۹ء)

مولانا گیلانیؒ وسعتِ نظر، علمی تبحر اور دینی مسائل میں دسترس کی وجہ سے شعبۂ اسلامیات کی روحِ رواں تھے، اساتذہ اور طلباء میں یکساں مقبول تھے، یونیورسٹی کی سینٹ مولانا کے وجود کو اتنا قیمتی خیال کرتی تھی کہ مدتِ ملازمت میں توسیع ہوسکتی تھی، مگر سقوطِ حیدرآباد نے دنیا ہی بدل ڈالی، نئی سیکولر ہندی نے شعبۂ دینیات کو اڑا دیا اور لادینی نظامِ تعلیم میں عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کیلئے شعبۂ اسلامیات قائم کیا گیا۔ جو جامعہ کے اعلیٰ مقاصد کے پیشِ نظر بے حقیقت تھا، چنانچہ مولانا اس جبری تنزل سے دل برداشتہ ہوگئے اور مدتِ ملازمت کے دن پورے ہوتے ہی وطن چلے آئے اور خود ان کے بقول کیفی زندگی بسر کرنے لگے، وطن واپس آنے کے بعد ان کی زندگی کا دورِ تنہائی شروع ہوا، اس فرصت میں ہمہ تن تصنیف و تالیف میں لگ گئے، ہزاروں صفحات لکھ ڈالے، ان کا قلم خوب جولانی دکھاتا رہا، مگر کیفی زندگی نے ان کا سکون لوٹ لیا۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ کی مجلسِ ماتم میں

شرکت کے لئے لکھنؤ گئے، وہاں سے واپسی پر دوسرے، یا تیسرے روز مکان میں چوروں کی کافی تعداد گھس گئی، جو کچھ ساتھ لے جاسکتی تھی لے گئی، مولانا گیلانی کے الفاظ ''صبح کو جب آنکھ کھلی، تو آنکھیں کھل گئیں''۔ ادھر مولانا کے اکلوتے صاحبزادے پاکستان میں مقیم تھے، ان کی طرف سے بھی فکر مند تھے، ضعیفی میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا، بیٹے کی جدائی اور غم آلام نے گھیر لیا۔

۱۹۵۳ء کے آخر میں قلبی شکایت کا حملہ ہوا اور فوری علاج معالجہ سے افاقہ ہوگیا، پھر ۱۹۵۴ء میں چند ماہ بعد شکایت عود کر آئی اور حملہ اتنا شدید ہوا کہ ڈاکٹروں نے تصنیف و تالیف پر مکمل پابندی عائد کردی۔ مولانا کا قلم پہلے حملے کے بعد اپنی پوری رفتار سے چل پڑا تھا، دل کے ہاتھوں رک گیا، دو سال تک تندرستی اور بیماری کے درمیان کش مکش چلتی رہی، اسی دور کے خطوط میں مولانا نے اس زندگی کو برزخی زندگی سے تعبیر کیا، الغرض اس آخری دور میں تین جلدوں میں ضخیم و جسیم ''سوانح قاسمی'' ترتیب دی۔ اس بارے میں مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ فرماتے ہیں کہ:

''میں نے سوانح قاسمی لکھنے کی فرمائش کی، تو بہت خوشی اور امنگ سے قبول کرتے ہوئے لکھا کہ میری علمی زندگی کی ابتدا ''القاسم'' ہی سے ہوئی تھی اور شاید انتہا بھی ''القاسم''، یعنی: مولانا نانوتویؒ پر ہوگی، چنانچہ یہی ہوا کہ سوانح قاسمی کی چوتھی جلد آپ نے شروع کی، پانچ صفحے لکھنے پائے تھے کہ عمر فانی نے جواب دیا اور القاسم پر ہی انتہا ہوگئی''۔

۵ جون ۱۹۵۶ء کو دن کے معمولات انجام دے کر خوابِ استراحت کے لئے لیٹے اور خواب ہی میں اللہ کو پیارے ہوگئے، پاس ہی لیٹے ہوئے بھائی کو بھی پتہ نہ چلا کہ چہیتا بھائی ایک طویل سفر کر کے اپنے اللہ سے جاملا۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون)

اللہ تعالیٰ درجات عالیہ نصیب فرمائے، آمین۔

تصنیف وتالیف

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب فرماتے ہیں کہ:

''حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ مشاہیر فضلائے دار العلوم دیوبند میں سے تھے،

صاحبِ طرز مصنف، نیز ذہن وذکاء اور طباعی منفرد تھے، تحصیل علوم سے فراغت کے بعد دارالعلوم کے آرگن رسالہ ''القاسم'' کے ایڈیٹر اور رئیس التحریر منتخب کئے گئے اور عرصہ دراز تک قلمی خدمات سے ہندوستان کے علمی حلقوں کو مستفید کرتے رہے۔ اس کے بعد حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب '' مہتمم دارالعلوم دیوبند کی سفارش پر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کے پروفیسر مقرر ہوئے، اس دوران بہت سی مفید اور علمی تصانیف آپ کے قلم سے نکلیں۔ ''کائناتِ روحانی''، ''سوانح ابوذر غفاری''، ''النبی الخاتم''، ''مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت''، ''اسلامی معاشیات''، ''امام بوحنیفہ کی سیاسی زندگی'' اور ''رحمۃ اللعالمین'' وغیرہ آپ کی مخصوص اور مشہور تصانیف ہیں۔ تصانیف اور علمی مقالات کا عدد بہت کافی ہے، جو مقبولِ خواص وعوام ہے۔ آخر میں احقر کی فرمائش پر ''سوانح قاسمی'' تین جلدوں میں مرتب کی، جو آپ کی تصانیف میں ایک شاہکار تصنیف ہے۔ اس کے علاوہ تقریر وخطابات نہایت عالمانہ، ادیبانہ اور پُر جوش ہوتی تھی۔ دقیقہ سنج اور نکتہ رس علماء میں آپ کا شمار ہوتا تھا اور ہندوستان کے مشاہیر علماء میں آپ کو ممتاز حیثیت حاصل تھی''۔ (تاریخ دارالعلوم دیوبند)

مولانا ابوالحسن علی ندوی فرماتے ہیں کہ:

''مولانا گیلانی اپنی ذات میں انجمن تھے، وہ عالموں میں عالم، ادیبوں میں ادیب، مؤرخوں میں مؤرخ، فقیہوں میں فقیہ، محدثوں میں محدّث، مفسروں میں مفسر اور محققوں میں محقق تھے، فارسی اردو ان کا یکساں مذاق تھا، شعروشاعری کا ذوق اور سخن شناسی وسخن سنجی دونوں سے حصہ وافر ملا تھا، وہ ہندوستان کی اس گذشتہ تہذیب وثقافت کی یادگار تھے، جب فقیہ المحدث کیلئے خشک ہونے اور عالم کیلئے شعر کو غیر موزوں پڑھنے کی شرط نہ تھی۔ مولانا کی تصانیف میں سے سب سے پہلے ''النبی الخاتم'' پڑھی، کتاب عجیب البیلے انداز میں لکھی گئی ہے، صحت ساوی کا انداز بیان، خطیبوں کا جوش و برجستگی، عشاق کی مستی اور وارفتگی، عقل وجذب کی لطیف آمیزش، حسبِ معمول معمولی اور مشہور واقعات سے نکتے اور عظیم نتیجے نکلتے جاتے ہیں اور وہ اس سرعت وکثرت کے ساتھ کہ پڑھنے والا مصنف سے شکایت کرنے لگتا ہے کہ ع

دامانِ نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار

میں نے اپنی ساری عمر میں سیرت نبوی ﷺ میں ''رحمۃ للعالمین'' اور ''النبی الخاتم'' سے زیادہ مؤثر کتاب نہیں پڑھی، کتاب پڑھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف علم و انشا پردازی کی کرشمہ سازی نہیں ہے، اس کے اندر ان کا سوزِ دروں اور خونِ جگر بھی شامل ہے اور واقعہ یہی ہے کہ۔

رنگ ہو یا خشت وسنگ چنگ ہو یا حرو صوت معجزۂ فن کی ہے خون جگر سے نمود

بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے۔ وسعتِ نظر، وسعتِ مطالعہ، رسوخ فی العلم اور ذکاوت میں مولانا کی نظیر اس وقت ممالک اسلامیہ میں ملنی مشکل ہے، (والغیب عند اللہ) تصنیف و تالیف کے لحاظ سے وہ عصرِ حاضر کے عظیم مصنفین میں شمار کئے جانے کے مستحق ہیں، انہوں نے اپنی کتابوں میں جو مواد جمع کیا ہے، وہ بیسیوں آدمیوں کو مصنف اور محقق بنا سکتا ہے۔ اس ایک آدمی نے تنِ تنہا وہ کام کیا ہے جو یورپ میں پورے پورے ادارے اور منظّم جماعتیں کرتی ہیں، ان جیسا آدمی برسوں میں پیدا ہوا کرتا ہے اور اب ان جیسا آدمی برسوں میں بھی پیدا نہ ہوگا''۔ (پرانے چراغ)

جناب مولانا سمیع الحق صاحب مدیر ماہنامہ ''الحق'' حضرت علامہ گیلانی کی مایۂ ناز تالیف ''النبی الخاتم'' پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

اکتوبر ۱۹۵۱ء کی بات ہے کہ ملتان کے ایک دینی مدرسہ کے جلسۂ دستار بندی میں شمولیت کا اتفاق ہوا، تقریب دستار بندی کے اختتام پر حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے فضلاء مدرسہ سے مختصر خطاب فرمایا اور اس وقت شاہ جی مرحوم کے ضعف وعلالت اور نقاہت کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا اور آسمان خطابت کا یہ آفتاب پوری طرح گرہن کی زد میں تھا۔ شاہ جی نے فضلاء کو دیگر نصائح اور ذمہ داریوں پر تنبیہ کے ساتھ ساتھ فتنۂ انکارِ حدیث پر توجہ دلائی، پھر حجیتِ حدیث کے ضمن میں حضرت علامہ گیلانی مرحوم کی کتاب ''تدوینِ حدیث'' کو سراہتے ہوئے اس کے مطالعہ پر زور دیا اور فرمایا:

''میں نے جب مولانا مناظر احسن گیلانی کی کتاب ''تدوینِ حدیث'' کا مطالعہ کیا تو مجھ پر وجد اور جذب کی حالت طاری ہوئی۔ حضرت گیلانی جب اس کتاب کو لکھ رہے تھے تو مجھے خیال ہوا کہ مولانا گیلانی اور صاحبِ مدینہ طیبہ ﷺ کے درمیان سارے حجاب ہٹا دئے

گئے ہیں اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بول مولانا گیلانی لکھ رہے ہیں۔ ''تدوینِ حدیث'' فتنہ انکارِ حدیث کی رد میں آخری قاطع اور کامیاب چیز ہے''۔

تدوین حدیث کی طرح شاہ جی مرحوم کی یہ بات علامہ گیلانی ؒ کی کتاب ''النبی الخاتم'' پر بھی صادق آتی ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ سیرت لکھتے وقت صاحبِ سیرت علیہ السلام کی خاص توجہات اور عنایات سیرت نگار کے شامل حال رہیں اور روح القدس کے فیضِ خاص سے مؤلف کی روح فیضاب ہوتی رہی۔ مبدا فیاض نے ان کی دستگیری کی اور عشق کی آگ اور سوز وگداز میں ڈوب کر مصنف نے صاحبِ محبوبیت کبریٰ کا ایک ایسا حسین مرقع ''النبی الخاتم'' کے نام سے تیار کیا، جو دردوسوز، جذب و وجد کے ساتھ ساتھ استناد وتحقیق اور استخراج نتائج کا شاہکار ہے۔ کتاب کا اندازِ بیان ایسا ہے کہ آسمانی صحیفوں اور الہامی عبارتوں کا گمان ہوتا ہے۔ اگر کسی دوسری کتاب کی تلاوت جائز ہوتی، تو جی چاہتا کہ اس کی تلاوت کی جائے، سیرتِ مطہرہ کے واقعات واحوال کو عجیب وغریب ربط وترتیب سے مختصراً بیان کیا گیا ہے کہ ہر سطر صداقتِ رسالت کا دعویٰ بھی ہے، اور دلیل بھی۔ پہلے مکی زندگی کا بیان ہے، پھر مدنی زندگی کا، جسے دماغ کا دور قرار دیا ہے۔ حضرت علامہ گیلانی ؒ اپنے وقت کے نہ صرف محقق اجل اور نقاد وبصیر عالم تھے، بلکہ صاحبِ حال اور صاحب بزرگ بھی۔ اور جب سوز وگداز کے ساتھ علم وتحقیق بھی جمع ہو جائے، تو نشہ کیوں دو آتشہ نہ ہو''۔ (ماہنامہ الحق، اکوڑہ خٹک، ستمبر ۱۹۶۸ء)

آپ کے شیخ ومربی حضرت حکیم الامت تھانویؒ فرمایا کرتے تھے کہ:

''مناظر احسن کے سارے مناظر احسن ہیں''۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ آپ کی تالیف ''النبی الخاتم'' کے متعلق فرماتے ہیں کہ:

''یہ مناظرِ اسلام، متکلم ملت اور سلطان القلم کے قلم کی روانی اسلام کی محافظت میں تیغ رانی کا کام دیتی ہے''۔ (ماہنامہ الرشید: ۱۷)

جناب علامہ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب لکھتے ہیں کہ:

''مولانا گیلانی کی تصنیف کو اسلوبِ نگارش اور ربطِ تحریر کے لحاظ سے نہیں، بلکہ اس نقطۂ نظر کے لحاظ سے دیکھنا چاہئے کہ ان میں علوم وحقائق اور استنباط واستخراجِ مسائل کا کس

قدر گراں بہا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے''۔

یوں تو مولانا کی ہر تحریر اپنے اندر جاذبیت رکھتی ہے، تاہم ان کی مندرجہ ذیل تالیفات بہت مقبول ہیں:

۱۔ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ ۲۔الدین القیم ۳۔النبی الخاتم ۴۔تدوین قرآن ۵۔تدوین حدیث ۶۔تدوین فقہ ۷۔اسلامی معاشیات ۸۔ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی ۹۔مقالات احسانی ۱۰۔تفسیر سورہ کہف ۱۱۔سوانح قاسمی سہ جلد ۱۲۔تذکرۂ شاہ ولی اللہ ۱۳۔کائناتِ روحانی ۱۴۔رحمۃ للعالمین ۱۵۔مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ، اور الفرقان لکھنو کے ''مجدد الف ثانی نمبر'' اور ''شاہ ولی اللہ نمبر'' میں ان کے مقالات جانِ اشاعت تھے، ان مقالات سے جہاں ان کے ذوقِ تاریخ، اندازِ فکر اور ژرف نگاہی نمایاں ہے، ان کے سینے میں اٹھتے ہوئے طوفان اور مچلتے ہوئے ارمان بھی ظاہر ہیں''۔

(بحوالہ الحق، اکوڑہ خٹک، دسمبر ۱۹۷۹ء)

بہر حال حضرت مولانا گیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھنے کا آغاز ''القاسم'' سے کیا اور آخر ''سوانح قاسمی'' کی چوتھی جلد لکھتے لکھتے اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ ملک کا کوئی قابلِ ذکر مجلّہ ایسا نہ تھا جس کے صفحات ان کی قلم کاریوں سے رنگین نہ ہوں۔ بیسیوں کتابوں پر مقدمے لکھے، ہر اہم مذاکرے میں شرکت کی اور اپنے تبحرِ علمی کا لوہا منوالیا۔ محدثوں کی محفل ہو، یا فقہا کی مجلسِ افتاء، مورّخوں کی انجمن ہو، یا شاعروں کی سوسائٹی، ہر جگہ اُن کی شخصیت جانِ محفل تھی۔ مولانا نے زندگی میں ہزاروں صفحات لکھے، درجن بھر اہم کتابیں ان کی یادگار ہیں، مگر ایک دو کتابوں کے علاوہ کوئی کتاب باضابطہ طور پر نہ لکھی، کسی طرف سے تحریک ہوئی اور پھر۔

لگا رہا ہوں مضامینِ نو کے انبار
خبر کرو میرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

وہ صفحات کے صفحات لکھتے چلے جاتے تھے اور کبھی نظرِ ثانی نہ کرتے، یہ فریضہ ان کے مخلص احباب، عزیز شاگرد، یا ناشر اپنے طور پر کرا دیتے تھے۔ ''النبی الخاتم'' اور ''الدین القیم'' ان کے شاگردِ عزیز ڈاکٹر غلام دستگیر رشید (پروفیسر فارسی نظام کالج حیدرآباد) نے

ترتیب دیں۔ ''تدوین حدیث'' ''تفسیر سورۂ کہف'' اور ''مقالاتِ احسانی'' کی ترتیب و تدوین اور ذیلی سرخیاں مولانا ڈاکٹر غلام محمد صاحب حیدرآبادی (حال کراچی) کی سعی و محنت کا نتیجہ ہے۔ مولانا سے کسی رسالے کے مدیر، یا دوست نے فرمائش کی، موضوع سامنے آیا، تو پھر خیالات کا سیلاب نوکِ قلم پر آگیا اور اسے صفحۂ قرطاس پر قلم بند کرتے چلے گئے۔ ''النبی الخاتم'' اور ''مسلمانوں کا نظامِ تعلیم وتربیت'' اسی طرح وجود میں آئیں، بعض اوقات لیکچر کی تیاری، یا کسی طالب علم کی رہنمائی کیلئے نوٹس لئے ہوئے یہ نوٹس ضخیم کتاب بن گئے۔ ''الدین القیم'' ''اسلامی معاشیات'' ''تدوین حدیث'' اور ''تدوین قرآن'' اسی قبیل کی تالیفات ہیں۔ مولانا کی پہلی کتاب ''ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ'' دیکھ کر حضرت حکیم الامت تھانویؒ نے فرمایا تھا کہ:

''اس کتاب کا مؤلف آئندہ چل کر عظیم محقق ثابت ہوگا''۔

چنانچہ حضرت تھانویؒ کی پیش گوئی حرف بہ حرف پوری ہوئی۔ اللہ تعالیٰ مولانا کی ان علمی و تصنیفی خدمات کے صلہ میں ان کے درجات بلند فرمائے، آمین۔

(ماخوذ ماہنامہ الحق، اکوڑہ خٹک)

تحریک آزادی میں علماء کا کردار

برصغیر پاک وہند میں آزادی کی تحریک اسی دن سے شروع ہوگئی تھی جب ایک بیرونی طاقت انگریز نے اس سرزمین پر اپنے پنجے گاڑنے شروع کئے تھے۔ سراج الدولہ، ٹیپو سلطان اور دیگر مسلمان حکمرانوں کی انگریزوں کے خلاف جنگیں، شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کا فتویٰ جہاد، سید احمد شہیدؒ کی تحریک مجاہدین ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی اسی زنجیر کی کڑیاں ہیں۔ سید احمد شہیدؒ کی تحریکِ مجاہدین کا بنیادی مقصد بھی یہی تھا کہ مسلمانوں میں ایمانی حرارت پیدا کر کے صوبہ سرحد کی جانب سے انگریزوں کے خلاف پیش قدمی کی جائے اور ہندوستان کو غیر ملکی آقاؤں کے پنجے سے آزاد کرایا جائے۔ سید احمدؒ اور شاہ اسمٰعیلؒ کے شہید ہوجانے کے بعد ان کے باقی ماندہ ساتھیوں نے سوات کی حدود میں ستھانہ کے قریب مرکزِ جہاد قائم کر کے طویل عرصے تک شمعِ حریت کو روشن رکھا اور انگریز حکومت کے خلاف مسلسل

لڑتے رہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں ناکامی کے بعد مسلمانوں کو اس کی بہت مہنگی قیمت ادا کرنی پڑی، انگریزوں نے آزادی کے بارے میں سوچنے والوں کو چن چن کر ختم کرنا شروع کر دیا اور اس ظالمانہ کاروائی کا نشانہ خاص طور پر اکابر علماء دیو بند حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ، حافظ ضامن تھانویؒ وغیرہ علماء ومجاہدین بنے، جو تحریکِ آزادی کے قائدین میں سے تھے۔ یہ حضرات اکابرِ دیو بند بنفس نفیس جہادِ آزادی میں شریک رہے، حضرت حافظ ضامن صاحبؒ شہید ہوئے اور باقی حضرات میں سے حضرت گنگوہیؒ گرفتار ہوئے، حضرت نانوتویؒ کو گولی لگی، مگر حق تعالیٰ نے ان کو دینی علوم کی اشاعت کیلئے زندہ رکھا، حضرت حاجی صاحبؒ اور مولانا کیرانویؒ وغیرہ علماء مکہ معظمہ کی طرف ہجرت کر گئے۔ اس کے بعد ان حضرات کے جانشین شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب مدرس دار العلوم دیو بند جو غلامی سے نفرت اور آزادی سے محبت کو جزوِ ایمان سمجھتے تھے، سر پر کفن باندھ کر نکلے اور آزادی کی تحریک کو بڑی سرگرمی سے آگے بڑھایا۔ تحریک ریشمی رومال، تحریکِ خلافت اور ترکِ موالات کی تحریک، حضرت شیخ الہندؒ کے جذبۂ حریت کی واضح نشانیاں ہیں۔ حضرت شیخ الہندؒ ان تحاریک کے روحِ رواں اور عظیم قائد تھے۔ ساری زندگی انگریز حکومت کے خلاف جہاد کرتے رہے اور بالآخر بے پناہ قربانیوں کے بعد انگریزوں کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا گیا۔ بعد میں جب مسلمانوں کو ہندوؤں کے متعصّبانہ رویے سے یہ خطرہ پیدا ہوا کہیں انگریز کے چلے جانے سے ہندو اکثریت کے پھندے میں نہ پھنس جائیں، تو حضرت شیخ الہندؒ کے جانشینوں میں سے حکیم الامت تھانویؒ اور شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے دو قومی نظریئے کے تحت تحریکِ پاکستان کو حرزِ جان بنالیا، پھر اس کیلئے اتنی قربانیاں دیں کہ انگریز کو اپنا بوریا بستر سمیٹنا پڑا اور ان اکابر علماء دیو بند کی مخلصانہ جد جہد آزادی کے نتیجے میں مملکت خداداد پاکستان نصیب ہوئی۔ تو مقصد یہ ہے کہ یہ سب کچھ حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، حکیم الامت تھانویؒ اور علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اور دیگر علماء کرام کی بے پناہ قربانیوں کا نتیجہ ہے۔ ان حضرات نے آزادی کی ہر تحریک میں قائدانہ عملی حصہ لیا اور خصوصاً تحریکِ پاکستان میں پوری قوت سے کام کیا، چنانچہ اس سلسلے میں جناب

محمد اقبال صاحب سہیل لکھتے ہیں کہ:

''تحریک پاکستان میں صفِ اول کے جن علماء نے ملت کو جگانے اور آزادی کیلئے دن رات کام کیا، اس کی داستان بڑی ولولہ انگیز ہے۔ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا ظفر احمد عثمانیؒ، مولانا سید سلیمان ندویؒ، مولانا مفتی محمد شفیعؒ، مولانا مناظر احسن گیلانیؒ، مولانا اطہر علیؒ، مولانا شمس الحق فرید پوریؒ، مولانا جمال الدین فرنگی محلؒ، مولانا عبدالحامد بدایونیؒ، مولانا مفتی دین محمد خانؒ، پیر صاحب سر سینہ شریفؒ، پیر صاحب مانکی شریفؒ، پیر زکوڑی شریفؒ، پیر جماعت علی شاہؒ، مولانا داؤد غزنویؒ، مولانا راغب احسنؒ، مولانا عبدالرؤف دانا پوریؒ اور مفتی جعفر حسین اور جانے کتنے ہی مشائخ وعلماء کرام نے خاموشی سے تحریک پاکستان میں عظیم الشان کردار ادا کیا تھا۔ برصغیر کے علماء کی اپنی ایک روایت رہی ہے کہ وہ کسی بھی پلیٹ فارم میں خودنمائی پسند نہ فرماتے تھے۔ کلکتہ میں ۲۶ تا ۲۹، اکتوبر ۱۹۴۵ء میں جو آل انڈیا جمیعت علماء اسلام کی زبردست کانفرنس ہوئی تھی، اس میں پانچ سو صفِ اول کے علماء ومشائخ شامل تھے، اس کانفرنس کی تفصیلات روح پرور ہیں۔ مغربی دنیا میں تحریکِ پاکستان کے خلاف جو اہم کتابیں اور شدید تنقیدیں لکھی گئی ہیں، ان میں اس کانفرنس کی قراردادوں کو تحریکِ پاکستان کی کارفرما قوت قرار دیا گیا ہے۔ یاد رہے کہ لیاقت علی خان مرحوم جس طبقہ سے کھڑے ہوئے تھے، وہ کانگریس کا گڑھ تھا، مگر مولانا ظفر احمد عثمانیؒ اور مفتی محمد شفیع صاحبؒ کی کوششوں نے لیاقت علی خان کو کامیاب کرایا اور یہ بات ریکارڈ پر ہے کہ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور ان کے رفقاء کی سعی وکاوشوں نے مسلم لیگ کو ہر میدان میں کامیاب کرایا اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی قیادت میں جمیعت علماء اسلام نے کانگریس اور جمیعت علماء ہند کو شکست سے دوچار کیا تھا۔ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے صوبہ پنجاب جمیعت علماء اسلام کانفرنس لاہور جنوری ۱۹۴۶ء میں ''ہمارا پاکستان'' کے عنوان سے جو ولولہ انگیز اور تاریخی خطبہ پڑھا تھا، اسکی صدائے بازگشت دنیا بھر میں پاکستان پر لکھے گئے لٹریچر میں آج تک سنی جاتی ہے، جیسے کہ راقم نے عرض کیا ہے کہ برصغیر کے علماء کی اپنی ایک روایت رہی ہے۔ علماء ومشائخ کی بہت عظیم تعداد نے خاموشی سے کارفرما قوت کے طور پر کام آنا مناسب سمجھا۔ اس بات کے بھی

دلائل موجود ہیں کہ ڈاکٹر علامہ اقبال نے کئی دفعہ کوشش فرمائی کہ علماء قیادت کریں، لیکن علماء ومشائخ کا اپنا ایک انداز تھا، جسے وہ نشاۃ ثانیہ کے لئے مناسب اور درست قرار دیتے تھے اور پھر ان عظیم علماء نے مولانا محمد علی جوہر اور علامہ اقبال کی رائے پر صاد کر کے اجماع کے ساتھ قائداعظم کی قیادت کو نہ صرف چلنا تھا، بلکہ اس قیادت کو تسلیم کر کے پوری قوت سے تحریک پاکستان کیلئے بھرپور کام کیا تھا۔ محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے نوائے وقت ۷ فروری ۱۹۸۶ء کو انٹرویو دیتے ہوئے ایک عجیب وغریب بات کی، انہوں نے فرمایا کہ:

''علماء نے تحریک پاکستان میں ''معاونین کی حیثیت سے کام کیا تھا جو حضرات اجنبی عینک لگا کر تحریک پاکستان کا مطالعہ کرتے ہیں، بلاشبہ انہیں ڈاکٹر اسرار صاحب کی یہ بات پسند آئے گی، حالاں کہ یہ بات تحریک پاکستان سے متعلقہ ریکارڈ۔ کے بالکل منافی ہے''۔

صوبہ سرحد کا ریفرنڈم علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، مفتی محمد شفیعؒ، پیر صاحب مانکی شریفؒ اور پیر صاحب زکوڑی شریفؒ کا مرہون منت تھا اور سلہٹ کا ریفرنڈم مولانا ظفر احمد عثمانیؒ اور مولانا اطہر علیؒ وغیرہ علماء کی کوششوں سے کامیاب ہوا تھا۔

یوپی مسلم لیگ نے ۱۹۴۰ء میں اسلامی نظامِ حکومت کا خاکہ بنانے کیلئے جو کمیٹی مولانا سید سلیمان ندویؒ کی سربراہی میں قائم کی تھی، وہ اس بات کی دلیل ہے کہ مسلم لیگ کی قیادت میں علماء ''معاونین'' نہیں تھے، کہنے کی بات یہ ہے کہ علماء تحریک پاکستان میں کارفرما قوت کے طور پر کام کر رہے تھے، یہ ملک بنانے کی تحریک تھی، بنے بنائے ملک میں نظام نافذ کرنے کی تحریک نہ تھی۔ اس تناظر میں دونوں کا عمل یکسر مختلف ہے، ملک بنانے کی اس تحریک میں اجنبی سامراج سے ٹکراؤ تھا اور ساتھ ہی اس سامراج کے ساتھ مشترک ہندو سامراجیت سے بھی واسطہ تھا اور آزادی لینی تھی۔ صورتحال سیاسی تناظر میں بے حد مختلف تھی۔ تحریک پاکستان میں علماء کارفرما قوتوں کے طور پر ملت کو جگانے اور اٹھانے کا کام کر رہے تھے، جب کہ اس وقت کی برصغیر کی چوٹی کی قیادت اہل الرائے حضرات اور بالغ نظر مفکرین نے اس سلسلے میں اقبال سے رجوع کیا تھا اور اقبال نے اپنے گہرے بصیرت وفکر سے کام لیتے ہوئے ایسے شخص کا چناؤ کیا، جو انگریزی سامراج کی باریکیوں سے پوری طرح واقف ہو، ہندو جاٹکیت کے مکروہ دھوکا کو خوب پہچانتا ہو، ملی جذبے سے سرشار ہو اور اسلام

کی بالادستی اور عظمت کا فکری و دلی طور پر قائل ہو اور سب سے بڑھ کر پختہ کردار کا انسان ہو، تحریک آزادی کی نوعیت ایسی ہی تھی، متعدد ریکارڈ پر یہ حقائق روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ اقبال نے قائداعظم محمد علی جناح کے چناؤ پر مولانا محمد علی جوہر سے ہی مشورہ نہیں کیا تھا، بلکہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے سب سے پہلے اس پر صاد کیا تھا اور قائداعظم کی دینی تربیت اور دینی رہنمائی مولانا تھانویؒ ہی نے کی تھی، ان علماء نے پاکستان بننے کے بعد بھی بہترین رول ادا کیا تھا تعلیماتِ اسلامیہ بورڈ کی شاندار اور عظیم خدمات ہماری تاریخ کا بنیادی حصہ ہے۔ (روزنامہ نوائے وقت، ۲ مارچ ۱۹۸۶ء)

دوقومی نظریئے کی تائید وحمایت

ہندوستان کے طبقۂ علماء دیوبند میں یہ شرف اور سعادت حضرت حکیم الامت تھانویؒ کو حاصل ہوا کہ سب سے پہلے پاکستان کا تخیل اور خالص اسلامی حکومت کا خیال آپ ہی نے پیش کیا تھا۔ اس کے ساتھ کانگریس کے معاملہ میں علی الاعلان کھلے بندوں قائداعظم اور مسلم لیگ کی حمایت واعانت اس وقت کی، جب پورے ملک میں سیاسی طوفان آیا ہوا تھا۔ حضرت حکیم الامت تھانویؒ کا یہ عقیدہ تھا کہ ہندو اور انگریز دونوں ناگ ہیں۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ جتنے کافر ہیں، سب اسلام کے دشمن ہیں، کوئی گورا ہو، یا کالا، دونوں ہی سانپ ہیں، بلکہ گورے سانپ سے کالا سانپ زیادہ زہریلا ہوتا ہے۔ اگر گورے سانپ کو گھر سے نکال دیا جائے، تو ڈسنے کو کالا موجود ہے جس کا ڈسا ہوا زندہ ہی مشکل سے رہتا ہے۔

حضرت تھانویؒ کے نزدیک ہندو مسلم اتحاد ایک بہت بڑا فتنہ تھا، آپ دوقومی نظریئے کے علمبردار تھے اور مسلمانوں کا کانگریس میں شریک ہونا دینی موت کے مترادف سمجھتے تھے۔ آپ نے مسلم لیگ کی حمایت میں کھلم کھلا اعلان کیا، تو مسلمان جوق در جوق مسلم لیگ میں شامل ہو کر جنگِ پاکستان لڑنے کی تیاریاں کرنے لگے۔ اس پر کانگریس مشتعل ہوگئی اور حضرت کو راستہ سے ہٹانے کے لئے قتل کے منصوبے بنانے لگی، بلکہ فی الواقعہ حضرت کے اعلان کی اشاعت کے بعد آپ پر قاتلانہ حملہ بھی ہوا، مگر قاتل ہیبتِ حق کی تاب نہ لاکر الٹے

پاؤں واپس دوڑ گئے اور پھر ساری تحریکِ مسلم لیگ کے دوران کسی کو ایسی جرأت نہ ہوئی۔ سیاسی معاملات میں حضرت حکیم الامت تھانویؒ کے اس استقلال واستقامت کو دیکھ کر محققِ اسلام حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم نے مولانا عبدالماجد دریا آبادیؒ کو لکھا کہ:

"اللہ تعالیٰ حضرت تھانوی کےؒ سایہ کو ملت اسلامیہ کے سر پر دیر تک صحت وسلامتی کے ساتھ قائم رکھے اور اس وقت کے طوفان کے اکیلے ملاّح کو اتنا تو وقفہ دے کہ کم از کم یہ طوفان سر سے ٹل جائے۔ علماء میں افسوس ہے کہ سب اُدھر ہی چلے گئے جدھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہیں ہیں، ایک حضرت ہی ہیں جن سے اس جماعت کی آبرو باقی ہے"۔

(حکیم الامتؒ: ۳۵۶)

حضرت مولانا گیلانیؒ جیسے اہلِ نظر محقق حضرت کی درازیٔ عمر کیلئے دعائیں مانگ رہے تھے اور اہل غرض انہیں اپنے راستہ سے ہمیشہ کیلئے ہٹانے کی تیاریوں میں مصروف تھے، مگر یہ مردِ حق کانگریسیوں کے تمام ناجائز حربوں کے باوجود مسلم لیگ کی حمایت سے باز نہ آئے۔ حضرت حکیم الامت تھانویؒ کے اس نعرۂ حق کی تائید کرنے والی پہلی عظیم شخصیت شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ صدر مہتمم دارالعلوم دیوبند کی تھی، جو تحریک آزادی کے عظیم مجاہد حضرت شیخ الہندؒ کے سیاسی وعلمی امور کے ترجمان تھے۔ علامہ عثمانیؒ اپنے استاد و مرشد شیخ الہندؒ کی طرح دوقومی نظریئے کے حامی تھے۔ انہوں نے دوقومی نظریہ کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ:

"ہندوستان میں جو سیاسی کشمکش اسوقت جاری ہے، میرے نزدیک اس سلسلہ میں سب سے زیادہ قابل تنفر، بلکہ اشتعال انگیز جھوٹ اور سب سے بڑی اہانت آمیز دیدہ دلیری یہ ہے کہ یہاں کے دس کروڑ فرزندانِ اسلام کی مستقل قومیت کا صاف انکار کردیا جائے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ غلط، یا صحیح طور پر دنیا میں اقوام کی تقسیم وطن، نسل، زبان اور طرزِ تمدن وغیرہ کے لحاظ سے ہوتی رہی ہے اور اب بھی موجود ہے، لیکن خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے دنیا کی جو تعمیر جدید ہوئی، اس میں تخلیق کے اعلیٰ ترین مقاصد کے پیش نظر، اللہ کے پیدا کئے ہوئے تمام انسانوں کی باعتبار قومیت کے ایسی ثنائی تقسیم کردی گئی، جس کے احاطہ سے کوئی فردِ بشر باہر نہ رہ سکے۔ اب اسلامی نقطۂ نظر سے گویا روئے

زمین پر دو ہی قومیں آباد ہیں: ایک وہ قوم جس نے فاطرِ ہستی کی صحیح معرفت حاصل کر کے اس کے مکمل اور آخری قانون کو اس کی زمین میں رائج کرنے کا التزام کر لیا ہے، وہ ''مسلم'' یا ''مومن'' کہلاتی ہے۔ دوسری جس نے اپنے اوپر ایسا التزام نہیں کیا، اس کا شرعی نام ''کافر'' ہوا۔

﴿هُوَ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ فَمِنكُمْ كَافِرٌ وَمِنكُم مُّؤْمِنٌ﴾

یاد رہے کہ ایمان وکفر کی یہ تقسیم حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے بھی تھی، لیکن آپ سے قبل ہر نبی کسی مخصوص قوم کی طرف مبعوث ہوتا تھا، اسی لئے ان کی بعثت سے قومیتوں کے قائم شدہ امتیازات کلیۃً مٹائے نہیں جاسکتے تھے، البتہ رحمۃ اللعالمین کی بعثتِ عامہ نے تشخصات اور محدود امتیازات کی قدر وقیمت گھٹادی، یا ختم کر دی، جن کو لوگوں نے اپنے جہل وتنگ نظری سے شرافت وکرامت کا اصلی معیار بنا رکھا تھا۔ اسی اساسی نقطۂ نظر سے لامحالہ کل غیر مسلم قومیں دوسری قوم سمجھی جائیں گی اور اب اس چیز کا کوئی امکان ہی باقی نہیں رہتا کہ مسلم اور غیر مسلم دونوں کے امتزاج سے کوئی قومیت متحدہ صحیح معنی میں بن سکے۔

(خطباتِ عثمانی ؒ :۴۷)

اسی دو قومی نظریہ کے تحت حضرت حکیم الامت تھانویؒ اور حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے حصول پاکستان کی خاطر مسلم لیگ کی تائید وحمایت کی اور شریعتِ اسلامیہ کی روشنی میں متحدہ ہندوستان کے مسلمانوں کے سوادِ اعظم کی رہبری ورہنمائی کا فریضہ انجام دیا، پھر اسی دو قومی نظریۂ اسلام کی تائید وحمایت میں مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ، حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ، حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ، حضرت مولانا مفتی محمد حسن امرتسریؒ، حضرت مولانا خیر محمد جالندھریؒ، حضرت مولانا ادریس کاندھلویؒ اور حضرت مولانا اطہر علی صاحبؒ جیسے جلیل القدر علماء میدان میں نکلے اور اپنی تحریروں اور تقریروں سے مسلمانانِ ہندوستان کو شرعی حیثیت سے مطمئن کیا۔

محققِ اسلام حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے بھی اپنے شیخ حضرت حکیم الامت تھانویؒ اور اپنے استاذِ محترم علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کے سیاسی نظریات کی مکمل تائید وحمایت کی اور اپنے ان ہم عصر ممتاز علماءِ دیوبند کے شانہ بشانہ دو قومی نظریہ کے تحت تحریکِ پاکستان میں

اہم کردار ادا کیا، مگر جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ ان علماء ومشائخ نے خاموشی سے کام کیا، یہ حضرات خودنمائی کو پسند نہیں فرماتے تھے اور حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ حضرات علماء دیوبند مسلم لیگ میں شرکت کر کے شریعتِ اسلامیہ کی روشنی میں متحدہ ہندوستان کے مسلمانوں کی رہنمائی نہ کرتے، تو مسلم لیگ کی طرف ہوا کا رخ موڑنا اور نظریۂ پاکستان کی طرف سیاست کے دھارے کا منہ پھیرنا، ناممکن نہیں، تو دشوار بہت تھا درآنحالیکہ جمیعت علماءِ ہند دہلی کے اعاظم کار، مجلس احرار کے شعلہ بیان مقرر، جماعت اسلامی کے نثار، انجمن خاکسار کے بیلچہ بردار، صوبہ سرحد کے سرجوش ڈاکٹر خان اور گاندھی جی کے چیلے عبدالغفار خان، پنجاب کے یونینسٹ انگریزوں کے حاشیہ بردار، سندھی جی ایم سیدوں کے نمک خوار سارے کے سارے قائداعظم اور تحریک پاکستان کے یکسر مخالف تھے۔ سیاست کی اس گھٹا ٹوپ سیاہی میں حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے ان روحانی فرزندوں اور جانشینوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعے مخالفت کے بادلوں کو چھانٹ کر رکھ دیا اور مسلمانانِ ہند کو شرعی حیثیت سے دلائل اور براہین سے مطمئن کرنے میں کامیاب ہو گئے اور آخرکار پاکستان معرضِ وجود میں آ گیا اور مخالف طاقتیں ناکام ہو گئیں"۔

(بحوالہ ہفت روزہ صوت الاسلام، لاہور)

دستور پاکستان کا خاکہ

پاکستان بنے ہوئے ابھی چھ سات ماہ ہی گذر رہے تھے کہ ہوش سنبھالنے کے بعد مسلمانوں کو اس کی فکر ہوئی کہ جس غرض کیلئے پاکستان بنایا گیا اور جس کی خاطر ان علماء کرام اور لاکھوں مسلمانوں نے اپنے گھربار کو چھوڑا اور قربانیاں پیش کیں، اب اس کا دستور اسلام کے اصول صحیحہ پر ایسا مرتب ہو، جس کے تحت اسلامی نظام کی برکات کا مشاہدہ کر سکیں اور اسے دوسروں کے لئے نشانِ راہ کے طور پر پیش کر سکیں، چنانچہ کراچی میں شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کے مشورہ سے کچھ مسلمانوں کی ایک جماعت نے یہ فیصلہ کیا کہ پاکستان کا دستور کتاب وسنت کے اصول پر بنانے کیلئے ایک خاکہ مرتب کیا جائے، جو ممبران اسمبلی کے سامنے رکھا جا سکے اور اسی کی روشنی میں دستور بنوانے کی سعی کی جا سکے۔ حضرت علامہ عثمانیؒ

مرحوم کے مشورہ سے مندرجہ ذیل چار علماء اس کام کیلئے تجویز ہوئے۔

۱۔ حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ

۲۔ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ

۳۔ حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ

۴۔ حضرت مولانا ڈاکٹر حمید اللہ حیدر آبادیؒ

مگر حسن اتفاق ایسا ہوا کہ اس وقت کوئی بھی پاکستان میں موجود نہ تھا، سب کے سب ہندوستان میں مقیم تھے، حالانکہ ان حضرات کی زندگی سخت خطرہ میں تھی، کیونکہ ہندو انہیں اپنا دشمن تصور کرتے تھے کہ انہوں نے علامہ عثمانیؒ کے ساتھ مل کر جہادِ پاکستان میں حصہ لیا تھا۔ خصوصاً حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ کے تو بہت ہی زیادہ دشمن تھے کہ وہ بڑے سرگرم عمل رہ چکے تھے، مگر بایں ہمہ انہوں نے پاکستان آنے کی سعی نہ کی تھی۔

ان حضرات کو پاکستان لانے کیلئے شیخ الاسلام علامہ عثمانیؒ نے مولانا احتشام الحق تھانویؒ کو ہندوستان بھیجا، مولانا تھانویؒ نے انہیں تدوینِ دستور کیلئے کراچی آنے کی دعوت دی۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ تو کسی عذر کے سبب اس وقت نہ آسکے، باقی تینوں حضرات کام کی اہمیت کے پیش نظر فوراً پاکستان آگئے اور وسط ۱۹۴۸ء میں یہ حضرات دستوری خاکہ مرتب کرنے میں مشغول ہوگئے اور قریباً تین ماہ میں ایک مختصر سا خاکہ علامہ عثمانیؒ کی زیر ہدایت مرتب کرلیا۔ کام ختم ہونے پر حضرت مولانا گیلانیؒ اور ڈاکٹر حمید اللہ صاحب تو واپس چلے گئے، مگر حضرت محمد شفیع صاحبؒ کو دو وجوہات کی بناء کراچی روک لیا گیا، ایک تو اسلئے کہ ان کا بھارت واپس جانا خطرہ سے خالی نہ تھا، دوسرے اسلئے کہ اس کام کی تکمیل کیلئے ان کا یہاں رہنا اشد ضروری تھا، بہرحال حضرت مولانا گیلانیؒ نے حضرت علامہ عثمانیؒ کے تلمیذِ رشید ہونے کی حیثیت سے دو قومی نظریہ کے تحت تحریکِ پاکستان کی مکمل حمایت کی اور آخر دم تک پاکستان کے دلی طور سے خیر خواہ اور پاکستان میں نظامِ اسلام کے نفاذ کے خواہاں رہے، اسی لئے دستورِ پاکستان کے خاکہ کی ترتیب و تدوین کیلئے علامہ عثمانیؒ کی دعوت پر پاکستان تشریف لائے اور دستور کی تیاری میں شبانہ روز تین ماہ تک لگے رہے، پھر

چند مجبوریوں کے تحت واپس ہندوستان چلے گئے۔ وہاں ہندوستان میں مولانا گیلانیؒ مرحوم کئی انجمنوں اور علمی مجالس کی اعزازی رکنیت بھی رکھتے تھے اور ندوۃ المصنفین دہلی کے رکن تھے۔ ۱۳۵۰ھ سے ۱۳۶۷ھ تک آپ دارالعلوم دیوبند کی مجلسِ شوریٰ میں بھی شامل رہے اور اسی طرح ماہنامہ الفرقان لکھنؤ کے اعزازی مدیر کی حیثیت سے ایک سال کام کیا۔ الغرض آخر دم تک علمی، دینی اور اسلامی خدمات میں مصروف رہے''۔

(ماخوذ از تعمیرِ پاکستان وعلمائے ربانی)

مقالات ومضامین

مذہب اور سائنس

علامہ سید مناظر احسن گیلانی

مذہب کا سنگ بنیاد:

ماضی کی تلاش، مستقبل کی فکر، بشری فطرت کی ایک قدرتی بے چینی ہے، جوں جوں انسانی دل و دماغ بلند و بیدار ہوتے جاتے ہیں، ان سوالات کا دائرہ بھی وسیع تر ہوتا جاتا ہے۔ ایک تنگ خیال، پست فطرت آدمی صرف اپنی ذات کے ماضی اور مستقبل کو سوچتا ہے۔ جو اس سے اونچا ہوتا ہے، وہ اپنے خاندان کو بھی اس خیال میں شریک کر لیتا ہے۔ اسی طرح جو ان سے بھی عالی طبع ہوتے ہیں، وہ صرف خاندان، بلکہ قوم و وطن کے متعلق بھی غور کرتے ہیں، حتیٰ کہ فطرت انسانی کی بلندی کا ایک نقطہ وہ بھی ہے، جہاں ذات و خاندان، قوم و جنس ہی نہیں، بلکہ خود اس عالم کے متعلق یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کائنات کا یہ دریائے ناپید کنار، جس کے ایک گوشے میں آفتاب و ماہتاب تنکے کی طرح تیر رہے ہیں اور فطرت کا یہ بحرِ ذخار، جس میں ہر آن، ہر لحظہ کروڑوں ہستیاں ابھرتی اور ڈوبتی رہتی ہیں، آخر اس کا نقطۂ آغاز اور ابتدائی سر چشمہ کیا ہے؟ اور گنبدوں کے ان چکروں کا آخری انجام کیا ہوگا؟ انسان جب تک انسان ہے، جب تک اس کے کاسۂ سر میں جانوروں کا مغز نہیں، بلکہ انسانی دماغ کی بلندی اور ذہنی وسعت باقی ہے، یہ سوالات بھی باقی رہیں گے اور ان کو باقی رہنا چاہئے کہ اس جستجو کے بغیر انسانی زندگی کا ماضی و مستقبل بجز تاریکی کے اور کچھ نہیں ہے۔ آخر جس کا ماضی بھی تاریک اور مستقبل بھی اندھیرے میں ہو، کیا وہ کہہ سکتا ہے کہ وہ روشنی میں ہے؟! کہاں سے آ رہا ہے؟ کہاں جا رہا ہے؟ جس مسافر کے لیے دونوں باتیں مجہول ہوں ،اس کے سفر کا انجام معلوم؟!

ترجمہ: ''کیا جو اوندھے منہ جا رہا ہے (نہ آگے کا حال اسے معلوم، نہ پیچھے کا) وہ سیدھی راہ پر ہے، یا وہ جو کھڑا سیدھی راہ پر جا رہا ہے''۔

خلاصہ یہ ہے کہ گزشتہ اور آئندہ کے متعلق جتنی بلندی سے سوال اٹھایا جائے گا، اسی نسبت سے ہماری فطرت بھی بلند سے بلند تر ہوتی جائے گی، بلکہ سچ پوچھئے، تو اسی نسبت سے تاریکی بھی گھٹے گی اور روشنی بڑھے گی۔ بہر حال ہماری فطرت کے یہی دو مطالبے ہیں جو دراصل مذہب کے سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں، لیکن ان کے سوا اور بھی چند سوالات ہیں، جو قریب قریب ان ہی دو سوالوں کی طرح ہماری فطرت کی گہرائیوں سے ابلتے رہتے ہیں اور مذہب کی تعمیر میں ان کو بھی بہت کچھ دخل ہے۔ اب ہم ترتیب کے ساتھ چند اہم سوالات کو ذیل میں بیان کرتے ہیں:

بنیادی سوالات

۱۔ عالم کا نقطۂ آغاز کیا ہے؟

۲۔ اس کا آخری انجام کیا ہوا؟

۳۔ ہر چیز کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ انسان کے کام آئے، پھر انسانی وجود کا کیا مقصد ہے؟

۴۔ کیا زندگی کی موجودہ کش مکش سے نجات کی کوئی صورت نکل سکتی ہے؟

۵۔ کیا بقائے دوام کی فطری خواہش مغالطی اور وہمی طور پر نہیں، بلکہ حقیقی معنوں میں پوری ہو سکتی ہے؟

۶۔ علمی اور عملی طور پر ہم میں سے ہر شخص غیر محدود ہونے کی خواہش رکھتا ہے، وہ چاہتا ہے کہ جو چاہوں کروں اور جو کچھ چاہوں، جانوں، کیا فطرت انسانی کا یہ مطالبہ اپنے مقصد کو پا سکتا ہے؟

یہی سوالات ہیں جن کے جواب کا نام مذہب ہے، یہی پیاس ہے جس کے پانے کی تعبیر دین سے کی جاتی ہے، یہی وہ بھوک ہے، جس کی غذا صرف پیغمبروں کا پیغام ہے اور انہی سوالات کو حل کرنا مذہب کی اصل غرض وغایت ہے۔

مذہبی سوالات اور علوم عقلیہ

مذہب نے ان سوالات کو جن ذرائع سے حل کیا ہے، اس کے بتانے سے پیشتر یہ

دیکھنا چاہیے کہ مذہب سے کنارہ کش ہو کر کیا صرف عقلی علوم کی رہنمائی میں ہم ان سوالوں کو حل کر سکتے ہیں؟ بحث کے لیے صرف اس سوال کو لو کہ عالم کا نقطۂ آغاز اور انجام کیا ہے؟ کیوں کہ اس کے حل ہو جانے کے بعد تقریباً دوسرے سوالات خود بخود حل ہو جاتے ہیں، اب آؤ اور عقلی علوم کی روشنی میں ان کا جواب ڈھونڈو۔

یوں تو عقلی علوم کی بہت سی شاخیں ہیں، لیکن اجمالی طور پر ان کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک کا نام سائنس ہے اور دوسرے کو فلسفہ کہتے ہیں۔ پہلے ہم سائنس کو لیتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اس معاملہ میں وہ ہماری کس حد تک مدد کر سکتی ہے؟

مذہبی سوالات اور سائنس کی حد پرواز

مذہب کے اس بنیادی سوال کو سائنس حل کر سکتی ہے، یا نہیں؟ اس کے لیے ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ سائنس کی حد پرواز کیا ہے؟ علماء سائنس نے اس علم کے حدود کو معین کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے:

سائنس کی بحث و تحقیق کا تعلق تمام تر فطرت (Nature) کے ان واقعات اور مشاہدات سے ہے، جو ہمارے زیر تجربہ آسکیں، لیکن جو چیزیں ہمارے احساس اور مشاہدہ کے دائرہ سے خارج ہیں، سائنس کو ان کے اقرار وانکار سے کچھ بحث نہیں۔

ماہرین سائنس کا اعتراف

پروفیسر لیتر جو فرانس کا مشہور ماہر سائنس ہے، لکھتا ہے: ”کائنات کے آغاز و انجام تک مشاہدے کی رسائی نہیں ہے، اس لیے ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ کسی ازلی، یا ابدی وجود کا انکار کریں، جس طرح ہمارا کام یہ بھی نہیں ہے کہ ہم اس کو ثابت کریں، ہمارا کام نفی و اثبات دونوں سے الگ رہتا ہے“۔

پروفیسر ٹنڈل نے اس خیال کو ایک مثال سے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اگر تم گھڑی کو دیکھو، اس میں گھنٹے، منٹ، سیکنڈ کی سوئیاں نظر آئیں گی، یہ سوئیاں کیوں پھرتی ہیں؟ اور ان کی حرکت کی باہمی نسبت جو ہمیں نظر آتی ہے، کیونکر قائم ہے؟ ان سوالات کا جواب گھڑی کے کھولے اور اس کے مختلف پرزوں کو اچھی طرح دیکھے اور ان کا ایک دوسرے سے تعلق

قائم کئے بغیر نہیں دیا جاسکتا ہے، جب یہ سب کچھ ہو لیتا ہے، تب ہم کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ سوئیوں کی یہ خاص حرکت گھڑی کی اندرونی ساخت اور مشین کا نتیجہ ہے، جو کوک کی قوت سے چل رہی ہے، سوئیوں کی یہ حرکت صنعت انسانی کا ایک کارنامہ ہے، لیکن بجنسہ یہی حال واقعات وحوادثِ فطرت کا ہے۔ عالم کی اس مشین کے اندر بھی ایک مخفی مشین کارفرما ہے اور ایک خزانہ قدرت ہے، جو اس مشین کو چلا رہا ہے۔ سائنس کا انتہائی کام اس مشین اور ذخیرہ قوت سے پردہ ہٹا کر یہ بتانا ہے کہ واقعات وحوادث ان ہی دونوں کے باہمی تعلق کا نتیجہ ہیں، لیکن کارخانہ عالم کی یہ اندرونی مشین خود کیا ہے؟ اور کیسے بنی؟ اور اس گھڑی کو کس نے کوک دی؟ اور اس کی چلانے والی قوت کہاں سے آئی؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کا جواب سائنس سے باہر ہے۔

انسان صرف کچھ جان سکتا ہے، کسی چیز کی تحقیق وایجاد پر قادر نہیں

خلاصہ یہ ہے کہ سائنس نہ تو قدرتی قوانین کو ایجاد کرتی ہے، نہ ان قوانین کی تمام کڑیوں کو سلجھا کر ہمارے سامنے پیش کر سکتی ہے، بلکہ حوادث وواقعات کے محض ان حلقوں کو ترتیب کے ساتھ ہمیں بتانے کی کوشش کرتی ہے، جو اس کے دائرہ احساس ومشاہدے میں آجاتے ہیں، مثلاً: وہ آگ میں جلانے کی خاصیت پیدا نہیں کرتی، بلکہ صرف یہ بتاتی ہے کہ تجربہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آگ جلاتی ہے اور اسٹیم کو ایجاد (وجود بخشنا اور تخلیق کرنا) نہیں کرتی، بلکہ صرف اس حقیقت سے پردہ اٹھا دیتی ہے کہ جب آگ کا تعلق پانی سے ہوتا ہے، تو یہ ایک قدرتی قانون ہے کہ وہ بھاپ بن جائے۔ بہر حال ہمارے سامنے جو کچھ قدرتی قوانین پھیلے ہوئے ہیں ہم ان کو بتا نہیں سکتے، بلکہ صرف جان سکتے ہیں اور سائنس اس پر اتنا اضافہ اور کرتی ہے کہ اسی حد تک جان سکتی ہے، جس حد تک مشاہدہ ہمارا ساتھ دے گا، لیکن یہ سوال کہ ان قوانین کا مقنّن کون ہے؟ ان کا نقطۂ آغاز کیا ہے؟ اور ان کا آخری انجام کیا ہوگا؟ سائنس کے حدود سے ان کا جواب خارج ہے۔

ہکسلے نے سائنس کی اسی درماندگی کا اندازہ کرنے کے بعد بالکل سچ لکھا ہے کہ وہ کسی چیز کی بھی کامل توجیہ نہیں کر سکتی، اس کے سارے اسباب اول سے آخر تک نہیں بتائے

جا سکتے، کیونکہ انسان کا اعلیٰ سے اعلیٰ علم بھی توجیہ میں آغازِ اشیاء کی جانب چند قدم سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔

حکیم اور عامی میں فرق

بہر حال انسان کی انتہائی پرواز سائنس کے نقطۂ نظر سے صرف اس قدر ہے کہ کل نہیں، بلکہ فطرت کے صرف ان قوانین کو وہ جان سکتا ہے، جو حواس کی گرفت میں آجائیں، باقی رہا یہ سوال کہ جب صرف محسوس قوانین کی واقفیت تک عام انسانی پرواز ختم ہو جاتی ہے، تو حکیم اور عامی میں کیا فرق رہا؟ تو بات یہ ہے کہ گو عامی کا علم بھی مشاہدات اور محسوسات ہی تک محدود رہتا ہے اور حکیم بھی اس دائرہ سے آگے قدم نہیں رکھ سکتا ہے، لیکن دونوں میں فرق یہ ہے کہ عامی آدمی کسی حادثہ، یا مظہر قدرت کو جب دیکھتا ہے، تو وہ اس کے اثرات کو دور تک نہیں لے جا سکتا، یعنی: ایک جزوی واقعہ سے کلیہ نہیں بتا سکتا اور حکیم ایک جزوی واقعہ کو دیکھ کر چونکتا ہے اور یہ دیکھنا شروع کرتا ہے کہ آیا یہ واقعہ اسی جزئیہ تک محدود ہے، یا آگے بھی بڑھ سکتا ہے؟ پس اگر اس میں کچھ وسعت نظر آتی ہے، تو چند جزئیات پر منطبق کرنے کے بعد اسی جزئیہ کو وہ کلیہ کی شکل عطا کرتا ہے اور اسی کو ''قانون'' کے نام سے موسوم کرتا ہے، مثلاً: نیوٹن نے سیب کو گرتے ہوئے دیکھا، اس طرح ہر شخص دیکھتا ہے، لیکن وہ چونکا کہ آخر کیوں گرتا ہے، اس کو محسوس ہوا کہ زمین کی کشش کا نتیجہ ہے، اب اس کشش کی خاصیت کو اس نے دوسری چیزوں میں ڈھونڈنا شروع کیا، بالآخر اس نے اعلان کیا کہ فضا میں جتنے کرّے تیر رہے ہیں، وہ سب جذب و کشش ہی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ بہر حال نیوٹن نے فضائی کرّوں کی خاصیت کا ایک علم حاصل کیا، لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ وہ ان کرّوں کا موجد تھا، یا اس نے ان میں جذب و کشش کی خاصیت پیدا کر دی تھی، جو قانون پہلے سے موجود تھا، صرف اس کا علم اس نے حاصل کیا، اس سے زیادہ نہ اس نے کچھ کیا، نہ کر سکتا تھا۔ وہ خود کہتا ہے: ''عالم فطرت کی یہ نیرنگیاں (جذب و کشش) واجب الوجود کے ارادہ کے سوا اور کسی شے سے ظاہر نہیں ہو سکتیں، وہ واجب الوجود جو ہر جگہ اور ہمیشہ موجود ہے''۔ اور یہی حاصل سائنس کے تمام مسائل اور اختراعات کا ہے۔ بھاپ سے

کیتلی کے ڈھکنے کو اٹھتے ہوئے سب ہی دیکھتے ہیں، جس طرح اسٹیفن نے دیکھا، لیکن اسٹیفن نے اس جزوی مشاہدہ سے ایک کلیہ پیدا کیا اور اس کلیہ کو فطرت کے دوسرے قوانین، مثلاً: لوہے کی لچک، پہیوں کی گردش، اسی قسم کے میکانکی قوانین کے علم کے ساتھ وابستہ کردیا، اس نے اپنے کسی پیدا کردہ قانون کو نہیں، بلکہ قدرتی قوانین کو اس شکل میں نمایاں کیا ہے، جسے ہم ''ٹرین'' کہتے ہیں۔

الغرض صنعت وحرفت والے قدرتی قوانین کے جزئیات سے کلیات کا علم حاصل کرتے ہیں، لیکن کسی چیز کی ایجاد (یعنی: اس کو وجود بخشنا) ایک غریب انسان کے بس کی بات نہیں، وہ فقط ''علم آدم الاسماء کلها'' (سکھائے اللہ نے آدم کو سارے اسماء) کے اجمال کی تفصیل کرسکتا ہے، یہی اسے دیا بھی گیا ہے اور قرآن نے اسے ''تسخیرِ کائنات'' سے تعبیر کیا ہے۔

سائنس اور مذہب کے حدود

الحاصل جب سائنس کا سارا زور مشاہدات اور محسوسات پر ختم ہوجاتا ہے، تو خود اندازہ کرو کہ جن سوالات پر مذہب کی بنیاد قائم ہے، مثلاً: عالم کا نقطۂ آغاز کیا ہے، جیسا کہ ہکسلے نے کہا تھا کہ سائنس کا قدم آغاز اشیاء کی جانب چند قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا، تو پھر آخری نقطہ تک اس کی رسائی کیوں کر ہوسکتی ہے۔ پس سچ یہ ہے کہ سائنس جہاں اپنی تحقیقات ختم کردیتا ہے، مذہب وہیں سے اپنا درس شروع کرتا ہے، سائنس صرف عالم شہادت (عالم محسوسات) کے چند واقعاتِ محسوسہ کو کلیات کی شکل میں پیش کرکے اپنے بازو ڈال دیتی ہے، محسوسات کے آگے قدم رکھتے ہی اس پر رعشہ طاری ہوجاتا ہے۔ وہ کچھ نہیں کہہ سکتی کہ آگے کیا ہے اور مذہب انسان کا یہیں سے ہاتھ پکڑتا ہے اور غیب (عالم غیر محسوس) کے سارے اسرار کو اس کے سامنے بے نقاب کرتا چلا جاتا ہے، سائنس کچھ نہیں بتاسکتی کہ دنیا کی ابتدا کیوں کر ہوئی، مذہب آتا ہے اور اس حقیقت سے پردہ اٹھادیتا ہے، انسان مرنے کے بعد کہاں جاتا ہے اور اس پر کیا گزرتی ہے؟ سائنس اس کے جواب سے عاجز ہے اور مذہب اس کی تفصیل پیش کرتا ہے۔ دنیا کا آخری انجام کیا ہوگا؟ سائنس متحیر

ہے کہ اس کا کیا جواب دے، مذہب آتا ہے اور اس حیرت کو مٹا دیتا ہے۔

سائنس یہ تو بتاتی ہے کہ عالم کس کے لیے ہے، لیکن خود انسان کس کے لیے ہے، اس مقصد کو متعین کرنے سے یہ عاجز ہے۔ مذہب آتا ہے اور اس مسئلہ کو بھی صاف کر دیتا ہے۔ الغرض مذہب کا جس عالم سے تعلق ہے، سائنس کی ہدایت کا چراغ اس کے حدود تک پہنچتے ہی گل ہو جاتا ہے۔ میلن ایڈورڈ کہتا ہے اور سچ کہتا ہے کہ عالم کے ان قوانین کی نسبت یہ کہنا کہ یہ محض بخت واتفاق کے نتائج ہیں، یہ فرضی احتمالات اور عقلی گمراہیاں ہیں، جسے لوگوں نے محسوسات کا لقب دے رکھا ہے، فزیکل سائنس جاننے والا ہرگز اس قسم کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔

(بحوالہ الکلام از مولانا شبلیؒ)

اس کے بعد عوام الناس کا یہ خیال کہ سائنس کی جدید تحقیقات نے مذہب کی بنیادیں ہی ہلا دی ہیں، جیسا کہ گنیزو نے غایتِ گستاخی کے ساتھ لکھا ہے کہ ہم نے خدا کی عارضی خدمات کا شکریہ ادا کر کے اس کو سرحد پار پہنچا دیا۔ (نعوذ باللہ تعالیٰ شانہ) کس درجہ جاہلانہ اور مضحکہ خیز ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ "اگر خشکی کی ٹرین سمندر کے جہاز سے ٹکرا سکتی ہے، تو سائنس بھی مذہب سے ٹکرا سکتی ہے"۔ مطلب یہ ہے کہ جب دونوں کے حدود جدا جدا ہیں، ایک کی تگ ودو محسوسات کے تنگ دائرہ تک محدود ہے اور دوسرا فضا کا شہباز ہے، تو ان دونوں میں تصادم کا کیا مطلب ہوسکتا ہے...؟

خلاصہ یہ ہے کہ سائنس اور مذہب بالکل دو جداگانہ چیزیں ہیں، نہ ان دونوں میں اختلاف ہے اور نہ ہوسکتا ہے۔ ہم سائنس کے ذریعہ آسمان کے تاروں کو گن سکتے ہیں، آفتاب کو ناپ سکتے ہیں، ہوا کو تول سکتے ہیں، سمندر کو خشک کر کے بادل بنا کر پانی برسا سکتے ہیں، بلکہ ممکن ہے کہ آئندہ مردوں کو زندہ کرنے کی تدبیر بھی معلوم ہو جائے، جیسا کہ حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ "احیاءِ موتی" (مردے کو زندہ کر دینے) پر بھی آدمی قادر ہو جائے گا، بلکہ زندہ کرے گا، دوسرے لفظوں میں اس کو یوں بھی ادا کر سکتے ہیں کہ انسان زندگی کے قانون سے بھی واقف ہو جائے گا اور سائنسدانوں کا بھی بیان ہے کہ ہم نے "تخمِ حیات" (پروٹو پلازم) کا پتہ چلا لیا ہے۔ کیمیا والے کہتے ہیں کہ تخمِ حیات کاربن، آکسیجن، نائٹروجن کی باہمی ترکیب سے تیار ہوتا ہے۔ تو سائنس یہ سب کچھ کرسکتی ہے اور ہم منتظر ہیں

کہ وہ ایسا کرے، کیونکہ ہمارے بہت سے ایمانی دعوؤں کی توثیق انہیں انکشافات پر موقوف ہے، لیکن بایں ہمہ مذہبی سوالات کے حل میں سائنس اس طرح عاجز رہے گی، جس طرح پہلے تھی اور اس وقت تک ہے۔

فرض کیجئے کہ کیمیائی عناصر کی ترکیب سے ہم نے زندگی کو پیدا بھی کر لیا، تو اس سے یہ مسئلہ کہاں حل ہوا کہ ان عناصر کی ترکیب سے زندگی کیوں پیدا ہو جاتی ہے؟ اس کی مثال ایسی ہے کہ زندگی کا راز کسی زمانے میں یوں حل کیا گیا تھا کہ نر اور مادہ کے باہمی اختلاط کا یہ نتیجہ ہے، لیکن اس وقت بھی یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ اس اختلاط سے یہ نتیجہ کیوں نکلتا ہے؟ اب یہ سوال اسی طرح باقی رہے گا کہ کاربن ڈائی آکسائیڈ، آکسیجن اور ہائیڈروجن کی باہمی ترکیب سے زندگی کیوں پیدا ہو جاتی ہے؟ جو شخص اس سے واقف ہے کہ تخم کو مٹی میں ملانے اور پانی دینے سے پودا پیدا ہو جاتا ہے، کیا اس نے سوال کو حل کر لیا کہ پودا کیوں پیدا ہوتا ہے؟ پروفیسر ٹنڈل نے بلفاسٹ کے لکچر میں ایک موقع پر کتنی اچھی بات کی کہ لیکن کیوں؟ اس کا جواب ہمیشہ کے لیے اسی طرح ناممکن رہے گا، جس طرح کہ پہلے رہا ہے۔ امجد حیدر آبادی نے بھی اس مضمون کو ایک شعر میں ادا کیا ہے۔

امجد ہر بات میں کہاں تک کیوں کیوں

ہر کیوں کی ہے انتہا خدا کی مرضی

الحاصل کسی شے کے آغاز کا پتہ چلانا اور اس کے آخری انجام تک پہنچنا سائنس کی رہنمائی میں ناممکن ہے، چند قدم چل کر اس کو اپنی نارسائی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے، علی الخصوص جب حواس اس کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں اور یہی حال انجام کا ہے کہ آئندہ کیا ہوگا، موجودہ قوانین کا آئندہ کیا حال ہوگا، ان کے آثار و نتائج کیا ہوں گے؟ اس کا بھی کوئی قطعی جواب سائنس نہیں دے سکتی۔ وہی ہکسلے جس نے آغاز کے متعلق انسان کے جاہل ہونے کا اعتراف کیا تھا، اب انجام سے متعلق بھی اسی اعترف کا اظہار ان الفاظ میں کرتا ہے: ”عالم تو بڑی چیز ہے، سائنس کا معمولی قانون یہ ہے کہ جو پتھر بے سہارا ہوگا، اس کو زمین پر گر پڑنا چاہیئے، لیکن ہمیشہ کیا یہی ضرور ہوگا“۔

اس کے نزدیک یہ قانون نہیں، بلکہ انسان کا وہمی اضافہ ہے، اس کا اپنے الفاظ یہ

ہیں۔ ''وہ ڈراؤنا لزوم اور ضروری ہونے کا قانون کیا ہے؟ جس نے لوگوں کو اس قدر خائف اور وحشت زدہ بنا رکھا ہے، سچ پوچھو، تو یہ ہمارے واہمہ کا ایک گھڑا ہوا بھوت ہے، سائنس ہی کا یہ قانون ہے کہ پتھر جب بے سہارا ہوگا، تو اس کو زمین پر گر پڑنا چاہئے، لیکن آئندہ وہ ہمیشہ گر ہی پڑے گا، یعنی: اس کے خلاف ہونا ناممکن ہے، یہ ایک ایسی زائد شے کا اضافہ ہے، جس کا نہ تو مشاہدہ اور واقعات میں نشان ملتا ہے اور نہ کہیں اس سے پتہ چلتا ہے''۔ (ماخوذ از فزیکل سائنس آف لائف) یعنی: یہ ایسا حکم ہے، جس کی شہادت ہمارے حواس نہیں دیتے۔

سائنس کی یہ رائے تو انجام کے متعلق تھی۔ رہا آغاز اس کے متعلق میں نے چند اقوال پہلے بھی درج کئے ہیں، لیکن آخر میں ہکسلے ہی کے قول کو پیش کر کے اس بحث کو ختم کرتا ہوں۔ وہ اپنی کتاب ''اصول ونتائج'' میں لکھتا ہے: ''وجود کی علتِ اولیٰ کا مسئلہ میرے حقیر قویٰ کی دسترس سے باہر ہے، جتنی لایعنی ہرزہ سرائیوں کے پڑھنے کا مجھے موقع ملا، ان میں سب سے بدتر ان لوگوں کے دلائل ہوتے ہیں، جو آغاز عالم کے متعلق موشگافیاں کرتے ہیں، مگر ان لوگوں کے مہملات ان سے بھی زیادہ بڑھ جاتے ہیں، جو یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ کوئی خدا نہیں ہے''۔

مذہبی سوالات اور فلسفہ

مذہب جن سوالات کو حل کرتا ہے، میں نے بتایا کہ ان میں اہم ترین سوال عالم کے آغاز وانجام ہی کا تھا، باقی سوالات انہیں دو سوالوں کی ذیلی اور تفصیلی شکلیں ہیں، سائنس تو یہ کہہ کر اکھاڑے سے نکل گئی کہ ان سوالات کا تعلق غیب سے ہے اور ہماری بحث کا دائرہ چونکہ صرف محسوس قوانین تک محدود ہے، اس لیے غیر محسوس قوانین کے سوالوں کے جواب ہمارے فرائض میں داخل نہیں۔ اب فلسفہ کی اونچی دکانیں سامنے آتی ہیں، آؤ! ذرا ان کی بھی سیر کر لیں۔ سنا جاتا ہے کہ اس علم میں محسوسات کی چار دیواریوں کو پھاند کر، محسوس قوانین کے دائرہ سے نکل کر ان امور کا بھی پتہ چلایا جاتا ہے، جو مشاہدہ اور تجربہ کی گرفت سے باہر ہیں اور یہ ایک حد تک صحیح بھی ہے، فلسفہ کے شعبہ مابعد الطبعیات (فزکس) والوں

نے ان سوالات کو بھی چھیڑا ہے، جن کی گرہ کشائی کا محض مذہب حق دار تھا اور یہی وجہ ہے کہ دنیا کے کسی علم سے اگر مذہب کی ٹکر ہو بھی جاتی ہے، تو وہ محض فلسفہ ہے، بلکہ فلسفہ کی صرف ایک شاخ مابعد الطبعیات ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ تاریخ، ریاضی، ہندسہ، کیمیا، طب اور دیگر میکانکی علوم، یا صنائع نے نہ کبھی مذہب کے میدان میں قدم رکھا اور نہ کبھی ان سے مذہب کو اختلاف ہوا، صرف فلسفہ ہی ایک ایسا علم ہے، جس میں غیبی حقائق اور مذہبی امور کو عقلی گرفت میں لانے کی کوشش کی جاتی ہے اور اس کوشش میں کبھی کبھی وہ مذہب سے متصادم ہو جاتا ہے، یہی معمولی تصادم ہے، جس کی بنیاد پر اس زمانہ میں ہنگامہ برپا کر دیا گیا کہ علم نے مذہب کی بنیادیں ہلا دیں، حالاں کہ میں بتا چکا ہوں کہ اگر "علم" سے مراد بعد الطبعیات کے سوا کوئی اور علم ہے، تو اس سے زیادہ بے بنیاد، گندہ اور فربہ جھوٹ ممکن نہیں اور اگر صرف "مابعد الطبعیات" مراد ہے، تو اس میں شبہ نہیں کہ یہ ایک حد تک درست ہے، لیکن فلسفہ کے نادان مرید اپنے پیروؤں کو جتنی بلندی پر لے جا کر اڑانا چاہتے ہیں، واقعات بتائیں گے کہ وہ قطعاً اس کے مستحق نہ تھے۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ مابعد الطبعیات میں جن امور کے متعلق رائے قائم کی جاتی ہے، چونکہ ان کا تعلق مشاہدات اور تجربات سے نہیں ہوتا، اس لیے کچھ قیاسات اور تخمینے، ظنون اور اندازے ہوتے ہیں، جن کے بل پر رائے قائم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے اور یہی ہونا بھی چاہئے کہ ان رایوں میں اختلاف اور شدید اختلاف پیدا ہو جائے، ہر شخص اپنی دماغی خصوصیت، موروثی اثرات اور ماحول کے غیر شعوری تاثرات کے تحت ایک تجویز پیش کرتا ہے، جو دوسرے سوچنے والوں سے بالکل مختلف ہوتی ہے، اس کا صحیح اندازہ فلسفہ کی تاریخ پڑھنے سے ہوتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چند اندھے ہیں، جو آنکھ سے ہاتھی کو دیکھ نہیں سکتے اور صرف چھو کر اس کی شکل وصورت کے متعلق رائے قائم کر رہے ہیں۔ ہر ایک نئی مثالوں اور جدید تشریحوں کے قالب میں اپنے نتائج کو ڈھال کر پیش کر رہا ہے۔ بہر حال یہ آپس میں جتنا چاہیں الجھیں، مجھے اس سے کیا بحث! میں تو صرف یہ دیکھانا چاہتا ہوں کہ فلسفہ اور مذہب کے اختلاف کا بظاہر اس زمانہ میں بڑا ڈنکا پیٹا جا رہا ہے، دیکھیں تو سہی اس طبل بلند بانگ کے اندر بھی کچھ ہے یا نہیں؟

رسول اکرم ﷺ کی مدنی زندگی

سید مناظر احسن گیلانی

جن کوتاہ بینوں نے ''دل'' کا اقرار کیا تھا، لیکن ''دماغ'' پران کو اب تک شک تھا، اب ان ہی تنگ نظروں کے لیے دوسری زندگی کا آغاز ہوتا ہے، جس میں ''دل'' سے زیادہ ''دماغ''، ہی کی نمائش ہوگی، تاکہ وہ وہمی شوشہ بھی مٹ جائے، جس کی آڑ میں جاننے کے بعد نہ جاننے کے لئے چھپنے والے چھپ رہے ہیں۔

اور دیکھو کہ دماغی تجرباتِ بیّنہ کی اسی کش مکش سے وہ ترشی بھی نچوڑی جائے گی، جس سے ان خود بینوں کا نشہ پھاڑا جائے گا، پھٹ جائے گا، جن کے پاؤں ''سربلندی وعلو'' کے خمار کے ہاتھوں جاننے کے بعد بھی ماننے سے اب تک ڈگمگا رہے ہیں، تاکہ حجت پوری ہو:

﴿لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَن بَيِّنَةٍ وَيَحْيَىٰ مَنْ حَيَّ عَن بَيِّنَةٍ﴾

(الأنفال: ٤٢)

''جو مرنا چاہے، وہ کھلے بندوں سب کچھ دیکھ کر مرے اور جو جینا چاہے، وہ بھی کھلے بندوں سب کچھ دیکھ کر جیئے''۔

مدنی زندگی کے شروع میں جو یہ دکھایا گیا ہے کہ ''ھوانی علی الناس'' کے فریادی کو ''الناس'' اور ''ناس'' کے ساتھ جو کچھ ہیں، سب پر اس کو وزن بخشا جارہا ہے، یا طائف کی گلیوں میں جو رد کیا گیا تھا، ''سلع'' پہاڑ کے دامن میں سب اسی پر رد کئے جارہے ہیں، بھوکوں کیلئے روٹی لے کر دوڑے آتے ہیں، پیاسوں کے لیے پانی لے کر دوڑے آتے ہیں، گاتے ہیں، بجاتے ہیں، باہم ایک دوسرے کو للکارتے ہیں، ابھی ابھی جس کی جمادی چٹانیں ''ھلم الیّ یا رسول اللہ'' کے ساتھ پکار رہی تھیں، اسی کو انسانی زبانیں آگے آگے بڑھ بڑھ کر ٹھیک اسی طرح:

''یارسول اللہ ھلمّ الی القوۃ و النعمۃ''

''اے اللہ کے رسول! زور اور حفاظت کی طرف آیئے''۔

عرض کرتے ہوئے جان حاضر کرتے ہیں، مال حاضر کرتے ہیں ، تو یہ مدینہ کا نہیں ، بلکہ قرنِ الثعلب کے موڑ پر طائف سے نکلتے ہوئے جس عمل کا ردِ عمل ''ملاءِ اعلیٰ'' سے شروع ہوا تھا، یہ اسی تسخیری قوت کا ظہور ہے، جو'' مکہ'' میں بھی ظاہر ہوا، ''ثور'' میں بھی ظاہر ہوا۔

''ثور'' سے نکلنے کے بعد بھی ظاہر ہوا، ''قبا'' میں بھی ظاہر ہوا، جہاں خالق کا جو دروازہ مخلوقات کے لیے بند تھا، صدیوں کے بعد پہلی دفعہ قبا کی مسجد بنا کر کھولا گیا، تا کہ جس کسی کو جہاں کہیں زمین پر قابو بخشا جائے ، پہلا کام یہی کرے اور اب مدینہ میں بھی اسی ردِ عمل کا ظہور ہو رہا ہے، آئندہ ہوتا رہے گا، اسی کا ظہور ''کوفہ'' میں بھی ہوگا، ''دمشق'' میں بھی ہوگا، ''بغداد'' میں بھی ہوگا، ''غرناطہ'' میں بھی ہوگا، ''قاہرہ'' میں بھی ہوگا، ''غزنی'' میں بھی ہوگا، ''دہلی'' میں بھی ہوگا اور کیا بتاؤں کہ کہاں کہاں ہوگا، کب تک ہوگا، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ابد تک اب تو صرف اسی کا ظہور ہے، اسی کو نمود ہے، اسی لئے ''مدنی زندگی'' کے اصلی عناصر یہ واقعات نہیں ہیں، بلکہ یہ تو'' مکہ'' ہی کے آثار ہیں، جنھیں تم اب ''مدینہ'' میں دیکھ رہے ہو، بلکہ ''مدنی'' زندگی میں تم کو وہ باتیں تلاش کرنی چاہیں ،جن میں ''دل'' سے زیادہ ''دماغ'' کا ''اخلاق'' سے زیادہ ''عقل'' کا تجربہ ہو۔

''مکہ'' میں جس طرح دیکھا گیا تھا کہ اس ''دل'' سے بہتر کوئی دل نہیں، اسی طرح ان باتوں کا مطالعہ ''مدینہ'' میں کرو، جن کو دیکھ کر کہا جائے کہ اس ''دماغ'' سے بہتر کوئی ''دماغ'' نہیں۔ ظاہر ہے کہ مدینہ میں سب سے پہلا کام یہ کیا گیا کہ مسجد نبوی بنائی گئی اور اسکے ساتھ ''صفہ'' کا مدرسہ بنایا گیا، لیکن کیا صرف مسجد نبوی بنائی گئی اور مدرسہ بنایا گیا، مسجد اور مدرسہ کون نہیں بناتا اور کہاں نہیں بنتے ، پھر اس میں بڑائی کیا ہے، باوجود استطاعت و قدرت کے پختہ اینٹ کے اور پتھر سے نہیں بنائی گئی، بلکہ کھجور کے تنوں اور شاخوں اور کچی اینٹوں سے بنائی گئی، بلا شبہ اس میں یہ نمونہ ضرور ہے کہ مسلمان جس آبادی میں پہنچیں، سب سے پہلے، وہ اپنے گھر سے بھی پہلے، وہاں خدا کی عبادت کی مسجد کی نیو کھودیں کہ مسجد ہی اسلام کی میخ ہے، اسلامی آبادی بناتے ہوئے سب سے پہلے چاہیے کہ اس میخ کو ہر مسلمان اس جگہ گاڑ دے، جہاں وہ آباد ہوتا ہے، تعمیری تکلفات کی وجہ سے دقت نہ ہو، اس لئے

سب سے پہلی مسجد کا نمونہ وہ رکھا گیا، جسے ہر شخص گاڑ سکتا ہے، ہر جگہ گاڑ سکتا ہے، آخری تعمیری سامان کے لحاظ سے جو مسجد بھی ہوگی، اس سے کیا کم ہوگی جو مسلمانوں کی سب سے پہلی مسجد تھی.......؟! اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہر مسجد مدرسہ کے ساتھ ہو۔ ''علم'' دین ہے، ''دین'' علم ہے، عملاً اس نمونہ سے اس کی تعلیم دی گئی۔

میں نہیں کہتا کہ اس مسجد و مدرسہ کے بنانے میں یہ مصالح بھی پیشِ نظر نہیں تھے، یا آئندہ مسلمانوں کو اس نمونہ کے پیچھے نہیں چلنا چاہئے، لیکن دیکھا گیا، پر سوچا نہیں گیا، آخر مسجد عرب میں بنتی ہے، عرب میں کعبہ موجود تھا، جو صرف عرب جاہلیت ہی میں نہیں، بلکہ اسلام میں بھی محترم تھا، لیکن بایں ہمہ اس مسجد کا قبلہ عرب سے باہر فلسطین کے سلیمانی ہیکل کو کیوں ٹھہرایا جاتا ہے.......؟

لوگ سمجھے کہ صرف قبلہ مقرر ہوا، لیکن یہ کسی نے نہیں دیکھا کہ ''وطنیت'' کا جو بت عرب میں صدیوں سے پوجا جاتا تھا اور اس زور و شور سے پوجا جاتا تھا کہ اس کا پجاری اپنے سوا سب کو ''عجم'' اور گونگا سمجھتا تھا، دیکھو کہ صرف ایک اسی مخفی ضرب نے اس بت کو پاش پاش کر دیا۔ جب قرآن میں ہے کہ ابتداء عربوں پر یہ ''غیر ملکی'' قبلہ گراں گزرا، تو یہی غور کرنا تھا کہ کیوں گراں گزرا؟ لیکن اب تو گرانیوں کے برداشت کا انہوں نے عہد کیا تھا، جھجکے، مگر اسی کے ساتھ ہی آگے بھی بڑھ گئے، اور جو لادا گیا، لاد لیا، سترہ مہینے تک اس وطنیت شکنی کی مشق نے جب ان کیلئے عرب اور غیر عرب کو ایک بنا دیا، تو اس سے بھی عجیب اور عجیب تر تماشا پیش ہوتا ہے۔

بیت المقدس کو قبلہ بنا کر عرب کے باشندے عرب سے الگ کئے گئے، لیکن اب عرب نہیں، بلکہ عرب اور غیر عرب خدا کی ساری زمین سے یہ عرب اور غیر عرب کا قصہ ہی ہمیشہ کیلئے ختم کر دیا جاتا ہے، سترہ مہینے کے بعد قبلہ بدلتا ہے اور بجائے سلیمان کی ہیکل کے سلیمان علیہ السلام، داؤد علیہ السلام، اسحاق علیہ السلام اور اسمعیل علیہ السلام کے باپ ابراہیم علیہ السلام کے بنائے کعبہ کو ''قبلہ'' ٹھہرا کر حکم دیا جاتا ہے:

﴿وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ﴾

''اور جہاں سے تم نکلے، اسی جگہ سے تم اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف (منہ) موڑ دو، اور جہاں کہیں (اے مسلمانو!) تم ہو، اپنے چہروں کو اس طرف موڑ دو''۔

کیا مقصد ہے اس کا؟ یہی کہ جو کعبہ سے باہر کئے گئے ہیں، وہ بھی کعبہ کے اندر ہیں اور جو کعبہ سے باہر تھے، اپنے کو کعبہ کے اندر سمجھیں، پہلے غریب عرب کو عرب کا قبلہ بنایا گیا اور جب یہ ہو چکا تو پھر عرب اور غیر عرب سب کو مٹا کر نہ عرب ہی رہا، نہ غیر عرب رہا، بلکہ خدا کی جو ایک دنیا تھی، وہ ایک ہی دنیا کی شکل میں واپس آ گئی، کعبہ دنیا کی مسجد کی دیوار ٹھہرایا گیا اور بسیط زمین اسی دیوار کا صحن قرار پایا، یہی ہر مسلمان سمجھتا ہے اور اسی کے مطابق عمل کرتا ہے، وہ افریقہ کو بھی کعبہ میں سمجھتا ہے اور امریکہ کو بھی اسی کے صحن کا ایک حصہ قرار دیتا ہے، ایشیا بھی اس کو کعبہ کی دیواروں کے نیچے نظر آتا ہے، یورپ میں بھی جب اس کو نماز کی ضرورت ہوتی ہے، تو کعبہ کے آنگن میں کھڑا ہو کر وہ اپنی نماز ادا کرتا ہے، اِورسٹ اسی کے صحن کا ایک ٹیلہ ہے اور ''بحر محیط'' اسی صحن کا ایک حوض، بحرِ قلزم اسی صحن کی ایک نالی ہے، ایک مسلمان اپنی زندگی کے ہر دن میں پانچ وقت اس نظریہ کی عملی شکل میں مشق کرتا ہے، اسی کو یہی بتایا گیا ہے، صحیح حدیث میں ہے:

''جعلت لی الارض مسجداً''

''پوری زمین میری (لیے) مسجد بنائی گئی ہے''۔

''وطنیت'' کے اس صنم اکبر کو توڑنے کے ساتھ اب ''قومیت'' اور ''نسلیت'' کا بت سامنے آتا ہے، کس قدر سرسری طور سے لوگ گزر جاتے ہیں، جب سنتے ہیں، یا کہتے ہیں کہ ''مدینہ'' میں انصار اور مہاجرین کے درمیان بھائی چارہ کرایا گیا تھا، ان میں عقد مواخات قائم کیا گیا تھا، لیکن اسکا نتیجہ کیا ہوا، مہاجرین قریش اور قریشی نسل کے ساہوکار کعبہ کے کلید بردار تھے، اور انصار قبیلہ اوس وخزرج کے کسان اور کاشت کار تھے، حالانکہ دونوں انسان تھے، لیکن جس طرح آریائی نسل والوں نے سامی نسلوں کو اور سام نسلوں نے تورانی نسلوں کو، یا برہمنوں نے شودروں کو، بے رنگوں نے رنگینوں کو، پھیکوں نے نمکینوں کو، آدمی کو نہیں، بلکہ گھوڑوں کی اولاد بیل کی نسل سمجھا اور اسی قسم، بلکہ ان سے بدتر سلوک انہوں نے ان لوگوں

کے ساتھ روا رکھا، جو ان کے ہم نسل، ہم قوم نہ تھے۔

قریش کو اپنے نسب پر اپنے حسب پر بڑا ناز تھا، نسبی فخر ایک دیوتا تھا، جو صدیوں سے ان میں پوجا جاتا تھا اور اس طرح پوجا جاتا تھا کہ غیر قریشی عربوں کے ساتھ یہ لوگ حج کرنے میں بھی اپنی اہانت محسوس کرتے تھے، جس طرح آج بھی اُجلے کالوں کے ساتھ دعا مانگنے میں اپنی ذلّت سے ڈرتے ہیں، قریشی اس قبرستان میں بھی دفن ہونا تنگ خیال کرتے تھے، جس میں کوئی غیر قریشی بیچارہ دفن ہوتا، جس طرح آج بھی شودروں کی مسان برہمنوں، چھتریوں کے مرگھٹ سے دور ہوتی ہے، یہی مؤاخات کا گزرتھا، جس نے اس بت کو بھی ڈھیر کر کے رکھ دیا، قریشی سردار انصاری کسان کے آگے جھکا ہوا تھا، وہ اس کے ہاتھ چومتا تھا، اور یہ ان کے قدم لیتا تھا، یہ اسکو اپنا سب کچھ، بلکہ تم نے سنا ہوگا طلاق دے کر ایک بیوی تک دینے پر اصرار کرتا تھا اور وہ شکریہ کے ساتھ انکار کرتا تھا۔

اور یوں مخلوقات، بلکہ اپنے خود ساختہ مخلوقات کے پنجوں سے آزاد ہو کر مدینہ والوں نے اپنے کھوئے ہوئے ربِ قیوم کو پالیا تھا، اسی کے بعد منادی کرادی گئی کہ اب دنیا ایک ہے، اس کا معبود ایک ہے، ان کا رسول ایک ہے، ان کی کتاب ایک ہے، ان کا کعبہ ایک ہے۔

اور دیکھو کہ دن کے پانچ وقتوں میں کڑک کڑک کر، گرج گرج کر بلند میناروں سے پکارنے والے مشرق میں، مغرب میں، زمین کے آخری کناروں تک یہی پکار رہے ہیں، پکارتے رہیں گے، کیا ناقوس سے، بوق سے، قرنا سے، گھنٹوں سے، طبل سے، نقاروں سے یہ بات ممکن تھی، جس کی ابتداء اذان کے عجیب وغریب ندائی طریقہ سے اسی کے بعد زمین پر اسلام کی سب سے پہلی مسجد میں کی گئی، متعدد وطنوں کا بت ٹوٹ گیا، متعدد نسلوں کا صنم چُور چُور ہو گیا۔

جو توڑے گئے، جٹ گئے، جو بکھیرے گئے تھے، سمٹ گئے، الغرض جو ایک تھے، وہ ایک ہی ہو گئے اور اسی یکتائی کا خلاصہ وہ ہے، جس کا اعلان اذان کی شکل میں پانچوں وقت کیا جاتا ہے، محض فکر و خیال میں نہیں، بلکہ واقع میں عملی طور پر مدینہ میں دنیا کا یہ نقشہ قائم ہو گیا، انسانیت کی آزادی کا یہی عالمگیر نقشہ تھا، جس کو عالم پر منطبق کرنے کیلئے ''کـــــافة

للناس ''کا بشیر ونذیر اب ''کافة الناس '' کی طرف بڑھتا ہے۔ (صلی اللہ علیہ وسلم)

اس کو اختیار تھا کہ ''قرنِ الثعلب'' کے پاس اس کو جو ''اخشبین'' (۲ پہاڑ) دیئے گئے تھے، ان ہی کو لے کر آگے بڑھتا، لیکن یہ تو پھر دل کا امتحان ہو جاتا، حالانکہ اب تو صرف ''دماغ'' ہی کا تجربہ کرانا مقصود ہے، دکھایا جاتا ہے کہ جس کے دماغ کے یہ کارنامے ہیں، اس کو مجنون کہنے والے کیا خود مجنوں نہیں ہیں، جس کی عقل، جس کے فہم کے یہ کرشمے ہیں، اس کے عقلی توازن میں نقص نکالنے والے کیا ایسے بد بخت خود عقلی توازن سے محروم نہیں ہیں..........؟

راستہ اگر صاف ہوتا، تو اس وقت جو کچھ دکھانا ہے، کامل طور پر دکھایا نہیں جا سکتا تھا، لیکن دیکھو! راہ میں کانٹوں کے جو گھنے جنگل چپ و راست اوپر اور نیچے ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہیں، وہ قصداً ان ہی میں گھس کر نکلتا ہے اور کتنے شاندار طریقہ سے نکلتا ہے۔

بیابان کے ایک نخلستانی قصبہ کے ان کسانوں کی آبادی سے یہ تحریک عالم کی طرف یلغار کرتی ہے، جو یہودی ساہوکاروں کے سود در سود کے بوجھ کے نیچے دبے ہوئے ہیں، ان کی زمینوں میں پیدا ہی کیا ہوتا ہے، لیکن جو کچھ بھی پیدا ہوتا ہے، پیدا ہونے کے ساتھ یہودی قرض خواہوں کے گھر اٹھ کر چلا جاتا ہے، زیادہ دن نہیں ہوئے تھے کہ اس چھوٹی سی آبادی کے دو خاندان اپنی خانہ جنگی میں رہے سہے جوانوں اور سرداروں کو بھی کھو چکے ہیں، ان کے ساتھ اپنے دھن سے، وطن سے بچھڑے ہوئے کچھ لوگ اور بھی شریک ہیں، جن کی تعداد سو سے زیادہ نہیں ہے، ان کا یہ حال ہے، دوسری طرف سارا عرب ایک کمان بن کر اس تحریک کو اور تحریک والوں کو نشانہ بنائے ہوئے ہمیشہ کے لئے نیست و نابود کرنے پر تلا ہوا ہے، یہودی اپنی مہاجنی کی کساد بازاری سے گھبرا کر ان تمام قلعوں اور قلعوں والوں کو مخالفت کے نقطہ پر جمع کر رہے ہیں، جن کا سلسلہ مدینہ سے شروع ہو کر شام کے حدود تک پھیلا ہوا ہے، مشکلات کا خاتمہ اسی پر نہیں ہو جاتا ہے، بلکہ بتدریج مخالفت کی یہ آگ بڑھتے بڑھتے اس وقت کی سب سے بڑی مشرقی طاقت (ایران) اور سب سے بڑی مغربی قوت (روم) دونوں طاقتوں کو مدینہ کی بربادی پر آمادہ کر دیتی ہے۔

رومیوں کے گھوڑے مدینہ سے تھوڑی دور کے فاصلہ پرغسانیوں کے حدود پر ہنہنا رہے ہیں اور کسریٰ کے چپراسی وارنٹ لئے مدینہ پہنچ کر دھمکا رہے ہیں کہ مدینہ کے کسانون کے سردار کو دربار شاہی میں گرفتار کر کے حاضر کیا جائے، یہ ان کے شہنشاہ کا فرمان ہے، جو یمن کے گورنر باذان کے توسط سے مدینہ تک پہنچا ہے۔

اس وقت کا سماں ہے، جس وقت مدینہ میں ''دماغ'' کے تجربہ کے لئے نسلِ انسانی کو دعوت دی جاتی ہے، پھر کیا ہوتا ہے، قیداء کی ساری حشمت جیسا کہ یسعیاہ نبی نے کہا تھا کہ ایک سال ٹھیک مزدوروں کے ایک سال کے اندر بھس کی طرح جل کر راکھ ہو جاتی ہے، علو وکبریائی کا جونشہ ان کے قدم کو جمنے نہیں دیتا تھا، پھٹ کر ہوا ہو گیا، جو سب سے بڑا تھا، سب سے چھوٹے کے ہاتھوں قتل ہوا، قریش کے ستر سورما مارے گئے اور یوں قیداء کی حشمت خاک میں مل گئی۔

وہی عرب جو ایک کمان سے تیر بن کر اس کونے کے پتھر پر گرے تھے، جیسا کہ کہا گیا تھا جو اس پر گرتا ہے، چُور چُور ہو جاتا ہے، چُور چُور ہو کر اس طرح بدلے کہ جو دشمن تھے، وہ دوست ہو گئے، جن پر تلوار چلائی، وہ نہیں، بلکہ جنھوں نے تلوار چلائی انہوں نے مسلمان ہو کر ان جھوٹوں کو جھٹلایا، جنھوں نے بازاروں میں پھیلایا تھا کہ جو کچھ پھیلایا گیا، تلوار کے زور سے پھیلایا گیا، مکہ میں جن سے چھینا گیا تھا، سب کچھ چھینا گیا، پانی چھینا گیا، کھانا چھینا گیا، گھر چھینا گیا، در چھینا گیا اور آخر میں جینے کا حق بھی چاہا گیا تھا کہ چھینا جائے اور کتنوں سے چھینا گیا، دہکتی ہوئی آگ، چمکتی ہوئی تلواروں، کھنچی ہوئے کمانوں کے نیچے سے بھاگے ہوئے، پھر چمکتی ہوئی تلواروں اور کھنچی ہوئی کمانوں، تنے ہوئے نیزوں کے ساتھ فتح کا پھریرا اڑاتے ہوئے مکہ میں داخل ہوتے ہیں، لیکن لیتے ہوئے نہیں، دیتے ہوئے، اکڑتے ہوئے نہیں، جھکے ہوئے، بدلہ چکاتے ہوئے نہیں، حطہ وعفو کرتے ہوئے

﴿ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّداً وَقُولُوا حِطَّةٌ﴾

''شہر کے دروازے میں سر جھکائے اور حطہ (یعنی: گناہوں اور قصوروں کو جھاڑتے ہوئے، معافی مانگتے ہوئے) داخل ہونا''۔

کی تعمیل کرتے ہوئے، تفسیر کرتے ہوئے، رحم وکرم، صفح واعراض، مغفرت ودرگزر،

امن وامان کے پھول برساتے ہوئے:

"الیو م یوم بر وو فاء، الیوم انتم الطلقاء"

"آج صلہ رحمی اور وفا کرنے کا دن ہے، آج تم لوگ آزاد کیے گئے"۔

کے موتی نچھاور کرتے ہوئے زمین پر انسانوں کیلئے جو پہلا گھر، مخلوق کی نہیں، بلکہ خالق کی، صرف خالق کی عبادت کیلئے بنایا گیا تھا، اس میں "لاالٰہ الا اللہ، الحمد للہ وحدہ، نصر عبدہ وحزب الاحزاب وحدہ" کہتے ہوئے سربسجود ہوگئے۔ ابراہیم علیہ اسلام کا بیت ایل پتھر کی کھودی ہوئی مورتیوں کی گندگی سے پاک ہوگیا اور حیرت ہے کہ بکھرا ہوا وحشی عرب جس میں وثنی، بت پرست، یہودی، عیسائی، صابی، عقل پرست سبھی ہیں، ان مختلف اقوام و قبائل کے باہمی انتشار، جنگ وجدال کو ختم کر کے ایک پرامن آئینی نظامِ سلطنت کے ساتھ وابستہ کرنے میں جھوٹوں نے جس قدر بھی جھوٹ چاہا پھیلا دیا، لیکن واقعہ صرف اس قدر اور اسی قدر ہے کہ دس لاکھ مربع میل کی طویل وعریض سرزمین کا پایۂ تخت جس وقت کسانوں کا وہی قصبہ ہوگیا، تو دس سال کی اس لمبی اور دراز مدت میں وثنیوں (عربی ہندوؤں)، یہودیوں، عیسائیوں، مسلمانوں سب میں سے امن وامان کی اس جدوجہد میں طرفین کے جتنے آدمی کام آئے، ان کی تعداد کروڑ، لاکھ، بلکہ دو ہزار چار ہزار بھی نہیں، اتنی بھی نہیں جتنی "نیویارک" کی سڑکوں، یا "لندن" کی شاہراہوں پر موٹر کے نیچے سے روزانہ اٹھائے جاتے ہیں، یا ہندوستان کی معمولی جھڑپوں میں لاشوں کی جو فہرست تیار ہوتی ہے، بلکہ کل لے دے کر سب کی کل تعداد ایک ہزار اٹھارہ ہے، یہ ہے "خونی پیغمبر" کا بہایا ہوا خون، یا قصابوں کی وہ دکان جس کے شور سے گنبدِ گرداں بھی تھرا اٹھا ہے، غیر تو غیر اپنے بھی پریشان ہیں۔

اُف! برکندہ باد آنکھوں سے بد اندیشوں کو صرف وہیں خون نظر آیا، جہاں سے انسانیت کی مردہ لاش میں زندگی کا خون دوڑایا گیا، جہاں موت ہے، مردوں کو، دل کے مردوں کو وہاں زندگی نظر آرہی ہے اور جہاں سے صرف زندگی بٹی، بٹ رہی ہے، انصاف کرنے والوں نے کیسا انصاف کیا، جب موت کی وادی کے نام سے انہوں نے دنیا میں اس کا پروپیگنڈا کیا، ایک ہزار اٹھارہ تعداد تو اس وقت ہے، جب اس میں بلاوجہ بنی قریظہ

کے ان یہودیوں کو بھی شریک کرلیا جائے، جن کو خود ان کی کتاب اور ان کی شریعت نے ان ہی کی مرضی سے اپنے ہی قانون کی رو سے اس وقت ناپید کیا، جب سمجھا گیا کہ اس چھوٹی سی جماعت کی زندگی سے سارے عرب، بلکہ ممکن ہے کہ عرب کے اطراف کی بڑی جماعت کی موت پیدا ہوگی، آخر جب کروڑوں مقتولوں والی عالمگیر جنگ کی آگ یہودی پھونک کی سلگائی ہوئی مانی جاتی ہے، تو اگر ان ہی یہودیوں کے متعلق یہ سمجھا گیا، تو کیا غلط سمجھا گیا اور صرف یہی نہیں، اسی ایک ہزار اٹھارہ میں بیچارے ان شہید معلموں کو بھی شمار کرلیا گیا ہے، جن کو نجد والے اپنے ملک میں وعظ وتلقین، تعلیم وتذکیر کیلئے لے گئے، اور ''معونہ'' نامی کنویں پر ستر آدمیوں کو شہید کردیا گیا، ان ہی میں وہ دس مبلغ بھی ہیں، جنہیں بے دردی کے ساتھ بلاوجہ ''رجیع'' کے مقام پر ذبح کردیا گیا، یہ تو مسلمانوں کی طرف سے شہید ہوئے، اسی طرح فریق ثانی کے ان مقتولوں کو بھی اسی تعداد میں سریک کرلیا گیا، جو بجرم قصاص، یا ڈاکہ، یا چوری مارے گئے، یا گرفتاری کے سلسلہ میں قتل ہوئے، لوگ سوچتے نہیں، ورنہ دس سال کی اس طویل مدت میں اگر جنگ کا اطلاق کسی معرکہ، یا مہم پر ہوسکتا ہے، تو وہ ''بدر'' ہے، جس میں بائیس مسلمانوں اور ستر قریش کے، اسی طرح ''احد'' میں ستر مسلمانوں اور تیس قریشیوں کے آدمی کام آئے، بشرطیکہ ہزار پندرہ سو آدمیوں کے مجمع اور ان کی باہمی آویزش کا نام بجائے جھڑپ کے جنگ اور ''بیٹل'' رکھا جائے۔

بہرحال قریشیوں سے جو کچھ چھڑ چھاڑ ہوئی، وہ اسی پر ختم ہوگئی، نہ ''خندق'' میں بازارِ قتال گرم ہوا، نہ مکہ میں خونریزی ہوئی، اسکے بعد ایک دو معرکے یہودیوں سے ہوئے، جن میں خیبر سب سے اہم ہے، اس میں اٹھارہ مسلمان شہید اور ترانوے یہودی مارے گئے۔ ''عیسائیوں'' سے ''موتہ'' میں گھمسان کی جنگ ہوئی، لیکن اس گھمسان میں بھی مسلمانوں کے کل بارہ شہیدوں کا حال معلوم ہوا، اس کے سوا کچھ ڈاکوؤں کا تعاقب ہے، چوروں کا پیچھا کیا گیا، باغیوں کی سرکوبی کے لئے کوئی دستہ روانہ کیا گیا تھا، جس میں اکثر مواقع میں جنگ کی نوبت ہی نہیں آئی، بہرحال اگر خالص لڑائی اور جہاد کے شہیدوں اور مقتولوں کا حساب کیا جائے، تو ان کی تعداد پانچ چھ سو سے زیادہ اس کل دس سال کی مدت کے اندر سارے ملک عرب میں ان شاء اللہ ثابت نہ ہوگی، حالانکہ مقابلہ

میں عرب کے وحشی قبائل، طاقتور جمہوریتیں، اور بعض سلاطین بھی تھے، لیکن جس کو طائف کے بعد سب کچھ دے دیا گیا تھا، کیوں سوچا جاتا ہے کہ اس کو کیوں کر ملا، اس کے ساتھ ایسا کیوں ہوا، جس کی زندگی کا ہر واقعہ اس کے کلمۂ دعوت وعویٰ ''لا الٰہ الا اللہ'' کی دلیل ہے، آخر ان واقعات میں بھی اسی کو کیوں ڈھونڈا جاتا......؟

الغرض یہ ہیں کل دس سال اور وہ سارے جنگ وجدال جن کے خون کا افسانہ ہزار ہا بوقلموں، رنگوں سے رنگین کر کے دنیا کو سنایا جاتا ہے۔

اب دیکھو کہ جہاں انسان مسجودِ ملائکہ انسان کی جان ایک مچھر اور مکھی سے بھی زیادہ قیمت نہیں رکھتی تھی، اس کی جان تو بڑی چیز ہے، اس کے کپڑے کا دھاگا بھی رات کی اندھیریوں میں کوئی نکال نہیں سکتا، امن وامان کا دور دورہ ہے، عالم پر منطبق کرنے کیلئے انسانی زندگی کے جس آئین ودستور کا نقش مدینہ کے پرچم میں گاڑا گیا تھا، اس کے نیچے چلے آتے ہیں، بے تابانہ چلے آتے ہیں، آدم کے بچے ہر چہار طرف سے چلے آتے ہیں، فوج درفوج چلے آتے ہیں، وفود کا تانتا بندھ جاتا ہے۔

پھر کیا مدینہ میں جو پایۂ تخت قائم ہوا، وہاں منبر کی جگہ تخت بچھایا گیا، وہی منبر ہے، وہی مسجد ہے، وہی جھونپڑے ہیں، وہی چمڑے کا اکہرا گدّا ہے، نہ حاجب ہیں، نہ دربان ہیں، امیر بھی آتے ہیں اور غریب بھی آتے ہیں، دونوں کے ساتھ ایک معاملہ ہے، عجب دربار سلاطین کہتے ہیں، شاہی دربار تھا کہ فوج تھی، علم تھا، پولیس تھی، جلاد تھے، محتسب تھے، گورنر تھے، کلکٹر تھے، منصف تھے، ضبط تھا، قانون تھا۔

مولوی کہتے ہیں مدرسہ تھا کہ درس تھا، وعظ تھا، افتا تھا، قضا تھا، تصنیف تھی، تالیف تھی، محراب تھی، منبر تھا۔ صوفی کہتے ہیں خانقاہ تھی کہ دعا تھی، جھاڑ تھا، پھونک تھا، درد تھا، وظیفہ تھا، ذکر تھا، شغل تھا، تخث (چلہ) تھا، گریہ تھا، بکا تھا، وجد تھا، حال تھا، کشف تھا، کرامت تھی، فقر تھا، زہد تھا، قناعت تھی، کنکریاں دی جاتی تھیں کہ کھارے کنوؤں کا پانی میٹھا ہو جائے گا، بچوں کے سر پر ہاتھ پھیرا جاتا ہے، جس کو جو کہہ دیا جاتا ہے، پورا ہوتا ہے۔

مگر سچ تو یہ ہے کہ وہ سب کچھ تھا، اسلئے کہ وہ سب کیلئے آیا تھا۔ آئندہ جس کسی کو چلنا تھا، جہاں کہیں چلنا تھا، جس زمانہ میں چلنا تھا، اسی روشنی میں چلنا تھا۔

یہ تو عرب کیلئے ہوا، عرب ہی کے اندر دیکھو کہ عرب کے باہر کا کام شروع ہو جاتا ہے۔اسی دس سال کے عرصے میں مشرق کی سب سے بڑی قوت "پرشین ایمپائر" اور مغرب کی سب سے بڑی طاقت "رومن ایمپائر" کے ساتھ اطراف وجوانب کے سلاطین کو بھی چونکا دیا جاتا ہے کہ وقت سے پہلے جاگ جاؤ، جو جاگا اس نے پایا، جو سویا اس نے کھویا، "کسریٰ" نے خط پھاڑا، اس کا ملک پھاڑ دیا گیا، "قیصر" بھی پھاڑ دیتا اور خدا کرتا کہ وہ پھاڑ دیتا، تو وہ بھی پھٹ جاتا، لیکن معاملہ کو ملتوی کر کے اس نے اپنی قوم اور اپنے ملک کی موت کو ملتوی کرالیا اور اتنا ملتوی کیا کہ گویا وہ فوج آج تک واپس نہیں ہوئی اور خدا ہی جانتا ہے کہ کب واپس ہوگی، جسے رومیوں کی طرف روانہ کر کے دماغ کے ان عجیب وغریب تجربات دینے والا پاک وجود پھر "دل" کے حالات میں مستغرق ہو کر اس بستر پر لیٹ گیا جس پر لیٹنے کے بعد پھر اٹھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی ہے، اللھم صل علیہ و سلم۔

دیکھنے والوں نے دیکھا تھا کہ اس بستر پر لیٹنے کی جو آخری رات تھی، اس کے روشن کرنے والے چراغ میں تیل کسی غریب پڑوسی سے قرض کر کے آیا تھا اور جو چادر اس وقت مرضِ واپسیں کے مریض پر پڑی ہوئی تھی، جب بعد کو دیکھا گیا، تو صرف پھٹا ہوا ایک ایک سیاہ کمبل تھا، جس کے اُوپر تلے پیوند لگے ہوئے تھے، اس کی زِرہ تیس صاع جو پر ایک یہودی ساہوکار کے یہاں گرو تھی۔

جاننے کے بعد نہ ماننے کیلئے جھوٹ کے بلوں میں پناہ پکڑنے والو! سوجھ رہا ہے، دیکھ رہے ہو، جو اس بستر پر لیٹا ہوا ہے، انصاف کے خُونیو! کیا یہی مکہ کا وہ فقیر ہے، جس کے متعلق تمہاری گندی زبانوں نے غل مچایا کہ وہ مدینہ کا بادشاہ ہو گیا تھا اور کیا آج ہی اس کا یہ حال ہے، دس سال کی اس مدت میں کس نے اس کے گھر سے روز دھواں اٹھتے دیکھا؟ ایسے بادشاہ کس دنیا میں گزرے ہیں، جن کے منہ کو جو کے بے چھنے آٹے کی روٹی بھی میسر نہ آئی؟ فقیروں نے بھی کبھی دو دو تین تین مہینے تک صرف پانی اور خشک چھوہاروں پر زندگی گزاری ہے؟ فاقہ مستوں نے بھی کبھی بھوک کی شدت میں پیٹ پر دو دو پتھر باندھے ہیں؟ بادشاہوں کی لڑکیوں کے ہاتھ میں پیسنے کا گٹھا اور گردن میں پانی بھرنے کے نشان دیکھے گئے؟ ایسی شاہزادی زمین کے کس خطہ میں پائی گئی، جس کو، جس کے بچوں کو دو دو تین تین

دن بھوک کی شدت میں دن کورات اور رات کو دن کرنا پڑا ہے؟

بادشاہوں کا قصر کیا اسی کو کہتے ہیں، جن کے کھجوروں کے پتوں کی چھت سے بھی آدمی کا سر لگتا ہو؟

''مدینہ'' کے بادشاہ کا شاہی محل تو اسوقت بھی موجود ہے، اس کے طول وعرض کو تو اب بھی ناپ سکتے ہو، باہر میں اس کے کچھ بھی ہو، لیکن اندر تو اس کا وہی ہے، جو پہلے تھا۔

بہر حال دس سال تک ''دماغ'' کا بھی اسی طرح کھلی روشنی میں تجربہ کرایا گیا، جس طرح تیرہ سال تک ''دل'' کے مشاہدات پیش کئے گئے۔

اور تم دیکھو کہ اسی عرب میں ایک طرف ان کا نشہ اتارا گیا، جن کی بڑائی میں خدا کی کبریائی کی بھی گنجائش نہ تھی، تو دوسری طرف ان ہی میں ایک اور نشہ پیدا ہو گیا کہ خدا کی بڑائی کے سوا ان کے اندر کسی کی بڑائی باقی نہ رہے، یہی وہ گروہ تھا، جو ''سینا'' کی روشنی میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ملائکہ قدوسیوں کی شکل میں نظر آیا، وہی دعویٰ جس کی دلیلیں مسلسل خود اپنے اندر سے اس دعوے کا مدعی اعلان سے پہلے چمکار ہا تھا، اسی دعوے کے نسخہ کو ان پر بھی پیش کیا گیا، جنہوں نے جان کر اس کو مانا تھا، یہ نسخہ ان کو پلایا گیا۔

اور کسی جنگل، یا پہاڑ کے غاروں میں نہیں، تلوار کی چھاؤں میں اس کی مشق کرائی گئی، پلا کر بھی دیکھایا جاتا تھا اور چھڑا کر بھی دکھایا جاتا تھا۔ ''بدر'' میں جب پی کر اُترے، تو اس کے نتائج بھی ان کے سامنے تھے اور ''احد'' میں جو کچھ ہوا، ان ہی کی بدولت ہوا، جن سے پینے میں کچھ کوتاہی ہوئی، مکہ جب فتح ہوا، تو سب اسی نشہ میں سرشار تھے، ''حنین'' میں جب میدان چھوٹا، تھوڑی دیر کے لئے چھوٹا، تو تم اس کے میدان کے نقشے میں اور اس کی گھاٹیوں، پہاڑیوں میں اس کے اسباب کو کھوجو، لیکن میں کیا کروں کہ قرآن نے اس نشہ کی کمی کا ان میں نشان دیا ہے، جس کا ان کو تجربہ کرایا جارہا تھا۔

تم کہتے ہو کہ وہ ان تیر اندازوں سے بھاگے، جو اندر نہیں، بلکہ باہر گھاٹیوں میں چھپے ہوئے تھے اور قرآن کہتا ہے کہ وہ ''مجاریٔ'' اور اکثریت کے اس اعتماد سے بھاگے جو ان کے اندر چھپا ہوا تھا۔

﴿وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنكُمْ شَيْئًا﴾

''اور حنین کے دن جب اپنی کثرتِ تعداد نے تم کو مغرور کر دیا، لیکن یہ کثرتِ تعداد تم کو فائدہ نہ پہنچا سکی''۔

کا مطلب اسکے سوا اور کیا ہے؟

اگر یہ مقصود نہ تھا، تو جس کو طائف سے واپسی کے بعد سب کچھ مل چکا تھا، اس کو اس ''لاؤ'' اور اس ''دلشکر'' کی کیا ضرورت تھی، یوں بھی تو اس کا داہنا ہاتھ عجیب وغریب کمالات دکھاتا تھا، یہ غرض نہ ہوتی، تو کیا صرف اسی سے وہ سب کچھ نہیں کر سکتا تھا اور جب جی چاہا، تو کیا خاک کی مٹھی سے اسی نے وہی کام نہیں لیا، جو ''ہوئٹزز'' کے لوگوں سے لیا جاتا ہے۔

اندھے ہیں جو کہتے ہیں کہ وہ خون بہاتا تھا، جس کا خون بہایا گیا، جس کی داڑھی خون سے دھوئی گئی، جس کے دانت توڑے گئے، جس کی پیشانی میں ''زِرہ'' کی کڑیاں چبھائی گئیں۔ نابیناؤ! اسی پر الزام دھرتے ہو کہ اس نے خون بہایا۔ چورو! کوتوال ہی کو اُلٹے ڈانٹتے ہو، بکفِ چراغ ہو کر ڈانٹتے ہو، حالانکہ ترسٹھ سال کی طویل مدت عمر میں کیا کوئی ثابت کر سکتا ہے کہ خونیوں میں پلنے والے اس انسان نے خون تو کیا، کسی کا بال بھی توڑا تھا۔

اُف! اگر وہ خون بہانا چاہتا، تو پھر ہزاروں کے خون کو صرف ایک کے خون سے کیوں بچاتا، قطرہ بہا کر سمندر کو کیوں باندھتا، یہی یہودی جن کا خون ہر زمانہ اور ہر ملک میں تقریباً ہر صدی میں ارزاں رہا ہے اور اب تک ہے، جب خون کے مستحق ہو چکے تھے اور ہر اعتبار سے ہو چکے تھے، لیکن ان کے ہزاروں کے خون کو صرف کعب بن اشرف اور رافع بن حقیق، دو ہی آدمیوں کے خون سے کیوں محفوظ کر دیا گیا، بہت بڑا خیر وہ شر ہے، جس کے ذریعہ سے کسی عظیم وجلیل شر کا سدِ باب ہوتا ہو، قصاص میں زندگی ہے، آخر اس قانون میں اور کیا ہے، بلا شبہ ان دونوں کی موت میں ان تمام یہودیوں کی زندگی کی ضمانت تھی، جو ان کے بعد زندہ رہے، پھلے پھولے، ورنہ جو منصوبے ان دونوں نے پکائے تھے، اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ عرب سے یہودیوں کا اسی وقت نام ونشان جاتا رہتا، جیسا کہ ہمیشہ اسی قسم کے بد باطن یہودیوں نے اپنی قوم پر ہر ملک میں ہر زمانہ میں زندگی تلخ کی ہے، جس کا سلسلہ اب تک جاری ہے، بلکہ سچ یہ ہے کہ بنی قریظہ کی چھوٹی جماعت اگرچہ ان ہی کی شریعت ان ہی کے حکم سے مٹائی گئی، لیکن اسی کے ساتھ کیا اس چھوٹی جماعت کی موت میں عرب کے سارے

یہودیوں کی زندگی مستور نہ تھی....؟ سنگ دل اور ظالم ہے وہ جراح جس نے ایک انگلی کیلئے پورے جسم کو سڑنے دیا۔

آخر میں ان تجربات کے سلسلہ میں نادر ترین تجربہ یہ ہے کہ یہی دس سال کا زمانہ ہے، اس کے بھی چند سال گزر چکے ہیں اور اب وہی جو عرب کیلئے بھی تھا، عجم کیلئے بھی تھا، مردوں کیلئے بھی تھا اور عورتوں کیلئے بھی تھا، زندگی کے آخری دنوں میں ارادہ فرمایا جاتا ہے کہ جس طرح مردوں میں قدوسیوں کی یہ آخری جماعت پیدا کی گئی ہے، سارے جہاں کی عورتوں کے لئے قیامت تک نسلِ انسانی میں جو عورتیں پیدا ہونے والی ہیں، ان سب کیلئے ان کی تعلیم کیلئے، تربیت کیلئے ان کے نمونہ کے لئے عورتوں کی بھی ایک جماعت تیار کی جائے، شاید یہ قدرت کی طرف سے تھا اور اس کی کون سی بات قدرتی نہ تھی کہ جہاں سے دنیا کے اس عالمگیر نقشے، اور حیات انسانی کے کامل دستور العمل کا جھنڈا اٹھایا جاتا ہے، وہ نہ ''لندن'' ہے، نہ ''پیرس''، حتیٰ کہ ''بمبئی'' بھی نہیں اور ''کلکتہ'' بھی نہیں، بلکہ سوچو تو بیابان کی اس کوردہ آبادی کی تمدنی وعمرانی لحاظ سے وہ حیثیت بھی نہیں، جو ہندوستان کے معمولی اضلاعی شہروں اور قصبوں کی ہے، لیکن دنیا کے اسی دور افتادہ، ویران، ریگستان، نخلستان میں حیرت ہے کہ سارے جہاں کے ''مذاہب وادیان'' اسلیئے اس کے آگے پیش ہو جاتے ہیں کہ تردید وتکذیب نہیں، بلکہ سب کی تصدیق، سب کی تصحیح، سب کی تکمیل عملی شکل میں ممکن ہو کہ وہ ''مکذب'' نہیں، بلکہ ''مصدق'' تھا اور یہی اسکے دعویٰ کا سب سے بڑا امتیازی نشان ہے۔

ہندو مذہب تو ''وثنیت'' کی شکل میں ''مکہ'' ہی میں موجود تھا۔ ''مدینہ'' آنے کے بعد، اس کے آگے دنیا کا دوسرا عالمگیر مذہب ''یہودیت'' بھی سامنے آگیا، اس کے ساتھ خود ''مدینہ'' میں اطرافِ مدینہ میں وہ ''نصرانیت'' بھی موجود تھی، جس کے زیرِ اثر دنیا کی آبادی کا بڑا حصہ اس وقت بھی تھا اور اس وقت بھی ہے، اس کے حلقہ میں ''مجوسی'' اور ایران کے آتش پرست ''زردشتی'' بھی شریک تھے اور اردگرد میں ایک فرقہ ''صابئوں'' کا بھی تھا، جس کے متعلق کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ عرب کے ان ''صابئوں'' کا تعلق ''بودھ مذہب'' کے ''سادھوؤں'' سے تھا، یا ان کے سوا کوئی اور فرقہ تھا، جسے دنیا اب نہیں جانتی ہے۔

الغرض کوہستان کی اس چھوٹی سی بستی میں یہودیت، عیسائیت، ہندویت، یا وثنیت،

مجوسیت، اور اگر چاہو تو کہہ سکتے ہو کہ بودھیت اپنے ان تمام مفاسد کے ساتھ موجود تھی، جن کے دھونے اور جن سے پاک کرنے کے لئے وہ اٹھایا گیا تھا، پس اس نے ان سب کو دھویا، ان سب کو پاک کیا، صاف کیا، جس میں جو کمی تھی سب کو پورا کیا اور قیامت تک کیلئے پورا کیا۔

اور جس طرح دنیا کے ہر مذہب کے مردوں میں قدرت نے اس کو کچھ لوگ دیئے، دیکھو کہ قریب قریب کچھ اسی طرح سے زندگی کے آخری دنوں میں تقریباً دنیا کے ان تمام بڑے مذاہب کی عورتوں میں سے ایک ایک نمائندہ اس کی خدمت میں قدرت ہی کی جانب سے حاضر کی جاتی ہے، عورتیں اسکی خدمت میں اگر عورتوں کی حیثیت سے آتیں، تو کیا وجہ تھی کہ جب مکہ میں ہر قسم کی یہی عورتیں اس کے آگے پیش کی گئیں، تو اس بزرگ خاتون کے مقابلہ میں جو عمر میں ان سے پندرہ سال بڑی تھیں، پچاس سال کی عمر تک کسی کو پسند نہیں کیا، پچیس سال کی جوانی سے پچاس سال کی عمر تک تم میں کون نہیں جانتا کہ بجز حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے آپ نے کسی سے نکاح نہیں فرمایا، جو نکاح کے وقت چالیس سال کی ہو چکی تھی اور اس سے پیشتر ان کے دو شوہروں کا انتقال ہو چکا تھا، جو عورت کو عورت کی حیثیت سے اپنے گھر میں لاتا ہے، کیا چالیس سال کی بیوہ کے ساتھ پچاس سال کی پوری زندگی گزار سکتا ہے۔

ہاں! جب سب کچھ ہو چکا ''دل'' کا بھی تجربہ ختم ہو چکا۔ ''دماغ'' کے تجربات بھی دنیا کے سامنے آچکے، قتل وخون، فتنہ وفساد کا متلاطم سمندر ملک عرب، امن وامان، راحت و آسائش کی چھاؤں کے نیچے زندگی کی قیمت حاصل کرنے لگا اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اگرچہ عرب کا اکثر حصہ ہمیشہ سے کسی غیر عرب کا محکوم نہ تھا، لیکن باہم ان میں بڑوں نے چھوٹوں کو اپنا غلام بنا رکھا تھا اور پھر سب مل کر وہمی مخلوقات کی غلامی کی رسیوں میں گھسیٹ رہے تھے، اس غلامی سے ان کو حقیقی آزادی میسر آئی، انسانیت اپنے فطری مقام سے ہٹ کر موچ کھائی ہوئی ہڈی کے مانند بے چین تھی، بے کل تھی، پھر اس کو اپنا وہ اصلی مقام نصیب ہوا، جس پر پہنچے بغیر قلوب انسانی مطمئن نہیں ہو سکتے، ایسی صورت میں پھر یہ کیسا بد اندیشہ اور خبیث خیال ہے کہ آزادی کی اس نعمت سے ایک پورے طبقہ، نصف حصہ کو محروم رکھا جاتا ہے، یہ سچ ہے کہ ان کا، ان بے زبانوں کا کسی نے خیال نہیں کیا، رحم کی نگاہ

کسی کی ان پر نہیں پڑی، لیکن کیا کہتے ہو کہ ''رحمۃ للعلمین'' کی نظرِ کرم سے بھی یہ بے چاریاں محروم رہتیں، جس طرح اب تک تھیں، ایسا نہیں ہوسکتا تھا، جوسب کیلئے تھا، وہ سب ہی کیلئے ہوااور یہی ہونا بھی چاہئے تھا، اس نے بے سمجھ، خام فہم، نا تجربہ کار عورتوں کا انتخاب نہیں کیا کہ ان کو دوسروں کیلئے نمونہ بنایا تھااور دیکھو! وقت بھی کم ہے، فرصت تنگ ہورہی ہے، شاید یہی وجہ ہے کہ چن چن کر مختلف طبائع اور مزاج، مختلف مذاہب اور ادیان کی سن رسیدہ، فہمیدہ وسنجیدہ بیوہ عورتیں زندگی کے سردوگرم کا تجربہ کرچکی تھیں، ان کی ایک برگزیدہ، پاک منتخب جماعت کومختلف اسباب ووجود کے پردہ میں قدرت نے اس کی خدمت میں اس وقت مہیا کیا، جب اپنے فرض سے سبکدوشی کا وقت آخر ہورہا تھا، اس کی زندگی کا یہ آخری کارنامہ تھا، کھل چکا تھا کہ مکہ فتح ہوتا ہے، خدا کی زمین کا ''مرکز'' جھوٹے خداؤں کی نجاست سے پاک ہوتا ہے، جس کے بعد اس کا کام ختم ہوجاتا تھا۔

میں بتا چکا ہوں کہ ''غیب'' اور اس کے ''آیاتِ کبریٰ'' جس وقت کھولے گئے تھے، آخر میں بانیِ کعبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دیکھنا اسی کی دلیل تھی کہ کعبہ کی تطہیر اس کا آخری کام ہوگا۔ ''مرکز'' اور ''ام القرایٰ'' پر قبضہ دلانا اصل کام تھا، اس کے بعد مفصلات اور ''ام القرایٰ'' کے ''قری'' جو کعبہ کے چاروں طرف زمین کے آخری حدود تک پھیلے ہوئے ہیں، ان کا کام آنے والوں کے سپرد کردیا جائے گا اور اسی غیبی مکاشفہ میں نہیں، بلکہ مسلسل ایسے مکاشفے مختلف پیرایوں میں ہورہے تھے، جن کا مطلب یہی تھا کہ کام ختم ہورہا ہے، پس اس کام کو کامل طور پر ختم کرنے کیلئے مردوں کے ساتھ چند عورتوں کی تعلیم وتربیت کا کام اپنی آخری زندگی میں اس کو اپنے سر لینا پڑا، یہ بھی ہوسکتا تھا کہ عورتیں خدمت مبارک میں اسی حیثیت سے رہتیں، جس حیثیت سے مردوں کی ایک منتخب اور چیدہ جماعت ساتھ رہتی تھی، لیکن ''دماغ'' کی بیداری کا یہ کیسا روشن تجربہ ہے کہ اس نے مصنوعی مذہبی مقتداؤں اور روحانی پیشواؤں کی ان مجرمانہ پیش قدمیوں کا راستہ ان عورتوں سے نکاح کرکے ہمیشہ کیلئے مسدود کردیا۔

ہیکل کی خدمت کیلئے عمران کی عورت نے صرف ایک لڑکی پیش کی تھی، پھر دیکھو! اسی ایک کنواری کے آڑ میں چرچوں پر، گرجاؤں پر، ان کے اماموں پر، خطیبوں پر، رہبانوں پر،

بطریقوں پر کتنی کنواریاں روز بھینٹ چڑھائی جاتی ہیں۔ خدانخواسہ اگر کسی ایک اجنبی عورت کونزدیکی کی وہ حیثیت دی جاتی، جو باہر مردوں کو حاصل تھی، تو کون اندازہ کرسکتا ہے کہ بعد کو آدم رو ابلیسوں کیلئے قرب ونزدیکی کا یہ حیلہ کن خباثتوں اور شرارتوں کی بنیاد بن جاتا، جب کوئی نمونہ نہیں موجود ہے، اس وقت تو بغیر نمونہ کے زندگی گزارنے والوں نے فتنے برپا کئے، خدانخواسہ اگر ''نیم بیضہ'' بھی میسر ہو جاتا، تو پھر سیخ میں کتنے ہزار مرغ گھتے جاتے، اسکا کون اندازہ کرسکتا ہے؟

الغرض ان عورتوں کو ''بیوی'' کا مقام عطا کیا اور جس کو انسان سوچ نہیں سکتا، اس حد تک ان کے ساتھ حقیقی عدل اور برابری کا نمونہ اس نے پیش کیا، جس کا ''دماغ'' عالمگیر حکومت، عالمگیر سیاست، ہمہ گیر تعلیم وتربیت کی الجھی ہوئی پیچ در پیچ گتھیوں کے سلجھانے میں اسی وقت مصروف تھا، جس وقت عائلی اور خانگی زندگی کی ژولیدگیوں کو بھی بہ کشادہ پیشانی حل کر رہا تھا، اور اس آسانی کے ساتھ حل کر رہا تھا کہ خواہ اس کی مدت کتنی ہی کم ہو، لیکن بد اندیشوں، یا وہ خیالوں کو دور سے زندگی ایسی سلجھی ہوئی خوشگوار لذیذ نظر آئی کہ بدبختوں نے اپنے اندر برے خیالات پکائے، گویا سچ مچ اس خیر میں کوئی شر نہیں اور اس راحت میں کوئی زحمت نہیں تھی، ایک بیوی کے تعلقات کی شیرینی کو مسلسل تلخیوں سے بدلنے والے کیا یہ سوچ سکتے ہیں؟ البتہ اس کا اندازہ وہ ضرور کرسکتے ہیں کہ چند بیویوں کو خوشگوار رکھنا فطرتِ انسانی کے اعجاز نہیں ہے، تو اور کیا ہے؟ بلا شبہ یہی ایک عائلی تجربہ بھی ان بددماغوں اور بدعقلوں کیلئے کافی ہے، جو جاننے کے بعد ماننے سے اسلئے ہچکچاتے تھے کہ دل میں تو نہیں، لیکن ''عقل'' اور ''دماغ'' کے نظم میں ان کو بدنظمی کا اندیشہ ہوا، جس کی زندگی کا ہر شعبہ شخصی، عائلی، خاندانی، قومی، سیاسی، صرف ضبط اور نظم ہے، اس کے متعلق یہ وسوسہ خود سوچنے والوں کی کیا عقلی بدنظمی کی کھلی دلیل نہیں ہے؟ یہی نہیں، بلکہ سچ یہ ہے کہ زندگی کے اس قلیل حصہ کا کوئی دقیقہ، کوئی نکتہ ایسا نہ تھا جو نگاہ سے اوجھل ہو۔ دیکھ چکے کہ دنیا کی عورتوں کیلئے جو نمونہ بنائی گئیں، ان میں سے سب کی سب سن رسیدہ تجربہ کار بیوہ عورتیں ہیں، جیسا کہ مردوں کیلئے جو جماعت نمونہ بنائی گئی، ان میں بھی زیادہ تر تجربہ کار، سرد گرم چشیدہ لوگ تھے، ایک ایک ان میں ایسا تھا، جو ملکوں پر بھاری، قوموں پر گراں ثابت ہوا۔

لیکن دقیقہ سنجیوں، نکتہ نوازیوں کے اس سلسلہ میں انتہا اس وقت ہوتی ہے، جبکہ ایک طرف اگر مردوں کے نمونہ میں ایک ایسا نمونہ ہے جس کا دل، جس کا دماغ، جس کا ظاہر، جس کا باطن ہر قسم کے اجنبی اثرات سے قطعاً آزاد ہے، اسی صحبت میں اس نے آنکھیں کھولیں، ان ہی کی گود میں اس نے ہوش سنبھالا، آخر وقت تک وہ اسی حال میں رہا۔

پھر جس طرح مردوں کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شکل میں ایسا نمونہ دیا گیا، جو دوسال کی عمر سے اس وقت خدمتِ مبارک سے علیحدہ ہوئے، جب لوگوں نے مرقد انور سے ان کو نکلتے دیکھا، کیا ظلم نہ ہوتا اگر بے زبان عورتوں کو اس بے نظیر، ناگزیر نمونہ سے محروم رکھا جاتا، یہی وجہ ہے کہ تم دیکھتے ہو کہ سن رسیدہ اور ادھیڑ، بلکہ بعض بوڑھی عورتوں کے اسی مجمع میں ایک وہ طاہر طیبہ، صدیقہ کنواری بیوی صاحبہ بھی ہیں، جن کو آپ نے اپنے زیرِ اثر سات ہی سال کی عمر سے لے لیا تھا اور قبل اسکے کہ ان کا دل، ان کا دماغ کسی غیر نبوی اثرات کو غیر شعوری طور پر جذب کرے، نویں سال کی عمر میں اپنی رفاقت میں لے لیا، عموماً سفر وحضر میں ساتھ رکھا، پھر دیکھو کہ جس طرح مردوں کے اس "مظہرِ عجائب وغرائب" وجود سے دنیا کو اگر وہ سب کچھ ملا، جو کسی دوسرے سے نہیں ملا، تو کیا ٹھیک اسی طرح اس عجیب و غریب ذہن وذکاء، فضل وکمال، تقویٰ وعفت کے سرچشمہ سے دنیا کو جو دولت تقسیم ہوئی، صرف عورتوں ہی میں نہیں کہ وہ توان کا گروہ ہی تھا، غالباً مردوں کو بھی کسی دوسرے سے اتنا نہیں ملا؟

محدثین سے پوچھو! کہ وہ کیا کہتے ہیں؟

الغرض ہر قسم کے شکوک وشبہات، وساوس واوہام کی تاریکیوں، ادنیٰ سے ادنیٰ تاریکیوں کو چیرتا پھاڑتا ہوا دعوے کا وہ آفتاب، جس کی صبح کا سپیدہ حراء کے دامن سے پھوٹا تھا، مکہ کے افق سے چڑھتا ہوا تیئس سال کی مدت میں مدینہ کے سمت الراس پر پہنچ کر انتہائی کمال وجمال کے ساتھ دیکھو کہ کس شان، کس آن کے ساتھ چمک رہا ہے۔ آفتاب! دعویٰ کا یہ عجیب وغریب آفتاب جس کے طلوع سے پہلے بھی روشنی تھی اور جس کے ساتھ بھی روشنی ہے، جس کے باہر بھی روشنی ہے، جس کے اندر بھی روشنی ہے، وہ خود بھی نور ہے، جس سے نکلا وہ بھی نور ہے۔ "نور علیٰ نور" کا یہی نورانی نظارہ جس کو دنیا کی آنکھوں کے نور نے

کبھی نہیں دیکھا تھا، لیکن اب ہمیشہ دیکھتی رہے گی، سب کو دکھایا جائے گا، سب دیکھ رہے ہیں، ''ظاہر'' کے، ''باطن'' کے، ''دل'' کے، ''دماغ'' کے تجرباتِ بینہ کی شعاعوں سے ''آسمانی علم'' اور ''لاہوتی عرفان'' کا یہ آفتاب دمک رہا ہے، چمک رہا ہے، بلکہ سچ پوچھو! تو بھبھک رہا ہے، لہک رہا ہے، چھلک رہا ہے۔

عرب کا وسیع صحرا اس کیلئے تنگ ہے، وہ بڑھنا چاہتا ہے، طوفان کی طرح بڑھنا چاہتا ہے، آندھی کی طرح بڑھنا چاہتا ہے اور دیکھو کہ وہ بڑھ گیا، چڑھ گیا، ساری دنیا پر پھیل گیا اور اب تک اسی آب وتاب، جاہ وجلال کے ساتھ کائنات، ساری کائنات کے افق پر اسی طرح چمک رہا ہے، جس طرح وہ اس وقت چمک رہا تھا جب وہ عرب سے نکلا تھا، یقین وقطعیت کی تیز اور ٹھنڈی روشنی میں اس کو آج والے بھی اسی طرح پا رہے ہیں، جس طرح کل والوں نے اس کو اس وقت دیکھا تھا، جس وقت وہ ان کو، ان کی ایک بڑی جماعت کو اپنی زندگی کے عمیق سے عمیق، باریک سے باریک پہلوؤں کا کھلے بندوں علانیہ تجربہ کرا رہا تھا۔

گلیلی جھیل کے چند ماہی گیر، یا مگدھ دیش کے گداگر بھکشو نہیں، بلکہ ہزارہا انسان ایسے انسان جن پر اس عہد کی ساری بڑائیاں ختم ہوتی تھیں، ان میں بادشاہ بھی تھے اور دنیا کے سب سے بڑے بادشاہ ان میں کمانڈر بھی تھے اور دنیا کے سب سے بڑے کمانڈر ان میں دماغ والے بھی تھے، سب سے زیادہ بیدار دماغ والے، ان میں دل والے بھی تھے، سب سے زیادہ روشن دل والے، الغرض انسانیت کی جتنی اونچی سی منزلیں سوچی جاسکتی ہیں۔

تجربہ کاروں کی یہ جماعت ان کی آخری بلندیوں پر ساری دنیا کے آگے مضبوطی کے ساتھ قدم جما کر اس کا ثبوت پیش کر رہی تھی کہ اس وقت کی دنیا میں ان سے اونچا کوئی نہیں ہے، کہیں نہیں ہے۔

نبوت! اور کیسی عجیب نبوت! تجربہ! اور کیسا عجیب تجربہ! کتنا روشن تجربہ، کتنا نکھرا ہوا صاف تجربہ، ہر قسم کی آلائشوں اور کدورتوں سے پاک وصاف تجربہ، کتنی عظیم دانائیوں کا پرکھا ہوا تجربہ، کتنی نازک ذہانتوں کا جانچا ہوا تجربہ، کتنی روشن فطرتوں کا ناپا ہوا تجربہ، کتنی بے رعب، بے جھجک طبیعتوں کا بے لاگ تجربہ، کتنے متوازن معتدل دماغوں کا ناپا تلا تجربہ، چند

نہیں، فوج درفوج، نسل آدم کی غٹ کی غٹ، جوق در جوق افراد کا تجربہ، اتنے افراد کا تجربہ کہ دنیا کے کسی مسئلہ، یا حقیقت کیلئے نہ آج تک انسانوں کی اتنی بڑی جماعت اکٹھی ہوئی اور نہ شاید آئندہ ہوسکتی ہے۔

تجربات ومشاہدات کا یہی حیرت انگیز ذخیرہ تھا، جس کی حفاظت ونگرانی کا فرض کسی خانقاہ کے درویشوں، یا کسی مدرسہ کے معلموں، یا کسی انجمن کے ممبروں، یا کانفرنس کے دفتریوں ،یا کسی افسانہ نگار مؤرخ کی انگلیوں کے سپرد نہیں کیا گیا، بلکہ سب جانتے ہیں کہ زمین پرروئے زمین پر اس زمانہ کی جوسب سے بڑی قاہرہ سلطنت تھی، اس نے اپنا پہلا فریضہ بھی اسی کی حفاظت وتبلیغ قرار دیا اور اس کا آخری فریضہ بھی یہی تھا، درمیان کے جتنے مقدمات تھے، وہ صرف اسی مقصد کے حصول کے ذرائع تھے۔ دنیا کی اس سب سے بڑی سلطنت نے اپنی ہر قسم کی قوتوں کو صرف اسی کی نگرانی اور نشرواشاعت کیلئے مخصوص اور محدود کردیا۔

طاقت کی ان آہنی زنجیروں کی بندش میں حکومت ہی کی سرپرستی میں اس کی تاریخ کا آغاز ہوا اور دیکھو کہ مسلسل اسی طرح ایک حکومت دوسری حکومت کو یہ ودیعت سونپتی چلی آئی، حالانکہ زمانہ کی اس طویل و دراز مدت میں زمین کے مختلف علاقوں میں باہم ان سلطنتوں کے دوسرے اغراض و مقاصد میں خواہ جس قدر بھی اختلاف رہا ہو، لیکن اس ''آسمانی ودیعت'' ان درخشاں ''تجربات بینہ'' ان "عینی مشاہدات" کی غوروپرداخت، تبلیغ وحفاظت میں، سب کی نقاط وارادے قطعی طور پر متحد تھے، بلکہ ہر حکومت نے کوشش کی کہ سعادت کے اس سلسلہ میں جتنا زیادہ حصہ اس کو مل سکے، اس کے حصول میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا جائے، اس کیلئے مدارس کھولے گئے، خانقاہوں کا جال بچھایا گیا، مجلسیں ترتیب دی گئیں، حلقے قائم ہوئے، تصنیف وتالیف کا باب کھولا گیا اور بڑے بڑے عظیم پیمانوں پر کھولا گیا، ایسے پیمانوں پر کھولا گیا کہ شاید دنیا کے کسی ایک فن، ایک علم کے متعلق نہ کبھی دنیا میں اتنے بڑے بڑے عظیم الشان مدرسے کھلے، نہ تصنیفی کوششوں کا اتنا عظیم حصہ انسانی تاریخ میں کسی ایک علم، یا فن کو ملا، جتنا کہ اس عجیب وغریب نبوت کے تجربات ومشاہدات کو ملا اور یوں ہی مسلسل بغیر کسی انقطاع اور کسی وقفہ کے ایک قرن سے دوسرے قرن تک، ایک نسل سے دوسری نسل تک نبوت کا یہ لازوال ابدی، سرمدی، قیم خزانہ منتقل ہوتا رہا اور اس

وقت تک ہو رہا ہے، ہوتا چلا جائے گا، صرف یہی نہیں، بلکہ ہر پچھلے طبقہ میں تم دیکھو گے کہ نبوت کے اس تجربہ کی گواہی ادا کرنے والوں میں اضافہ ہوتا رہا ہے اور کیسا اضافہ؟ ایک اور دو کی نسبت نہیں اور ایک اور تین کی نسبت نہیں، دگنے اور تگنے کی حد تک کا اضافہ نہیں، بلکہ بلا مبالغہ ایک اور لاکھ کی نسبت سے یہ اضافہ بتدریج بڑھتا رہا اور بڑھ رہا ہے، بڑھتا رہے گا، تا ایں کہ ساری نسلِ انسانی اس کی گواہ بن جائے۔

اور اسی تدریجی اضافہ کی نسبتوں کے ساتھ سلطنتوں کے پر جلال، پر شوکت جلوے، بادشاہوں کے شاہانہ اور کڑے پہرے، علماء کی سخت ترین ماہرانہ چوکسی، فقر صوفیہ کی باوقار، پرعظمت نگرانی اور امتِ مرحومہ اسلامی کی فطری بیدار دماغی، طبعی ذکاوت حسی کے حصار میں صدیوں اور سالوں کا کیا ذکر ہے، بلاخوفِ تردید کہا جا سکتا ہے اور کہنا چاہئے، اس کے سوا جو کچھ کہا جائے گا، جھوٹ ہوگا کہ ایک لمحہ، ایک پل کے ادنیٰ ترین حصہ کے انقطاع کے بغیر ٹھیک اسی آن بان، اسی سج دھج کے ساتھ امت کے ان افراد کو ملتا رہا، اس وقت تک مل رہا ہے، جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے رسول کی صحبت سے فیض یاب نہیں ہیں، لیکن اسی کے ساتھ نہ ان کا رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک سیکنڈ کیلئے ان سے اوجھل ہوا اور نہ وہ اپنے رسول ﷺ سے غائب ہوئے، سعادت صحبت سے بہرامند اگر کہہ سکتے تھے اور ان کو کہنے کا حق تھا کہ وہ اپنی نمازوں میں وہی پڑھتے ہیں، جو ان کا رسول پڑھتا تھا۔ (صلی اللہ علیہ وسلم) وہ اسی طرح کھڑے ہوتے ہیں، جس طرح وہ کھڑا ہوتا تھا، اسی طرح جھکتے ہیں، جس طرح وہ جھکتا تھا، اسی طرح زمین پر پیشانی رکھتے ہیں، جس طرح وہ پیشانی رکھتا تھا، تو قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ جن کو یہ سعادت نصیب نہیں ہوئی، ہر قرن، ہر صدی، بلکہ اس وقت بھی جہاں کہیں ہیں، قسم کھا کر کہہ سکتے ہیں کہ وہ بھی وہی پڑھتے ہیں، جو ان کا رسول پڑھتا تھا، اسی طرح کھڑے ہوتے ہیں، جس طرح وہ کھڑا ہوتا تھا، اسی طرح جھکتے ہیں، جس طرح وہ جھکتا تھا، اسی طرح زمین پر پیشانی رکھتے ہیں، جس طرح وہ رکھتا تھا، سبھوں نے تو خدا کی تصویر کھینچی، لیکن ایسا کون ہے، جس کی بندگی کی تشکیل اس طرح کی گئی ہو، "ہوبہ" "من وعن" جیسا کہ وہ تھا، وہ مشکل کیا گیا، کیا جا رہا ہے اور کامل یقین کے ساتھ کیا جا رہا ہے کہ اس کے ساتھ قطعاً وہ واقعات پیش نہیں آئے۔ ہاں!

جس طرح پہلوں کی کتاب چھینی گئی، ان کو ان کے رسولوں، اوتاروں سے جدا کیا گیا، کیا کوئی دکھا سکتا ہے ان کے ساتھ بھی سال دو سال کیلئے نہیں، روز دو روز، گھنٹے دو گھنٹے، سیکنڈ دو سیکنڈ کیلئے بھی (لافعلہ اللہ) ایسا واقعہ پیش آیا اور جس نے دنیا کے کسی گوشہ میں کبھی ایسا ارادہ کیا، کیا مسلسل نہیں دیکھا گیا کہ جس نے چھیننا چاہا، وہی چھینا گیا، جس نے جدا کرنے کا خیال پکایا، وہی جدا کیا گیا، یہی ہوتا رہے گا، جس پر یہ گریں گے، وہ بھی ٹوٹے گا اور جو ان پر گرے گا، وہ چکنا چور ہوگا، پھٹے ہوئے نہیں، بلکہ تاریخ کے کھلے ہوئے مسلسل اوراق میں یہی لکھا ہوا ہے، یہی لکھا جائے گا، بہر حال یہ سلسلہ یونہی جاری رہا، تا ایں کہ بالآخر تاریخ کے اس عجوبہ طراز عہد میں نسلِ انسانی داخل ہوگئی، جس میں ہر بعید قریب، ہر دور نزدیک، بلکہ شاید ہر غائب حاضر ہوگیا، مکانی فاصلے حذف ہوگئے اور وہی دنیا جو کبھی متعدد دنیا سمجھی جاتی تھی، ایک دنیا، بلکہ اگر کہو تو کہہ سکتے ہو کہ ایک بستی ہوگئی، زمانی مسافتیں کم ہو گئی، بلکہ شاید زمانہ کے تین قسموں اور تین حصوں میں سے ایک حصہ ماضی کا تقریباً قابل ذکر نہیں رہا کہ اب جو گزرتا ہے، وہ نہیں گزرتا ہے اور جو غائب ہوتا ہے، حاضر ہی رہتا ہے، وہی نہیں جنہیں دنیا میں کچھ اہمیت حاصل ہے، بلکہ دنیا کی ادنیٰ ادنیٰ پیداوار جو کبھی پیدا ہونے کے ساتھ ہی مٹ جاتی تھی وہ بھی اب انمٹ ہوگئی، قدرت نے اپنی پوشیدہ طاقتوں کا خزانہ، پریس، تار، برق، لاسلکی فون وغیرہ کی شکلوں میں فیاضی کے ساتھ وقت عام فرما دیا ہے، آخر آج کون گن سکتا ہے ان ذرائع اور وسائل کو، جن کے ذریعہ سے دنیا کے حوادثات و واقعات، تحریریں، تقریریں محفوظ ہورہی ہیں، بزن و بازار میں آج یہ چیزیں ماری پھرتی ہیں اور ہر اعلیٰ و ادنیٰ کو میسر ہیں، آج کوئی ''امانت کی اندر سبھا'' اور ''شرر'' کے ناول کو مٹا نہیں سکتا، پھر یہ اندیشہ اب کون کرسکتا ہے کہ تجربات کے ان ذخیروں کو اب دنیا کا کوئی حادثہ فنا کرسکتا ہے؟

ان ساز و سامانوں کے بعد کس قدر عجیب ہے، اگر کہا جائے کہ جو رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) عرب میں پیدا ہوئے تھے، وہ عرب ہی میں پیدا ہوئے تھے اور جس کی ولادت چھٹی صدی ہجری میں ہوئی تھی، وہ چھٹی صدی ہی میں ہوئی تھی۔

اس زمانہ کے جب ہر غائب کو حاضر اور ہر بعید کو قریب سمجھا جاتا ہے، کیا وجہ ہوسکتی

ہے کہ پھران تمام غائبوں میں جوسب سے زیادہ حاضراور ایسا حاضر کہ بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ اتنا حضور ہم میں سے کسی کو خود اپنے سامنے نہیں ہے، ان تمام بعیدوں میں جوسب سے زیادہ قریب اور اتنا قریب ہے کہ خود ہم اپنے سامنے اپنے کو اس قدر قریب نہیں پاتے۔

آخر ہم میں کون ہیں؟ جس کے دماغ میں اپنی پیدائش، طفولیت، شباب، کہولت، خلوت، جلوت کے تمام واقعات اور اس کے تمام پہلو اتنی صفائی کے ساتھ موجود ہوں، جتنی تابنا کی کے ساتھ دنیا اس شخص کے متعلق جانتی ہے، جو اگرچہ آج سے صدیوں پہلے عرب میں ظاہر ہوا، لیکن جس کے ظہور کی شدت ہر پچھلی صدی میں پہلے سے زیادہ محسوس کی گئی، کی جارہی ہے اور انشاء اللہ ہمیشہ اسی بڑھتی ہوئی اشتدادی کیفیت کے ساتھ محسوس کی جائے گی کہ قدرت نے اب جن سامانوں کو پیدا کیا ہے، ان کا یہ لازمی نتیجہ ہے اور شاید اس ہستی مبارک کے اسی غیر منقطع ارتقائی تسلسل کا نتیجہ ہے کہ اس کے بعد نبوت کا دعویٰ دور از کار ہے، اس دعویٰ کا ہر مدہی فالتو اور زمین کی پشت کا بالکل ہی غیر ضروری بار ٹھہرایا گیا، چھٹی صدی عیسوی کے بعد زمانہ کے ہر حصہ میں ٹھہرایا گیا، دنیا کے ہر خطہ میں ٹھہرایا گیا۔

اور جن بدبختوں کے دل میں کبھی اس منصب کی جھوٹی ہوک اُٹھتی ہے، یا اٹھوائی جاتی ہے، تم دیکھو! خلافِ دستور بنی آدم کتنی بدسلوکیوں کے ساتھ آخر وقت تک اس کو درد راتے، دھتکارتے رہے، اٹھنے کو تو یہ اُٹھ جاتے ہیں، لیکن چند مغالطی پینتروں کے بعد ہی ان کو خود یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کیلئے دنیا میں کوئی کام نہیں، بنی آدم کی بستیوں میں ان کیلئے کوئی جگہ نہیں ہے، پھر یوں ہی بازاری بے روزگاروں کی طرح بالآخر سرگردانی کے ساتھ بھٹکتے، بھٹکاتے بہ ہزار حسرت و ناکامی، نامرادی کے گڑھوں میں ہمیشہ کیلئے مدفون ہو گئے، تاریخ شاہد ہے کہ بوالہوسیوں کے بھپھاروں سے بے چین و مدہوش ہو ہو کر اگر کوئی نبوت کا نام لے کر کبھی اٹھا بھی، تو قدرت کے انہیں ہاتھوں نے جلتی ہوئی گھاس کے خاکستر کی مانند اس کو وہیں بٹھا دیا، چودہ سو سال کا یہ تجربی مشاہدہ ہے، حالانکہ اس سے پہلے تاریخ کا کوئی دور ایسا نہیں گزرا کہ چار پانچ سو سال کے اندر کوئی نبی نہ آیا ہو، اس کی ضرورت نہ پیدا ہوئی ہو۔

اگرچہ کھلے کھلے صاف غیر مبہم لفظوں میں بار بار اس کی منادیٰ بھی کر دی گئی تھی اور نبوت و رسالت کے سلسلہ میں یہ پہلی منادیٰ تھی کہ اب آسمان کا پیغام لے کر زمین والوں

کے پاس کوئی نہیں آئے گا، یہی وجہ ہے کہ ختم نبوت کی اس سنگین مہر سے جو بھی ٹکراتا ہے، وہی پاش پاش ہو جاتا ہے اور قدرت کی چٹان پر سر مارنے کا یہ لازمی نتیجہ ہے۔

بالفرض اگر یہ اعلان نہ بھی ہوتا، جب بھی آخر دنیا کیا کرتی؟ آنے والے تو ہمیشہ اسی وقت آتے ہیں، ان میں آتے ہیں، جب جانے والا بھی جا چکے، لیکن ایسا آنے والا، جو اس شان کے ساتھ آیا کہ بجائے جانے کے وہ آگے ہی بڑھتا رہا، بڑھ رہا ہے، گنجائش ہی کیا ہے کہ اس کی جگہ دوسرا آئے۔ جس طرح وہ بھیجا گیا، جن صفات وکمالات کے ساتھ بھیجا گیا، اسی شان، اسی آن کے ساتھ چمکتے ہوئے آفتاب اور دمکتے ہوئے سورج کے مانند ہم میں وہ اسی طرح موجود ہے، ہر جگہ موجود ہے، ہر خطے میں موجود ہے، اس کا وجود مغرب میں بھی اسی طرح نمایاں ہے، جس طرح مشرق میں وہ آب وتاب کے ساتھ چمک رہا ہے، شاہوں کے قصور اور غریبوں کے کلبہائے دیجور دونوں کو روشنی بانٹ رہا ہے اور یکسانی کے ساتھ بانٹ رہا ہے، وہ سب کیلئے برابر ہے، سب کیلئے یکساں ہے، وہ فضا میں بھری ہوئی ہوا ہے، جس میں سب سانس لیتے اور وسعتِ کون ومکان کا وہ نور ہے، جس میں سب چلتے ہیں، پلتے ہیں، پھولتے ہیں، پھلتے ہیں، یقیناً اس کی ضرورت جتنی چھٹی صدی کے باشندوں کو تھی، اتنی ہی ضرورت اس وقت تک باقی ہے، پھر جب تک پیاس ہے، پانی چھلکے گا اور جب تک بھوک ہے، روٹی معدوم نہ ہوگی، آخر اس وقت تک کیا تھا، جواب نہیں ہے، یہ سچ ہے کہ دنیا اپنے خالق سے ٹوٹ کر اس زمانہ میں مخلوقات کے اندر غرق تھی، لیکن کیا آدم کی اولاد تباہی کے اس گرداب سے نجات پا چکی؟

بلاشبہ جنہیں اس کی برکت میسر آئی ہے، ان میں اکثروں کا جو مرتد، یا منافق نہیں ہیں، ان کا بیڑہ خطرہ سے انشاءاللہ نکل چکا ہے، لیکن کون کہتا ہے کہ سب کا نکل چکا ہے؟

پھڑ پھڑا رہے ہیں، ہندوستان کے ایک قطۂ اراضی میں اتنے پھڑ پھڑا رہے ہیں کہ ان کا شمار صد و ہزار سے نہیں، بلکہ کروڑوں سے کیا جاتا ہے اور یہ تو صرف ہندستان کا حال ہے، اس ملک سے باہر بھی کیا کام پورا ہو گیا ہے؟

آباد جزیروں کے اس جنگل میں جہاں آفتاب نکلتا ہے اور مشرق کا وہ گنجان خطہ جہاں بنی نوانسان کی سب سے بڑی آبادی ہے، کیا چین وجاپان کے ان باشندوں کی اپنے

مالک سے صلح ہو چکی ہے؟ یقیناً ایک گروہ وہاں بھی ایسا پیدا ہو چکا ہے، جس نے مخلوقات کی بندگی کا جوا گردن سے پھینک کر حقیقی اور سچی زندگی حاصل کی ہے، لیکن کون نہیں جانتا کہ ان ممالک کی اکثریت ابھی اسی طرح اپنے مالک سے روٹھی ہوئی ہے، جس طرح اس کے آباؤ اجداد روٹھے ہوئے تھے۔ غریب مشرق تو پسماندگان کا ملک ہے، لیکن جن کی پیش گامیوں کا ڈھنڈورا اس زور سے پیٹا جا رہا ہے، کیا یورپ کے ان باشندوں کی سمجھ سیدھی ہو چکی ہے۔ ''باپ بیٹے'' کے قدیم افسانے کو تو چھوڑو، لیکن جن خلقتوں کی ایجاد و تخلیق کی انہیں توفیق بخشی گئی، بجائے توفیق بخشنے والے کے خود اپنے ہاتھوں کے بنائے ہوئے ان مخلوقات کو اپنے دلوں میں نہیں بٹھائے ہوئے ہیں؟ یقیناً ان کے قلوب ان جدید مخلوقات کی انتہائی عظمت سے اسی طرح لبریز ہیں، جس طرح ان کے بزرگوں کے دل پرانی مخلوقات کے احترام سے معمور تھے۔

پہلوں کی عقل کو سورج کی شعاعوں اور آگ کے شعلوں نے خیرہ کیا تھا، تو کیا پچھلوں کے سینوں میں برق کی قوتوں، اسٹیم کی طاقتوں، پٹرول کی توانائیوں نے چکا چوند نہیں لگائی ہے، بزرگوں کے کارناموں، سورماؤں کی اولوالعزمیوں نے اگر پہلوں کو ان بزرگوں کی پتھر کی کھودی ہوئی مورتیوں کے آگے جھکایا تھا، تو پچھلوں کے لیڈروں، زعیموں اور قائدوں کے کاموں نے ان کے اسٹیچو اور فوٹو کے ساتھ ان کی ساری قومی عزت و فلاح کو وابستہ نہیں کیا ہے؟

پرانوں کے دیوتاؤں کی گنتیوں کو سن کر تم قہقہے لگاتے ہو، ہنستے ہو، جب سنایا جاتا ہے کہ احمق ہندوستان، خالق سے ٹوٹ کر چالیس کروڑ دیوتاؤں اور معبودوں کے ساتھ جکڑا ہوا تھا، مگر کوئی ہوتا، جو ان نت نئے دیوتاؤں کی فہرست بتاتا، جن کے ساتھ فرزانہ و دانا یورپ کی روح اس طرح خالق سے بیگانہ ہو کر ڈوبی ہوئی ہے، آخر بتایا جائے ان دونوں نئے اور پرانے طبقوں میں کیا فرق ہے، خالق سے یہ بھی دور، وہ بھی دور، مخلوقات کے بوجھ سے یہ بھی چور، وہ بھی چور، کچھ فرق اگر ہے، تو صرف اس قدر ہے کہ پرانوں کے معبود بھی پرانے تھے اور نئوں کے معبود بھی نئے ہیں، پرانوں کے پرانے معبودوں میں عجائب وغرائب اور نت نئے فوائد نظر آئے تھے اور نئوں کو نئی مخلوقات میں عجائب وغرائب، نت نئے فوائد

نظر آرہے ہیں۔ مظاہر احترام اور تعظیم کے بیرونی قالبوں کی خصوصیتوں سے اگر قطع نظر کر لیا جائے، تو ناپ لیا جا سکتا ہے، اگر قلبی احساسات اور ذہنی کیفیات کے ناپنے کا کوئی آلہ ہوتا کہ پرانوں کے دلوں میں پرانے معبودوں کے متعلق جو کچھ تھا، نئوں کے قلوب میں معبودوں کے متعلق وہی کچھ، بلکہ شاید کہ اس سے بھی زیادہ ہو۔

پرانے بھی تنہا خدا کے نام پر بھپر جاتے تھے، نئوں کے سامنے جا کر آج خدا کا تنہا کیا، بلکہ ان کے معبودوں کے ساتھ ملا کر بھی نام لو، پھر دیکھو کہ ان کی پیشانی کی کھال کس طرح سکڑتی ہے اور منہ سے کتنے تولے کف کے اُڑ اُڑ کے بیچارے نام لینے والے کے چہرے پر پڑتے ہیں، تحریروں میں، تقریروں میں، گفتگو میں، تذکروں میں، کیا نئوں کا یہ گروہ اپنے معبودوں کا نام لئے بغیر کبھی گزرتا ہے، برق کا، بھاپ کا، تار کا، ریل کا، سیاروں کا، طیاروں کا، فیکٹریوں کا، ملوں کا، بنکوں کا، سرمایوں کا، ان کی مختلف شکلوں، مثلاً انشورنسوں، ریسوں اور خدا جانے کن کن خداؤں کا نام آج دلچسپی کے ساتھ جس، ذوق، شوق کے ساتھ لیا جاتا ہے، مشکل ہے کہ خالق کے پوجنے والوں نے اتنے ذوق وشوق کے ساتھ " بسم اللہ، سبحان اللہ، الحمد اللہ، لا الٰہ الا اللہ" کا ذکر کبھی کیا ہو۔

یہ حمد بھی کرتے ہیں، تو ان ہی خداؤں کی، نعت بھی لکھتے ہیں، تو ان ہی کی، پھر میں کیا غلط سمجھا جب میں نے کہا کہ جو پرانے تھے، وہی نئے ہیں، چند مخلوقات کے گرد پالتیاں مارے وہ بھی بیٹھے تھے اور ٹھیک اسی طرح فطرت کے چند نوامیس وقوانین کے آگے یہ بھی محوِ رقص ورامشگری ہیں، وہ ان کا بھجن گاتے تھے، یہ ان کا شکر کرتے ہیں۔

﴿أَتَوَاصَوْا بِهِ بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ﴾

تم کہتے ہو کہ پہلوں نے انسانیت کو ذلیل کیا: جو سب سے اونچا تھا، وہ سب سے نیچا اور "اسفل سافلین" کے درجہ پر پہنچایا گیا۔

بلاشبہ یہی ہوا، یہی ہونا بھی چاہئے کہ خالق ایک ہے اور مخلوقات لامحدود ہیں، پس جس نے ایک کو چھوڑا، اس کو ہر ایک سے جوڑنا پڑے گا، جو ایک سے نہیں ڈرے گا، اس کو ہر ایک سے ڈرنا پڑے گا، جو جھکنے ہی کیلئے ہے، اسکو جھکنا ہی پڑے گا، لیکن ایک کے آگے جھکا، تو سب اس کے آگے جھکیں گے اور جس نے ایک کے آگے سر ٹیکنے سے انکار کیا، دیکھو! وہ

ہر ایک کے آگے سر ٹیکے پڑے ہیں، ملائکہ کے آگے، جن کے آگے، انس کے آگے، حیوانات کے آگے، نباتات کے آگے، جمادات کے آگے اور میں کیا دکھاؤں کہ جو دیکھا نہیں جاسکتا، اس کے آگے۔

یہی وہ عذاب ہے، جو آخرت سے پہلے ان کو دنیا میں چکھنا پڑا، چکھ رہے ہیں، برضاو رغبت چکھ رہے ہیں۔

مگر کیا انسانیت کی یہ توہین صرف پہلوں میں تھی، پرانوں نے خالق کے معبود ہونے سے انکار کیا، بیشک اس کے صلہ میں انہیں بندروں کو مسجود بنانا پڑا، لیکن جن لوگوں نے اپنے تئیں خدا کی مخلوق ہونے میں شک کیا تھا، آج بندر کے مولود ہونے کا اپنی زبانوں میں کیوں اقرار کررہے ہیں، جس نے بندر کو معبود بنایا، کیا شبہ ہے کہ اس نے انسانیت کو رسوا کیا، لیکن جس نے خدا کی مخلوق ہونے سے انکار کر کے بندر کے مولودِ مسعود ہونے پر فخر کیا، کتابیں لکھیں، دلائل قائم کیے، کررہے ہیں، کیا انسانیت کی خواری میں انہوں نے کوئی کمی کی ہے اور صحیح تو یہ ہے جو ہر چیز کی قیمت لگاتے ہوئے یکا یک چیخ اُٹھتے ہیں کہ نفسانیت کی کوئی قیمت نہیں ہے، سب انسان کیلئے ہیں، لیکن انسان کسی کیلئے نہیں، کسی مقصد کے لئے نہیں، کیا اس نے انسانیت کو ان عفونتوں اور غلاظتوں سے بدتر نہیں ٹھہرایا، جن سے انسانوں کے کتنے مقاصد وابستہ ہیں، جب اُنہوں نے کہا کہ انسان اپنے خدا اور خالق کیلئے نہیں ہے، تو کیا اس کے بعد یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ انسان کسی کیلئے بھی ہے، پانی کا کیا بگڑے گا اگر آدمی نہ ہوں؟ ہوا کیوں رک جائے گی، اگر آدمی نہ ہوں؟ آفتاب میں کیا داغ آجائے گا اگر آدمی نہ ہوں؟ حتیٰ کہ سڑک کے کسی سنگریزہ اور جنگل کے کسی تنکے کا کیا نقصان ہے، اگر کوئی نہ ہو، تمہارے بڑے نہ ہوں، چھوٹے نہ ہوں، کوئی نہ ہو، بے شک سب ان کیلئے ہیں، لیکن مخلوقات کے اس طویل وعریض سلسلہ میں انسان کسی کیلئے نہیں، اب اگر وہ خالق کیلئے ہی نہیں، تو اس سے زیادہ عبث و بے نتیجہ فضول ومہمل، بیہودہ ہستی اور کس کی ہوسکتی ہے؟ اس رسوائی سے بڑی رسوائی اس ہتک سے بڑی ہتک اور کیا ہوسکتی ہے؟

اور یہ ایمان کا حال ہے، عمل کے میدان میں ان جاہلوں کے پاس کیا تھا، جو آج کے عالموں کے پاس نہیں ہے۔

عرب کے جہل نے کیا پیدا کیا تھا، جو آج کے علم سے نہیں پیدا ہو رہا ہے، جاہل شراب پیتے تھے، مردار کھاتے تھے، زنا کرتے تھے، سود خوار تھے، جواری تھے، ایک کا خون دوسرا پیتا تھا، املاق وافلاس کے اندیشہ سے لڑکوں کو، لڑکیوں کو گور میں زندہ دفن کر دیتے تھے، لیکن یہ قصہ کن کا سنایا جا رہا ہے، کیا عرب کے جاہلوں کا، یا یورپ کے عالموں کا؟ وہاں کیا دکھاتے ہو، جسے یہاں ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، عرب سے باہر ایران میں ایک طرف "مزدک" "زر، زمین، زن کو سب سے چھین کر سب کو دے رہا تھا اور دوسری طرف "مانی" اور اسکے شاگرد ہاتھوں میں استرے لئے پھرتے تھے کہ جس راہ سے یہ برائیاں آئی ہیں، ان ہی کا قلع قمع کر دیا جائے، وہ انسانوں کو انسانوں میں آنے سے روکتے تھے، یہی ان کا فلسفہ تھا، لیکن یہ تو ایران میں ہو رہا تھا، آج تو یورپ کے ایک حصہ میں پھر وہی "مزوک" "زندہ ہو کر "بالشویک" کے نام سے کیا وہی سب کچھ نہیں کر رہا ہے، جو اس نے کیا تھا اور دوسری طرف "برتھ کنٹرول" کے نام سے اسی طرح انسانوں کو انسانوں کی سوسائٹی میں شریک ہونے سے روکا نہیں جا رہا ہے............؟

ایک راستوں کو ڈھاتا اور دوسرا بند کرتا ہے، اسکے سوا اور کیا فرق ہے؟ صحیح ہے کہ ہندوستان میں بدھ مت کے فلسفۂ نفس کشی نے بڑی گندی شکلیں اختیار کی تھیں، "دام مارگی" پیدا ہوئے تھے، "مانگ ودیا دام مارگی" تک پائے جاتے تھے، "اگھوری" ہونا آتما کی بڑی پاکی تھی، لیکن آج گندگیوں میں صفائی کے مدعی بن کر جولت پت ہیں، "اگھوریوں" کو بھی تے ہو، اگر ان کا حال سنایا جائے۔ بے پردگی وعریانی نے جنسی لذتوں کو جس حد تک بے جان کیا ہے، اس میں جان ڈالنے کیلئے آج مغرب کا "اگھوری" جو کچھ کر رہا ہے، واقعہ ہے کہ اس کے سامنے مشرق کا اگھوری بھی شرمندہ ہے، الحاصل جو کچھ اس وقت تھا، جہاں تک سوچو گے، کسی نہ کسی شکل میں تم اس وقت بھی اس کو پاؤ گے، پس آنے والا کیسے جاسکتا تھا، جب تک کہ وہ سب نہ جاتے، جس کیلئے وہ آیا تھا، بلکہ اسکی ضرورت تو اسک کے بعد بھی رہے گی کہ یہ تو تخریب ہے، لیکن کیا تعمیر بغیر معمار کے ممکن ہے؟ اور یہی میرا مقصد تھا، جب میں نے کہتے ہوئے سب سے پہلے کہا تھا کہ "یہی وہ آنے والا ہے، جو آنے ہی کیلئے آیا"۔ پھر جس طرح آج وہ ہم میں موجود ہے، اس کی ضرورت موجود ہے،

ان کو دیکھ کر اب بھی کوئی شک کر سکتا ہے کہ آنے کے بعد وہ نہیں گیا اور جب اس کی ضرورت ہے، نہیں جائے گا؟ تھا، ہے، رہے گا، ابد تک رہے گا اور اس کیلئے یہی مقدر ہے۔

فالّٰلهم صل وسلم وبارك علىٰ سيد نا محمد عبدك ورسولك النبى وعلىٰ اٰله وازواجه امهات المومنين وعلىٰ ذريته وعلىٰ المؤمنين والمؤمنات والمسلمين والمسلمات كما صليت و باركت علىٰ سيد نا ابراهيم وعلىٰ اٰل سيدنا ابراهيم فى العالمين انك حميد مجيد

پس اے اخوان عزیز!

﴿وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ هُوَ اجْتَبَاكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ مِّلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ مِن قَبْلُ وَفِي هَذَا لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيداً عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاء عَلَى النَّاسِ فَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَاعْتَصِمُوا بِاللَّهِ هُوَ مَوْلَاكُمْ فَنِعْمَ الْمَوْلَى وَنِعْمَ النَّصِيرُ﴾ (الحج:۷۸)

"کوشش کرو اللہ کی طرف بلانے میں کوشش کا پورا حق ادا کرتے ہوئے، اسی نے (اے امت اسلامیہ) تم کو چن لیا ہے اور تم پر دین میں کوئی تنگی نہیں فرمائی، یہ تمہارے باپ ابراہیم علیہ اسلام کا دین ہے، اسی نے تمہارا نام "مسلمین" رکھا، پہلے بھی اور اس میں بھی (کوشش کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا) کہ رسول تمہارے نگراں رہیں گے اور تم دنیا کے نگراں رہو گے، پھر لوگو! نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو، اور زور سے پکڑ لو اللہ کو، وہی تمہارا آقا ہے، پھر کتنا اچھا آقا ہے، کتنا اچھا مددگار"۔

جب جانے کیلئے آنے والے آتے رہے، اشخاص چنے جاتے تھے، لیکن جب وہ آیا، جو آنے ہی کیلئے آیا، تو اس کے طفیل میں اس کے ساتھ شخص نہیں، بلکہ ایک اُمت ہی چنی

گئی، پہلے شخص مبعوث ہوتے تھے، اب ایک اُمت ہی مبعوث ہے، یہ اس امت کا ''اصل منصب'' اور ''فرض حقیقی'' ہے، جب تک وہ اس منصب پر قائم رہیں گے اور انسانوں کی نگرانی کریں گے، اس وقت تک ان کے رسول ﷺ بھی اس امت کے نگراں رہیں گے، لیکن جب تم اپنے منصب سے ہٹے، اگر رسول کی نگرانی کو نہیں محسوس کرتے ہو، تو کیا یہی وعدہ نہیں تھا۔

یہ امت مجتبیٰ ومبعوثہ ہر قوم میں ہے، ہر ملک میں ہے، پس جو جہاں ہے، وہ وہیں مبعوث ہے، اس کی قوم اسی ملک کے باشندے ہیں، مصیبت کی گھڑی وہی تھی، جب اپنی قوم کو ہم نے اپنی قومیت سے نکالا، اسی کے ساتھ ان کا درد بھی دل سے نکلا، حالانکہ اگر حضرت نوح علیہ السلام کے منکران کی قوم تھی، حضرت ہود علیہ السلام کے کافر، ان کی قوم تھی، قریش رسول خاتم صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم کے لوگ تھے، تو کس نے کہا کہ ہندوستان کے ہندو ہندوستان کے مسلمانوں کی قوم نہیں، مصریوں کی قوم مصر کے قبط نہیں، یورپ کے عیسائی یورپ میں رہنے والے ترکوں کی قوم نہیں ہیں، پس جب تک:

﴿وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ﴾

(البقرة:۱۹۳)

نہ ہو، تھک کر بیٹھنے کے کیا معنے ہو سکتے ہیں؟ وثیقہ ہے کہ:

﴿هُوَ الَّذِىْ أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّه﴾ (الصف:۹)

''اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا، تاکہ سارے دین پر وہ غالب ہو''۔

اور دیکھو کہ لامذہبیت پر مذہبیت غالب ہے، چند پیشہ ور کتاب سازوں، یا سبق فروش معلموں کو جانے دو، جو وساوس باقی کی روٹی کھاتے ہیں، عام فطرت انسانی پر مذہب کی گرفت اسی طرح سخت ہے، جس طرح ہمیشہ سے تھی۔ آخر اگر مذہبیت کا اسی قدر زور ہو گیا ہے، تو جس یورپ کے متعلق یہ سنایا جاتا ہے، کیوں نہیں وہاں کے باشندوں نے لامذہب ہونے کا اعلان کیا ہے.......؟

سچ یہ ہے کہ انسانی دماغ کی جو ذہنی ساخت ہے، اس میں اتنی تنگی، یا پستی کس طرح

پیدا ہوسکتی ہے کہ ماضی و مستقبل کے انجام کے فیصلہ کے بغیر وہ اپنی زندگی گزارے، کہاں سے آیا ہوں، کہاں جا رہا ہوں؟ کیوں آیا ہوں؟ چلنے والے کے سامنے ان سوالات کے جواب نہیں ہیں، کیا وہ ایک قدم بھی آگے بڑھ سکتا ہے...؟

بہر حال کم از کم اس وقت تک تو دنیا میں لا مذہبوں سے زیادہ، بہت زیادہ، بہت ہی زیادہ تعداد مذہبی لوگوں کی ہے، اور مذاہب میں ہر حیثیت سے جو وزن اسلام کو حاصل ہے، کسی کو نہیں ہے۔ پس اس کا منطقی نتیجہ کیا یہی نہیں ہوا کہ لا مذہبیت پر مذہب غالب اور تمام مذاہب پر اسلام غالب، اس لئے سب پر اسلام غالب ہے۔

جب مسلمان اپنی نگرانی دوسروں کے سپرد کر کے رسول علیہ السلام کی نگرانی سے اس وقت محروم ہیں، اس زمانہ میں بھی اسلام کے غلبہ کا یہ حال ہے، تو کیا حال ہوگا جب دنیا کے نگران بن کر پھر رسول کی نگرانی کی سعادت مسلمان حاصل کر لیں گے، کچھ نہیں، کوئی کام نہیں، جب تک اصل کام نہ ہوگا، کسی کام میں کوئی برکت نہ ہوگی، بہت آرام لے چکے، تھکن مٹ چکی، کام بہت باقی ہے، ہوتا کہ چونکنے والے چونکتے، اور ''درا'' کی اس ''بانگ'' پر چل پڑتے:

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کردے
دہر میں اسمِ محمد (ا) سے اجالا کر دے
وقتِ فرصت ہے کہاں، کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

(اقبالؒ)

(نقوش رسول نمبر ا)

توحید القرآن

آج کی اشاعت میں ''توحید القرآن'' کا دوسرا نمبر شائع کیا جاتا ہے۔ تفصیل وتوضیح، تمہید مقدمات، تقریبات مطالب میں بات بہت زیادہ پھیل گئی۔ بہتر ہوگا کہ ناظرین اس کو مختصر لفظوں میں اجمالی طور سے یہیں سمجھ لیں، تاکہ آئندہ پھر استفادہ میں آسانی ہوگی۔

سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ ''اثباتِ واجب''یعنی: خدا کا وجود اور چیز ہے اور اسکی توحید امر دیگر ہے، مثلاً: جو شخص ''کروردن'' کو واجب الوجود (العیاذ باللہ) مانتا ہے، تو وہ واجب، یعنی: عالم کی علت اور سبب (جو خود بخود موجود ہو) اس کا منکر نہیں ہے، بلکہ اس کی یکتائی کا منکر ہے، اسلئے توحید پر بحث کرتے ہوئے مان لینا چاہئے کہ عالمکے لیے کسی واجب ذات کی تو ضرورت یقینی ہے، لیکن اب سوال ہوتا ہے وہ ایک ہے، یا چند۔ بہر کیف اب سمجھنا چاہئے کہ قرآن اثباتِ توحید کے متعلق مندرجہ ذیل طریقے اختیار کرتا ہے۔

(۱) مشرک، یعنی: چند خداؤں کا قائل مدعی ہے اور موحّد شریک کا منکر ہے، اسلئے بارِ ثبوت مشرک کے سر ہے، موحّد کے لیے صرف انکار کافی ہے، جیسا کہ فرمایا:

﴿أَئِنَّكُمْ لَتَشْهَدُونَ أَنَّ مَعَ اللّٰهِ آلِهَةً أُخْرَى قُل لَّا أَشْهَدُ﴾
(الأنعام: ۱۹)

''کیا (اے مشرکین) تم گواہی دے سکتے ہو کہ خدا کے ساتھ کوئی اور بھی معبود ہے۔ (اے محمد) فرمادے کہ میں نہیں گواہی دیتا (اگر تمہارے پاس دلیل ہے، تو لاؤ)''۔

اور مختلف طور پر سمجھا دیا گیا کہ دنیا کی کوئی قوت دوسرے خدا کے وجود پر دلیل نہیں لاسکتی، جس کی تشریح گذشتہ نمبر میں بخوبی کی گئی ہے۔

(۲) اس کے بعد فرماتا ہے کہ عالم کے موجد وخالق میں ذو احتمال پیدا ہو سکتے ہیں۔

۱: تمام عالم کی علت صرف ایک ذات ہو۔

۲: یا اسکے ہر ہر جزء کے لئے الگ الگ علتیں ہوں۔

ان شقوں میں سے دوسری شق اس وقت تک متعین نہیں ہو سکتی، جب تک یہ ثابت نہ کرلیا جائے کہ ایک خدا عالم کے ایجاد وخلق، حفاظت ونگرانی کے لیے کافی نہیں ہے، کیونکہ اگر ایک ہی کافی ہے، تو دوسرے کی کیا ضرورت...! جیسا کہ آیت:

﴿أَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهُ﴾ (الزمر: ۳۶)

۱:......میں نے اس پہلو کی طرف دونوں نمبروں میں اشارہ کیا ہے البتہ آیت نہیں لکھ سکا تھا انشاء اللہ اس کی تفسیر آئندہ کی جائے گی ۲

''کیا خدا اپنے بندے کے لیے کافی نہیں''

جب اس میں بھی مشرکین کو ناکام وخاسر ثابت کر چکا، تو اب تیسرے پہلو کی طرف اشارہ کرتا ہے، جس کی تفصیل آج کے نمبر میں درج ہے۔ محصّل اس کا صرف اسقدر ہے کہ توحید کی حقیقت سمجھ لینے کے بعد انسان کی فطرت اس کے ماننے پر مجبور ہو جاتی ہے اور یہ بالکل نیا دعویٰ ہے۔

اخیر میں قرآن نے پھر مسئلہ کو بالکل صاف کر دیا ہے اور دعویٰ کیا ہے کہ دوسرے خدا کا وجود باطل اور عقلاً بالکل محال ہے۔ انشاء اللہ آئندہ اشاعت میں بشرطِ زندگی وتوفیق اس پر بھی بحث کی جائے گی۔

اسی طرح تناسخ کے متعلق آج جو کچھ لکھا گیا، یا پہلے لکھا جا چکا ہے، ضرورت ہے کہ ہمارے ناظرین اس پر غور وتوجہ کے ساتھ نظر ڈالیں کہ جن تحقیقات جدیدہ پر یہ تحریر مبنی ہے کرۂ ارض پر شاید اس سے پہلے کبھی نہیں سنی گئی۔ **واللہ اعلم وفوق کل ذی علم علیم**

شاذ ونادر کبھی کبھی ہم سے شکایت کی جاتی ہے کہ اس قسم کے مضامین سے مسلمانوں کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے، اس لئے بہتر ہے کہ میں اپنی مطمحِ نظر باتوں کو ظاہر کر دوں، تا کہ اربابِ علم ومطالعہ اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے ''القاسم'' کے مطالعہ میں مصروف ہوں۔

(۱) مسلمانوں کے دل ودماغ میں ایسے معلومات اتارنا چاہتا ہوں کہ وہ دنیا کے ہر ایک مذہبی مجالس وعلمی مذاکروں میں نہایت جرأت کے ساتھ اپنی صداقت کا اعلان کر سکیں۔

(۲) ہندوستان مختلف فرق ومذاہب کا گہوارہ ہے، عموماً مسلمانوں کو اپنی وطنی اور دنیاوی تعلقات کی وجہ سے ان کے ساتھ رہنا پڑھتا ہے، دیکھا گیا ہے کہ باتوں باتوں میں دوسرے مذاہب کا آدمی کسی مسلمان کو کبھی اسلام سے باہر نکال دیتا ہے، ورنہ کم از کم ایمان میں ضعف پیدا کر دیتا ہے۔ ''القاسم'' کے مضامین انشاء اللہ تعالیٰ اس کا بخوبی انسداد کر سکتے ہیں۔

(۳) تدریجاً مسلمانوں کی دماغی قوتوں کو ان مضامین سے ترقی دینی منظور ہے۔ ضرورت ہے کہ لوگ اسکے عادی ہوں، جو مضمون ایک دفعہ کے پڑھنے سے نہیں سمجھ میں آیا، پھر پڑھیئے اور پھر پڑھیئے، انشاء اللہ انشراح صدر ہو جائے گا اور اس کے بعد ایسے

مضامین پیدا کرنے کی آپ میں خود صلاحیت پیدا ہو جائی گی۔

ہم سے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آسان مضامین بھی ساتھ ساتھ کیوں نہیں شائع کیے جاتے، جواباً عرض ہے کہ عموماً ہم اس کا خیال کرتے ہیں، لیکن اس کے لئے زیادہ حصہ نہیں دے سکتے کہ ۳۲ صفحات کی مختصر ضخامت میں مختلف قومیتوں کے مضامین کثرت سے نہیں سما سکتے ہیں۔ اگر ایسا کیا جائیگا، تو اصل مقاصد کی بربادی کا اندیشہ ہے۔

ہمیں تجارت مقصود نہیں کہ خواہ مخواہ روپے کھسیٹنے کے لیے فسانے، ناولوں، عائشقانہ، غزلوں سے "القاسم" کو بھر دیں۔ ہاں! یہ صورت ممکن ہے کہ رسالہ کی ضخامت بڑھا دی جائے، لیکن ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں قیمت بھی بڑھ جائے گی، اس لئے میرا خیال ہے کہ جن حضرات کو علمی مذاق کے علاوہ عامیانہ مضامین سے بھی دلچسپی ہو، وہ اسی قیمت میں "القاسم" کے ساتھ کوئی اور معتدل رسالہ بھی منگوایا کریں، جس کی ملک میں کمی نہیں۔ "القاسم" کے مضامین سے بھی اکتا جائے، تو بطورِ ضمیمہ کے اسی کو پڑھ لیا کریں۔ آخر یہ بھی کیا کاہلی ہے کہ ایک کتاب اُٹھالی، تو اب دوسری نہیں اُٹھا سکتے، یہ تو ایسا ہوا کہ صاحب گوشت، دال، چٹنی، سب ہی کے شائق تھے، لیکن دسترخوان پر مختلف پیالوں کی طرف ہاتھ بڑھانے میں انہیں تکلیف ہوتی تھی، اسلئے سب کو ایک ہی میں ملا دیا، جس سے سب کا مزا برباد ہو گیا۔ علم کی کسمپرسی کا کیسا دردناک سانحہ ہے کہ ۳۰ دن کی دراز مدت میں ہندوستان کے ۸ کروڑ مسلمانوں میں ۳۲ علمی صفحوں کا پڑھنے ولا بھی نہیں ملتا۔

فيا لضيعة العلوم والمعارف

پس افسوس وحسرت علم ومعارف کی بربادی پر

حالانکہ اگر غور سے دیکھا جائے، تو ابھی تک حقیقی معنوں میں کوئی خالص اور رقیق علمی مضمون شائع بھی نہیں ہوا اور اسی قدر نہیں، بلکہ مجھے مسلمانوں کی اس لاپروائی پر رونا آ گیا کہ باوجودیکہ عربی زبان ان کی مذہبی زبان ہے، ان کا قرآن ان کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ سلم کی حدیثیں، ان کی فقہ، الغرض انکے تمام تر علمی سرمائے اسی پاک زبان میں محفوظ ہیں، لیکن پھر بھی مجھ سے شکایت ہے کہ تم ایسے الفاظ عربی کے استعمال کرتے ہو، جو اکثروں کی سمجھ میں نہیں آتے، اس کے جواب میں بجز اس کے اور کیا کہوں کہ ع

ابوالقاسم محمد زندہ بودے (صلی اللہ علیہ وسلم)

کثرتِ کار اور تنگی وقت کا شکوہ فضول ہے۔آہ! تم میں کتنے ہیں، جو دن بھر میں چار پانچ گھنٹے محض گانوں اور اخباری تذکرات، واہیات، مذاق وہنسی میں صرف نہیں کرتے......؟

﴿بَلِ الْإِنسَانُ عَلَى نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ وَلَوْ أَلْقَى مَعَاذِيرَهُ﴾

(القيامة:١٣، ١٤)

''بلکہ انسان اپنے نفس (کے واقعات) سے خبردار ہے، اگرچہ معذرتوں کا (پردہ) ڈالتا رہے''۔

پھر کیا عربی کا سیکھنا اس سے بھی بدتر ہے.........؟!

﴿فَمَا لِهَـٰؤُلَاءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُونَ يَفْقَهُونَ حَدِيثًا﴾

(النساء:٧٨)

''اس قوم کو کیا ہو گیا ہے کہ بات سمجھنے کے گرد بھی نہیں پھٹکتی''۔

کسی گذشتہ اشاعت میں قرآنی براہین وحج کے متعلق جس عمومیت وکمال احاطہ وافادہ کا دعویٰ کیا گیا ہے، اس سے صرف اس قدر مقصود ہے کہ علماء قرآن کی دلیلوں میں اس طرز سے بھی غور فرمائیں۔فقیر نے ایک نظیر ''القاسم'' کی گذشتہ اشاعت میں اثبات واجب کے متعلق پیش کی تھی، گرچہ اس کے دلائل قرآن میں بکثرت ہیں اور اس اعتبار سے ان پر پوری روشنی پڑتی ہے، تاہم بنظرِ افادہ ''اثباتِ واجب'' کے بعد آج ''توحید'' کی ایک دلیل درج کی جاتی ہے۔آئندہ اگر فرصت ہوئی، تو رفتہ رفتہ سب پیش کئے جائیں گے۔ وباللہ التوفیق۔

ہومر[1] کی مشرکانہ کتبوں، دیوی اور دیوتا کی تعظیم واحترام سے لبریز بھجنوں نے جب یونان کے عام مجالس ومحافل میں رواج پایا، تو کہا جاتا ہے کہ شرک وگمراہی کی ایک لہر اٹھی، جس نے یونانیوں کے قدیم مذہبی عقیدوں کی بنیادوں کو متزلزل کر دیا۔

---

[1]...... عربی میں اسکو اومیروس کہتے ہیں سمرنا (ازمیر) میں پیدا ہوا اور وہیں مدرس ہوا، شاعری اسی مقام سے شروع کی، جوانی میں اندھا ہو گیا تھا، اس کی وہ نظمیں ''ایلیاذہ اوذیسی'' مشہور ہیں۔

موحدین کی جماعت میں برہمی پھیل گئی تھی، عام طور پتھروں اور فرضی معبودوں کے آگے پیشانیاں جھکنے لگیں، برفانی چوٹیوں کے گانے والے، ناچنے والے دیوتاؤں کی محبت میں یونانی اس درجہ مبہوت وارفتہ ہوئے کہ کسی کی کچھ سننا نہیں چاہتے تھے، اندھے ہومر نے خدا جانے کیا افسوں پڑھا تھا، جس سے دنیا کی آنکھیں اندھی، کان بہرے، دل ٹھٹھرے ہو گئے تھے۔

اس وقت وہاں کے ایک پر مغز اور منطقی حکیم اکسنیو فان نے ''توحید'' پر عقلی دلائل قائم کرنے کی ضرورت محسوس کی۔

چونکہ ضرورت شدید تھی، اسلئے عام خیال ہے کہ اس نے اپنے قومی عقلیہ پر بہت زیادہ زور ڈالا اور مختلف پہلوؤں سے اس مسئلہ کو مدلل کیا ہے۔ اکسنیو فان کی بہترین دلیل جو آج کل کتابوں میں نقل کی جاتی ہے، اس کا خلاصہ صرف اس قدر ہے:

''خدا جب ہر چیز پر قادر ہے، تو وہ ایک ہی ہو سکتا ہے، کیونکہ اگر چند ہوا، تو ہر چیز پر قادر نہیں رہ سکتا اور جو ہر چیز پر قادر نہیں، وہ خدا نہیں''۔

اس مجمل و مبہم دلیل کی غایت سے غایت اگر شرح کی جاسکتی ہے، تو میرے خیال میں اس سے زیادہ ممکن نہیں، جس کی توضیح کو ذیل کے مقدمات کے بعد پڑھنا چاہیے۔

۱)...... وجود کی دو قسمیں ہیں: (۱) خود بخود ہو، غیر کا محتاج نہ ہو، جیسے: وجود واجب۔ (۲) غیر کا محتاج ہو، جیسے: وجودِ ممکنات۔

۲)...... وجود اور ذات کوئی دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں، بلکہ وہ عین ذات ہے، مثلاً: زید کا وجود (ہستی) اس کی ذات، یعنی: گوشت پوست دل و دماغ، ادراک وقوی، روح وغیرہ سے کوئی الگ چیز نہیں، بلکہ زید خود آپ اپنا وجود ہے، یا مثلاً: پتھر کا وجود پتھر کی حقیقت سے کوئی علیحدہ چیز نہیں۔

۳)...... ذات کا پیدا کرنا یقیناً صفات کے پیدا کرنے سے مشکل اور صعب ہے، آدمی موم کو لمبا چوڑا گول کر سکتا ہے، لیکن خود موم کی ذات کو پیدا کرنا مشکل ہے۔

۴)...... جو وجود کے خود بخود ہو، لامحالہ وجود محتاج سے اعلیٰ واکمل ہے۔

۵)...... قدرت ایک صفت ہے اور اسکے بھی دو درجے ہیں: (۱) ایک تو سب پر شامل اور

سب پر محیط ہو۔ (۲) دوسرے یہ کہ بعض چیزوں پر تو اسے تسلط ہو اور بعض چیزوں پر نہ ہو۔

۶)...... اور یہ بھی ظاہر ہے کہ قدرت کی پہلی قسم ،یعنی: محیط ، لامحالہ دوسری قسم سے اکمل ہے۔

ان مقدمات کی تمہید کے بعد کہا جائے گا کہ خداوند تعالیٰ ،یا ''واجب الوجود'' جب ذات کے اعلیٰ فرد (یعنی: خود بخود موجود ہونے والی ذات) کے ساتھ موصوف ہے ،تو کوئی وجہ نہیں کہ قدرت جو ذات نہیں ، بلکہ صفت ہے ،اس کے درجہ کاملہ کے ساتھ وہ موصوف نہ ہو، کیونکہ بتایا جا چکا ہے کہ ذات کا معاملہ صفات سے بہت زیادہ مشکل ہے ،پس جس شخص نے خدا کو ذات کے اعلیٰ فرد کے ساتھ متصف کیا ، وہ صفات کے اعلیٰ مرتبہ کو تو اس کے لئے بدرجہ اولیٰ ثابت کریگا۔

پس معلوم ہوا کہ جو واجب الوجود (یعنی: جو غنی وجود) ہے، وہ بلا شبہ ہر چیز پر علاوہ اپنی ذات کے قادر ہوگا کہ قدرت کا اعلیٰ مرتبہ یہی ہے۔

اس کے بعد اب اکسنیو فان کے دعوی کی حقیقت بہت زیادہ روشن ہو جاتی ہے کہ اگر دو واجب الوجود ہوں گے ،تو آیا انہیں سے ایک خدا دوسرے کو معدوم کرسکتا ہے ، یا نہیں؟ اگر نہیں کرسکتا ،تو اس کی قدرت اعلی قدرت نہ ہوئی کہ اعلی قدرت ہی ہے ، جو اپنی ذات کے علاوہ اور ہر ایک شے پر قادر ہو اور اگر معدوم کرسکتا ہے ،تو پھر دوسرا خدا نہیں رہتا کہ خدا معدوم نہیں ہو سکتا ، خدا تو اعلی قدرتوں کا مظہر ہے اور جب اسم میں اتنی بھی قدرت نہیں کہ کسی غیر کے تصرّف کو روک لے ،تو وہ خدا کس طرح ہو سکتا ہے..........؟!

تھوڑی دیر کے لیے ہم مان لیتے ہیں کہ اکسنیو فان کی دلیل تام ہے اور ''اثباتِ توحید'' میں اس کی حجت قاطع ہے ، لیکن پھر بھی تم میں کتنے ہیں ، جو وجود اور ماہیت (ذات) کی حقیقت کو سمجھے ہوئے ہیں ، یا صفات وذات کی باہمی تفاوت کو سمجھ سکتے ہیں ، ان کے مدارج کی تعین کا صحیح اندازہ کر سکتے ہیں جس پر اسکی دلیل مبنی ہے۔

بلاشبہ فلسفہ اشراق کے مطالعہ کرنے والوں کے نزدیک وجودِ عینِ ماہیت ہی ایک بدیہی مسئلہ ہے ، لیکن آج اس کے مطالعہ کرنے والوں کی تعدا کتنی ہے اور آج کیا دنیا جب سے قائم ہے ، انسانوں کے ایک ''شرذمہ قلیلہ'' (چھوٹی جماعت) کے علاوہ ان مزخرفات

کی طرف متوجہ ہونے کی کس کو فرصت ملی۔

یا مثلاً: ارسطا طالیس کا قول نقل کیا جاتا ہے کہ وہ توحید کے متعلق کہا کرتا تھا:

''ہو نہیں سکتا کہ مفہوم واجب کا دو ذاتوں پر مجہول ہو سکے، کیونکہ مفہوم واجب یا دونوں کے لیے ذاتی ہوگا، یا دونوں کے لیے عرضی، یا ایک کے لیے ذاتی اور دوسرے کے لیے عرضی۔ اگر دونوں کے لیے ذاتی ہے، تو مفہوم وجوب مشترک ہوا، ضرورت ہے کہ ان دونوں کو آپس میں ممتاز کرنے والی چیز اور ہو کہ بغیر امتیاز کے دو دو ہو کر موجود نہیں ہو سکتے، پس وہ خصوصیۃ جو ایک کو دوسرے سے ممتاز کرتی ہے، ناممکن ہے کہ مفہوم واجب کی عین یا جزء ہو کہ اشتراکِ عین وکل دوسرے عین و جزء کے اشتراک کو مستلزم ہے، پھر خصوصیت خصوصیت نہیں رہتی، بلکہ وہ لامحالہ مفہومِ وجوب پر زائد ہوگی اور اس کے ساتھ مل کر حقیقۃً واجبہ کو ممتاز کریگی، پس یہ خصوصیۃ اگر دونوں واجبوں میں ہے، تو دونوں محتاج ہوئے کہ کل جزو کی طرف محتاج ہوتا ہے، گویا واجب اپنے موجود ممتاز ہونے میں اس خصوصیت کا رہن منت ہوگا، حالانکہ وہ غنی ہے اور اگر صرف ایک میں ہے، تو جب ہی اسکے اندر دو جزء ہوئے:

(۱) وجوب شرک۔

(۲) خصوصیت، اور یہ بھی وہی احتیاج ہے۔

اسی طرح اگر مفہوم وجوب کا عارض ہوا، تو عارض اپنے عروض میں غیر کا محتاج ہوتا ہے، تو پھر لازم آتا ہے کہ واجب اپنے واجب ہونے میں غیر کا محتاج ہو جائے، جو احتیاج وجود کو مستلزم ہے، حالانکہ واجب اسی ذات کو کہہ سکتے ہیں، جو کسی چیز میں دوسرے کا محتاج نہ ہو، چہ جائیکہ وجوبِ وجود میں محتاج ہو۔

تمہارے سامنے کیا کہا گیا تم نے کچھ بھی سمجھا اور تمہاری کیا حقیقت ہے وہ جو اس وقت تحصیل فلسفہ میں اپنے سر کھپا رہے ہیں، سالہا سال اسکے اندر اپنی عمر برباد کر چکے ہیں، اس دلیل کو نہیں سمجھ سکتے، جب کہ ذیل کے مقدمات منقح نہ کر لیں۔

(۱) امرِ مشترک بلا امتیاز کے متحقق نہیں ہو سکتا۔

(۲) عین، یا جزء کا اشتراک کل اور عین آخر کے اشتراک کو مستلزم ہے۔

(۳) عروض عارض بغیر کسی علت ناممکن ہے کہ نفس ذات انکے لئے منشاء انتزاع نہیں ہوتی۔

(۴) خصوصیہ مخصصہ امر سلبی نہیں ہوسکتی کہ دو بسیط، مثلاً: ایک "آ" ہے اور دوسرا "ب" ہے۔ یوں بھی ممتاز ہوسکتے ہیں کہ آ، ب نہیں ہے اور ب، آ نہیں ہے اور اگر امر سلبی مخصص ہوجائینگے، تو وہ مستلزم ترکیب واحتیاج نہیں ہیں۔[1] وغیرہ وغیرہ۔

اور جس طرح یہ خاصی دلائل کے نزدیک ہرزہ سرائی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے، بجنسہ یہی حال عامیانہ دلیلوں کا فیلسوفوں کے نزدیک ہے۔

مثلاً: ایک عام بات بیان کی جاتی ہے کہ دوسرے خدا کو مان کر اس کے ابطال کی کوشش کیجاتی ہے، اسے محال ٹھرایا جاتا ہے، لیکن قرآن مجید نے استدلال کا پہلو بدل دیا، وہ مشرکین سے پوچھتا ہے کہ تم چند خداؤں، چند معبودوں، چند دیوتاؤں کی تصدیق کرتے ہو، بتاؤ کہ تمہارے پاس ان کے وجود کی کیا دلیل ہے؟ کیا تم گواہی دے سکتے ہو کہ معبود واحد کے ساتھ اور بھی کوئی اللہ ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ صرف یہی ایسا سوال ہے جس سے شرک کی دیوار فوراً منہدم ہوجاتی ہے، آخر اس سوال کا جواب کیا ہوسکتا ہے، کیونکہ ظاہر ہے کہ کسی چیز کے اوپر کوئی گواہی تو اسی وقت دے سکتا ہے کہ اس نے اس چیز کو کان سے سنا ہو، یا آنکھ سے دیکھا ہو، یا ہاتھ سے چھوا ہو، ناک سے سونگھا ہو، یا عقل[2] سے پہچانا ہو۔

دنیا میں کون ہے جو کسی دوسرے خدا کے متعلق اس قسم کا دعوی کرسکتا ہے، کیونکہ حواس سے تو ایک ہی خدا معلوم نہیں ہوتا، چند کہاں تک معلوم ہوسکتے ہیں، ایک کو بھی ہم عقل کے ذریعے سے جانتے ہیں[3] مگر اس دوسرے خدا کو کس نے دیکھا، کس نے چھوا، کس نے سنا،

---

[1]:...... شارح کلام ارسطو نے کہا کہ سلب غیر ترکیب اضافی ہے اور ترکیب اضافی میں ایسے مواقع پر مضاف بعد مضاف الیہ کے ہوتا ہے، پس لامحالہ غیر کے بعد ہوگا اور اس میں واجب ممکن ہوجائے گا کہ واجب کا ہونا امر سلبی پر موقوف ہے اور سلب غیر پر موقوف، پس واجب غیر کی طرف محتاج ہوگیا ۱۲۔

[2]:...... تواتر پر یقین کرنے کی وجہ بھی عقل ہی ہے اور اسی طرح انبار کی خبروں کی تصدیق عقل کی وجہ سے کی جاتی ہے کہ عقل کے نزدیک ان کی صداقت ہو چکی ہوتی ہے۔ ۱۲

[3]:...... اس کی تفصیل القاسم "دامغات" نمبر ۳ میں پڑھنی چاہیے۔ ۱۲

یا کم از کم عقل اس کی ضرورت کس لئے تسلیم کرتے ہیں؟ وجودِ ممکنات کے اندر جو کچھ دقتیں ہیں، خوامخواہ میں، یا بقاء میں وہ ایک خدا کے مان لینے کے بعد حل ہو جاتی ہے، پھر اس دوسرے کی کیا ضرورت ہے؟ اور جب عقل وحواس کوئی اس کی شہادت نہیں دیتے، تو ہم کس طرح گواہی دے سکتے ہیں اور جو شہادت پر آمادہ ہو، وہ دلیل لائے۔ عزیز حکیم نے ہمیشہ اپنے نیک بندوں کے دلوں میں اسی حجت کو ڈالا ہے۔ اصحاب کہف نے اپنی قوم مشرک کے مقابلے میں یہی کہا:

﴿هَـٰؤُلَاءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوا مِن دُونِهِ آلِهَةً لَّوْلَا يَأْتُونَ عَلَيْهِم بِسُلْطَانٍ بَيِّنٍ﴾ (الکهف: ۱۵)

"میری اس قوم نے خدا کے علاوہ معبود اختیار کئے ہیں، کیوں نہیں دوسرے معبود پر کوئی بیّن دلیل پیش کرتے ہیں" (حتیٰ کہ فیصلہ ہو جائے)۔

اور یہ تو اس کی قطعیت تھی، لیکن مجھے تو دراصل اس کی عمومیت دکھانا ہے۔ امت مرحومہ کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں کہ کاش وہ سمجھے اس کو، جس کے نہ سمجھنے والا کبھی سمجھدار نہیں ہو سکتا۔

فرض کرو کہ تم دور ایک گاؤں میں جو کسی ایک زمیندار کا ہے "اشاعتِ توحید" کے لیے پہنچتے ہو، ایک لنگوٹ بند گنوار مشرک تمہارے سامنے سے گزرتا ہے، اس کو بلاؤ اور کہو کہ اس گاؤں کے دوسرے زمیندار نے مجھے مال گذاری وصول کرنے کے لیے یہاں بھیجا ہے، لوگوں کو خبر کر دو۔ گنوار کہے گا کہ دوسرا زمیندار کون ہے؟ ہم تو اس کو نہیں جانتے، تم اس سے پوچھو کہ کیوں نہیں جانتے؟ کہے گا کہ میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا، کبھی نہیں سنا۔ اس کے علاوہ نوکر و ملازم جس قدر بھی آئے، وہ صرف ایک ہی زمیندار کا نام لیا کرتے تھے، ان باتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے گاؤں کا ایک ہی مالک ہے۔

پس اس سے پوچھو کہ اے نیک مرد! اسی طرح دوسرے خدا کو تیری آنکھ نے کب دیکھا، تیرے کان نے کب سنا، تیری عقل نے کب سمجھا، آخر کس دلیل سے دوسرے معبود کو مانتا ہے...؟ اے قابل رحم شخص! جس کے وجود پر تیرے پاس کوئی دلیل نہیں، اس کے ماننے کی کیا ضرورت ہے، انکے آگے کس لئے جھکتا ہے، کیوں اس کی پوجا کے لئے تکلیف اُٹھاتا

ہے اور روپے برباد کرتا ہے؟ یوں ہی تجربہ کر کے دیکھ لو، اور آزماؤ کہ اس کا اثر کیا ہوتا ہے، جاؤ! اور گنواروں کو خدا کے راستے کی طرف بلاؤ کہ ان کی تعداد بہت ہے۔

اسی طرح فرض کرو کہ تم کسی شہر، یا قصبے میں پہنچتے ہو، سامنے سے ایک مشرک تاجر گذرتا ہے تم اسے خبر دو کہ فلاں گاؤں میں گیہوں بہت سستے بک رہے ہیں۔ سیٹھ جی! اگر آج تم نے گاڑی وہاں بھیج دی، تو دو گنے کا فائدہ وہاں رہی گا۔ وہ تم سے پوچھے گا کہ تم کو یہ کیسے معلوم ہوا؟ جواب میں کہو کہ سیٹھ جی! میں نے نہ آنکھ سے اس گاؤں کو دیکھا، نہ میں نے اس خبر کو کسی سے سنا، نہ اور کسی ذریعے سے مجھے علم ہوا حتی کہ عقل سے بھی نہیں، مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ وہاں اس سال سیرابی ٹھیک طور پر ہوئی تھی، یا نہیں؟ پس یوں ہی کہتا ہوں۔ اندازہ کر سکتے ہو کہ وہ سیٹھ جو اپنے ایک منٹ کی قدر کرتا ہے، تمہاری اس احمقانہ گفتگو سے کیا طیش میں نہیں آئے گا؟ وہ تم کو گالیاں دیتا ہوا، بڑبڑاتا ہوں، اپنی دکان کی طرف چلتا بنے گا، مگر نہیں، تم اس کے ساتھ رہو، ذرا لپک کر ہاتھ تھام لو اور پوچھو کہ سیٹھ جی! آپ مجھ پر صرف اس لئے خفا ہوئے کہ میں نے ایک چیز کی شہادت دی، جس کو نہ دیکھا تھا، نہ سنا تھا، نہ عقل سے سمجھا تھا، مگر بتائیں تو سہی کہ ایشور کے ساتھ آپ جن دیوی اور دیوتاؤں کو شریک کرتے ہیں اور ان پر شہادت دیتے ہیں، اس کو اپنی آنکھ سے دیکھا، کان سے سنا، یا عقل سے اسکی ضرورت ثابت ہوئی؟ کھلانے پلانے، روزی دینے، بال بچے دینےکے لیے کیا ایک ایشور کافی نہیں؟ بتاؤ سیٹھ جی! اب میں تم پر کس درجہ غصہ کروں کہ بغیر کسی علم کے دیوی اور دیوتاؤں کی خبر دیتے ہو۔

ذرا یہ کر کے دیکھو! خود معلوم ہوگا کہ کیا ہوتا ہے۔ **فهل من مدكر**

بہر کیف عوام کے سیکڑوں طبقات ہیں، میں کہاں تک مثالیں دوں، مقصود اس قدر ہے کہ بغیر جانے ہوئے گواہی دینی عام فطرت انسانی کے خلاف ہے اور شرک ٹھیک اس جھوٹی شہادت کا مظہر ہے، البتہ ایران کا "فلسفہ" تھوڑی دیر کے لیے مقابلہ پر آمادہ ہو سکتا ہے اور آتشکدہ کا کوئی "موبد" کہہ سکتا ہے کہ دوسرا خدا، یعنی: ہرمن کے وجود پر بھی عقلی شہادت موجود ہے، اگر چہ حسی نہیں، کیونکہ "دنیا میں دو طرح کی چیزیں ہیں، برائی اور بھلائی دونوں کا خالق ایک نہیں ہو سکتا، پس معلوم ہوا کہ خدا دو ہے"۔

اس کا جواب خود قرآن مجید نے دیا ہے، میں اسی کو ذکر کر کے اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔ قرآن مجید نے دعوی کیا کہ

﴿تَبٰرَكَ الَّذِیْ بِیَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ﴾

(الملک: ۱)

''برکت والی وہ ذات ہے، جس کے ہاتھ ملک ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے''۔

خدا کی تمحید ہے کہ وہ ہر چیز پر قادر ہے، شبہ ہوا کہ ہر چیز میں تو بری چیزیں، مثلاً: موت، بیماری بھی داخل ہیں، یا نہیں؟ اگر نہیں ہیں، تو خداوند تعالی کی قدرت کامل نہیں، مثلاً: فرض کرو کہ ایک شعبدہ گر تمہارے سامنے خلق کا دعوی کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں ہر چیز بنا سکتا ہوں اور یہ کہہ کر اس نے ایک چٹکی خاک کی لی اور چھو کر کے ایک خوبصورت کبوتر اپنے جھولے سے نکال دیتا ہے، پھر خرگوش، پھر گلاب کے پھول وغیرہ پیدا کرتا ہے، تم اس سے کہتے ہو کہ کیا تم سانپ بھی بنا سکتے ہو، بچھو بھی پیدا کر سکتے ہو، وہ اس کا جواب اگر نفی میں دے گا، تو کیا اس کا شعبدہ بہ نسبت دوسرے شعبدہ گر کے جو گلاب کے پھول کے ساتھ سانپ کے پھن بھی دکھاتا ہے، ناقص نہیں؟ بلا تشبیہ اگر خداوند تعالیٰ صرف حیات پر قادر ہوں اور موت پر نہ ہوں، تو ان کی قدرت اسی طرح ناقص سمجھ جائی گی، قدرت تمام اسی وقت ہوسکتی ہے کہ دونوں پر قدرت ہو اور اگر یہ چیزیں تحت قدرت داخل کی جاتی ہیں، تو لازم آتا ہے کہ خدا خالق شر ہو جائے، قرآن مجید نے دوسری شق اختیار کی اور اس کے بعد فرمایا:

﴿الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ﴾ (الملک: ۲)

''جس نے پیدا کیا موت کو اور حیات کو''۔

بس صرف لفظ ''خلق'' سے اعتراض کا جواب ہوگیا، کیونکہ ''خلق'' اور ''اتصف'' میں بہت فرق ہے، بیشک خدا موت کے ساتھ متصف نہیں ہوسکتا، مگر پیدا کرتا ہے۔ خرابی شر کے ساتھ ملوث ہونے میں ہے، نہ کہ پیدا کرنے میں، خلق تو دونوں ہی کا کمال ہے، گلاب کے پھول دکھانے میں شعبدہ گر کی چابک دستی اور کمال مشق کی اگر دلیل ملتی ہے، تو ہمیشہ یہی سانپ کے پیدا کرنے میں بھی ہے۔ الحاصل خلق شر و خیر دونوں کمال ہیں۔ نقص، شر کے ساتھ اتصاف میں ہے اور خدا اسکے ساتھ متصف نہیں، صرف ان دونوں کا خالق ہے، یا یوں

کہو کہ شر کے مصدر ہونے میں خرابی ہے، نہ کہ خالق ہونے میں، مجھ سے حضرت الاستاذ جناب مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی، مدرس دار العلوم دیوبند نے ایک دفعہ فرمایا کہ خداوند تعالیٰ نے ''صدور'' اور ''خلق'' کے تفرقے کو ان لفظوں میں ارشاد فرمایا ہے:

﴿إِن تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَقُولُواْ هَـذِهِ مِنْ عِندِ اللّهِ وَإِن تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَقُولُواْ هَـذِهِ مِنْ عِندِكَ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِندِ اللّهِ فَمَا لِهَـؤُلاء الْقَوْمِ لاَ يَكَادُونَ يَفْقَهُونَ حَدِيثاً﴾

(النساء:۷۸)

''اگر ان کو کوئی اچھائی پہنچتی ہے، تو کہتے ہیں یہ خدا کی جانب سے ہے اور اگر کوئی برائی پہنچتی ہے، تو کہتے ہیں تیری جانب سے ہے۔ کہو کہ سب کچھ خدا کی جانب سے ہے۔ اس قوم کو کیا ہو گیا ہے کہ بات سمجھنے کے گرد بھی نہیں پھٹکتے''۔

اس آیت میں تو خداوند تعالیٰ نے حسنات (اچھائیاں) اور سیئات (برائیوں) کے خلق کو اپنی طرف منسوب فرمایا اور خلاف مرغوباتِ کفار تعلیم دی۔

﴿قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِندِ اللّهِ﴾

''سب خدا کی جانب سے ہے''۔

اور پھر ارشاد کیا کہ خلق شر و خیر میں کوئی برائی نہیں، بلکہ عین کمال، بلکہ اس کے خلاف ہونا نقص ہے۔ ارشاد ہے:

﴿فَمَا لِهَـؤُلاء الْقَوْمِ لاَ يَكَادُونَ يَفْقَهُونَ حَدِيثاً﴾

''آخر اس قوم کو کیا ہو گیا ہے کہ بات سمجھنے کے گرد نہیں پھٹکتے''۔

البتہ اگر نقص ہے، تو شر کا مصدر ہونا ہے اور مصدر شر کا انسان ہی ہے، جیسا کہ اسی کے بعد فرمایا:

﴿مَا أَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّهِ وَمَا أَصَابَكَ مِن سَيِّئَةٍ فَمِن نَّفْسِكَ﴾ (النساء: ۷۹)

''اچھی بات جو تجھے پہنچتی ہے، تو خدا سے ہے اور جو بری بات پہنچتی ہے، تو

وہ تیرے نفس سے"۔

کیونکہ پہلی آیت میں لفظِ من "عند" پر داخل ہے اور "عند" لفظِ اللہ پر، اس سے مقصود یہی ہے کہ خداوند تعالیٰ[1] کی صفتِ خلق سے دونوں چیزیں موجود ہوئیں اور دوسری آیت میں نفس ذات پر "من" داخل کیا۔

﴿مَا أَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰه﴾

"جو اچھائیاں پہنچتی ہیں، وہ خدا سے ہیں"۔

یعنی: نفس ذات الٰہیہ مصدرِ خیر ہے، یعنی: خداوند تعالیٰ کی ذات خیر وحسنات کی مصدر ہے۔ شر کی مصادر مخلوقات کی ذاتیں ہیں، کما قال عزمن قائل:

"فمن نفسك" "تیری طرف سے ہیں"۔

یعنی: نفس ذات امکانی مصادرِ سیئات ہیں کہ وہی مدخول لفظِ "من" ہیں۔

اور خالق ومصدر میں جو فرق ہے، وہ ظاہر ہے۔ آفتاب روشنی کا مصدر ہے، خالق نہیں، شعبدہ گر شعبدہ کی چیزوں، مثلاً: روپیہ، کبوتر، سانپ کا خالق (مجازاً) ہے، مصدر نہیں، پس یہی حال وہاں بھی ہے۔ آتش کدوں کے موبدوں سے جو کچھ غلطی ہوئی ہے، وہ صرف مصدر وخالق کے باہمی فرق کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہے۔

بہرکیف شریک واجب کے اثبات کی انتہائی دلیل جو کچھ بھی تھی، وہ صرف یہی ہے، قرآن مجید نے جبکہ اس کا جواب دے دیا ہے، تو بتاؤ کہ تمام عالم کو مخاطب کرتے ہوئے، جس میں ایک معمولی گنوار سے لے کر کیانیوں اور ساسانیوں کے دربار کے فیلسوف بھی شریک ہیں، اگر قرآن مجید کے سوال:

﴿أَئِنَّكُمْ لَتَشْهَدُونَ أَنَّ مَعَ اللّٰهِ آلِهَةً أُخْرَى﴾ (الأنعام: ١٩)

"کیا تم گواہی دے سکتے ہو کہ خدا کے ساتھ اور دوسرا معبود بھی ہے؟"۔

کا جواب پوچھیں تو بتاؤ کہ شہادت کی کسی میں جراءت ہوسکتی ہے؟

ارسطو بھی تمہارے سامنے آیا اور اپنے ژولیدہ وپرپیچ بیانات میں "توحید" کو مدلل

---

[1]: ......یعنی عند سے اشارہ ہے کہ ذات کو ان سے لگاؤ نہیں بلکہ خدا کی صفت خلق جو اس کی ذات کے نزدیک ہے اس سے یہ چیزیں پیدا ہوئیں ١٢

کرتے ہوئے رخصت ہوا، اکسانیوفون بھی اپنی تمام دماغی نتائج وثمرات کے ساتھ ظاہر ہوا اوراس مسئلہ کے متعلق اسے جو کچھ بھی کہنا تھا اسے بھی تم سن چکے، ان دونوں کے کلام کی توضیح وشرح میں جن جدید کاوشوں سے مجھے کام لینا پڑا، اسے بھی تم نے دیکھا، اخیر میں ان سب کے بعد تم نے ''کتابِ کامل، صحف قیمہ'' کے ان چند سلیس اور صاف نکھرے ہوئے بیان کو بھی پڑھا، جس نے مشرکین کی زبانوں پر ہمیشہ کے لئے تالے ڈال دیئے۔

انصاف شرط ہے، بتاؤ کہ مباحثہ کی اصلی راز سے حقیقی نقاب کشائی کا کام سہولت کے ساتھ کس نے انجام دیا؟ یہ سب حکماء تھے، فلسفہ دانی کے مدعی تھے، لیکن بشری نقصانات کا کیا علاج ہے کہ ابتداءِ بحث میں جس چیز کو طے کرلینا چاہئے تھا، اس کی طرف کسی کو توجہ نہیں ہوئی، حالانکہ بحث وتحقیق میں سب سے پہلے دیکھنے کی بات یہی ہوتی ہے کہ فریقین میں کون مدعی اور کون منکر ہے، کس کے لیے دلیل کی ضرورت ہے اور کون صرف انکار پر قناعت کرسکتا ہے۔

قرآن تھا جس نے بتایا کہ موحّد ومشرک میں دعوے کے منصب پر مشرک ہے، موحّد دوسرے خدا کا انکار کرتا ہے اور مشرک اسے ثابت کرنا چاہتا ہے، اس لیے بارِ ثبوت مشرک کے سر ہے کہ عقل وقانون، فطرت وآئین کا نہ ٹوٹنے والا قطعی فیصلہ ہے کہ ''دلیل مدعی لائے، منکر کے لیے صرف اس کا انکار کافی ہے''۔

اسی اصول کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے قرآن نے جو چیلنج دیا، تم نے دیکھا کہ شرک کی آبادیوں پر اس کے بعد کیسی ویرانی چھائی، مشرکوں کے دل ودماغ پر یاس ونا کامی کے جتنے دھاوے اس کے بعد ہوئے، ان کے دل سے پوچھ سکتے ہو۔

قرآنی توحید پر دوسری نظر

اگر توحید کی بحث میں قرآن صرف اسی انکارِ مستحکم پر قائم رہتا، تو اس کے لیے کافی تھا، مشرک جب تک دلیل نہیں بیان کرتا ہے (اور کبھی نہیں بیان کرسکتا) اس وقت تک قرآن کو ایک لفظ کے اضافہ کی ضرورت نہیں، لیکن نہیں، اس کا منزل تعالیٰ مجدہ رؤف ورحمٰن ہے، وہ دماغوں کو صرف بوکھلا دینا نہیں چاہتا، بلکہ صراط مستقیم پر لگانا چاہتا ہے، ان کو دارالاسلام کی

طرف کھینچنا چاہتا ہے، اسی لئے اس نے مختلف مقامات میں جب مشرکوں کو ہر طرح سے تھکا لیا، ان سے منوالیا کہ وہ اپنے دعویٰ میں دلیل کی جانب محض نادار مفلس ہیں، تو اس کے بعد اب استدلال کے رخ کو پلٹتا ہے اور ایک جدید طرز اختیار کرتا ہے، جس سے مشرک صرف ساکت ہی نہیں، بلکہ ''توحید'' پر مطمئن اور ہمیشہ کے لیے معتمد ہو جاتا[1] ہے۔ ارشاد ہے:

﴿أَأَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُونَ خَيْرٌ أَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ﴾

(یوسف: ۳۹)

''کیا متفرق ومتعدد خدا کا ہونا بہتر ہے، یا ایک خدا کا جو (عالم کی ہر چیز پر) قہار (وغالب) ہے؟''۔

غور کرنے والے کے لیے تشفی وتسکین کے جتنے پیغام نشاط اس سوال کے جواب میں مستور ہیں، حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی کسی دلیل میں تم نہیں پا سکتے ہو اور پاؤ گے بھی، تو وہ بھی قرآن ہی کا کوئی برہان ہوگا۔

زندگی نے وفا کی، تو انشاءاللہ وہ بھی آتا ہے۔ بہرکیف پہلے اسے تو سمجھ لو، بات تو کھلی ہوئی ہے، لیکن سمجھانے کے لیے چند ضروری امور کو بطور تمہید کے میں مقدم کرتا ہوں:

۱)...... فطری طور پر انسان مین کچھ قوتیں ہیں، جن کے آثار واعمال پر وہ ہر طرح اطمینان و بھروسہ کرتا ہے، مثلاً: اس میں بینائی کی قوت ہے، جس چیز کا علم اس کے ذریعہ سے اس میں آتا ہے، اس پر وہ یقین کرتا ہے، جب[2] تک اس کے خلاف میں کوئی قوی اور نہایت زبردست دلیل نہیں قائم ہو جاتی ہے، اس کی کبھی تغلیط نہیں کرتا۔

۲)...... انسان کی فطری قوتوں میں سے ایک قوت یہ بھی ہے کہ جب اس کے سامنے دو ایسی چیزیں پیش ہوں، جن میں ایک اچھی اور ایک بری ہو، تو وہ اچھی چیز کے اختیار کرنے

---

[1]:...... تعلیم اور صرف تعلیم، بلکہ ہر کام کا یہ اصولی طریقہ ہے کہ فاسد چیزوں کو برباد کر کے پھر اچھی چیزوں کی بنیاد قائم کی جاتی ہے۔ ایک خراب مکان کی جگہ خوبصورت مکان اس وقت تعمیر ہوسکتا ہے، جبکہ پہلے مکان کو ڈھا دیا جائے۔ اسی طرح قرآن نے پہلے شرک کی دیواروں کو ڈھا دیا، اس کے بعد نہایت سہل الوصول طریقے سے اب توحید کی بنیاد جماتا ہے۔

[2]:...... یہ جملہ اس لئے بڑھا گیا کہ حواس کے معلومات کبھی دلیل کے بعد غلط ثابت ہو جاتے ہیں، مثلاً: یورپ کہتا ہے کہ اگرچہ زمین دیکھنے میں ساکن معلوم ہوتی، جب دلیل سے متحرک بتاتی ہے، تو اپنے دیکھنے کو غلط سمجھنا چاہیے۔ ۱۲ منہ

پر اپنے کو مجبور پاتا ہے، مثلاً: فرض کرو! کہ تمہارے سامنے دو گلاس رکھے جاتے ہیں، جن میں سے ایک تو قند و گلاب سے لبریز ہے اور دوسرا یا تو زہر ہلاہل سے مملو ہے، یا نہیں تو کم از کم اس میں زہر کے ملنے کا تم کو شبہ ہے، اس کے بعد تمہیں اختیار دیا جاتا ہے کہ ان میں سے جس گلاس کو چاہو، چڑھا جاؤ، ظاہر ہے کہ تمہارا ہاتھ قند و گلاب والے غیر مشکوک گلاس کی طرف اضطراراً بڑھ جائے گا۔ بتاؤ کہ کس نے تم کو اس پر مجبور کیا؟ آخر وہ کون سی قوت تھی جس نے زہر کے گلاس سے تمہارا ہاتھ روک دیا اور دوسرے گلاس کی طرف بڑھا دیا؟ دراصل یہ ایک فطری قوت ہے، جو ہر ایک انسان میں (اگر وہ ماؤف الدماغ نہیں ہے) موجود ہے کہ جب خیر و شر کا مقابلہ ہوگا، تو وہ اسے خیر کی طرف متوجہ کردے گی۔

قرآن مجید کی اس دلیل کا مدار اسی قوت فطریہ پر ہے، اب تم اس قوت کو زندہ کرلو اور اس تلاش میں نکلو کہ عالم کا رب، کردگار، خالق، پروردگار ایک ہے، یا چند، ظاہر ہے کہ اس علمی سفر میں تمہارے سامنے کل دو صورتیں پیش آسکتی ہیں:

(۱) ایک تو یہ کہ ہر موجود، ہر ہستی کا خالق و پروردگار الگ الگ ہے، مثلاً: زید کا پیدا کرنے والا اور ہے، عمرو کا خالق اور ہے، پانی کا برسانے والا اور ہے، غلہ کا پیدا کرنے والا اور ہے، ہوا ایک خدا کے ہاتھ میں ہے، تو آگ دوسرے کے، آفتاب تیسرے کے، الی غیر ذلک۔

(۲) دوسری صورت یہ ہیکہ کائنات میں جو کچھ ہے ازماہ، تا یما ہی صرف ایک اور ایک ہی قوۃ قہار کے زیر فرمان ہیں۔

شرک و توحید کے یہ دو مرقع ہیں، جس کو قرآن تمہارے سامنے پیش کرکے صرف اس قدر پوچھتا ہے کہ بتاؤ کہ ان دونوں میں کون خیر و بہتر ہے اور کون سراسر خبط و بدعقلی کا مظہر ہے؟ ظاہر ہے کہ اگر پہلی صورت تسلیم کی جاتی ہے، تو جس مہربان و کریم پالنہار کی تلاش میں تم نکلے تھے، وہ ملتا نہیں، بلکہ کھویا جاتا ہے۔ آخر جب زید کا رب اور ہوا اور تمہارا رب اور ہوا، تو تم اپنے خدا کو اب کہاں پاسکتے ہو اور کس طرح پاسکتے ہو؟ خدا حواس سے تو محسوس نہیں ہوتا، البتہ عقل اس کی ضرورت ثابت کرتی ہے کہ ہمارے لئے ایک پیدا کرنے والا ہونا

چاہیے، لیکن وہ یہ کس طرح بتا سکتی ہے کہ ان ستر ہزار معبودوں میں تمہارا خدا کون ہے کہ اس کی تعیین اس کے اختیار میں نہیں، پھر اندازہ کرو کہ اس صورت میں تم نے اپنے مالک کو (جس کی جستجو تمہیں صرف اس لئے تھی کہ اس کے آگے اپنی حاجتیں پیش کروں گا، رووں گا، اس سے اپنی دنیا و آخرت کی بھلائی طلب کروں گا) اسے تم نے اس جھمیلے میں پایا، یا گم کیا اور صرف یہی نہیں، بلکہ اگر تنگ آ کر تم نے خواہ مخواہ بلا کسی دلیل کے (جیسا کہ مشرکین کرتے ہیں) کسی ایک معبود سے لو لگائی اور فرض کرو کہ وہ تمہارا مالک نہ ہوا، تو اس وقت تمہارے اصلی معبود و پروردگار کے دریائے غیظ و غضب کبھی تھم سکتے ہیں؟ پھر کیسا اس وقت ''صلا نہ شد، بلا شد'' کے مصداق بننے کے لیے تمہیں تیار نہیں ہونا چاہئے۔

بخلاف اس کے کہ اگر تم تمام عالم کو ایک ہی قوت قاہرہ یزدانیہ کے ماتحت کر لو اور سمجھو کہ تمام عالم کا رب، پروردگار ایک ہی ہے، تو اس وقت ان تمام دقتوں کی کیا کبھی نوبت آسکتی ہے، کسی خطرہ کی گنجائش بھی باقی رہتی ہے؟ اور جبکہ نہیں رہتی، تو اب دوسری صورت کے خیر و بہتر ہونے میں کیا شر ہے؟ صرف اس پر غور کرو، یا اس طرح مثلاً تمہارے سامنے دو قوتیں پیش کی جاتی ہیں:

(۱) ایک تو ایسی جس سے تم اپنے تمام مقاصد کو حاصل کر سکتے ہو، اگر اس کو صحیح طور پر استعمال کیا جائے، تو نہ صرف دنیا، بلکہ عقبیٰ کا بھی ہر معاملہ بآسانی سلجھ سکتا ہے۔ الغرض ذرہ سے لے کر آفتاب تک پر اس کے ذریعے سے حکومت کر سکتے ہو اور اگر زیادہ سنجیدگی سے تم نے کام لیا، تو تمام کائنات پر متصرف ہو سکتے ہو۔

(۲) دوسری قوت ایسی ہے جس سے بجز معدودے چند چیزوں کے اور کوئی کام نہیں نکل سکتا۔ کیا اس میں سے پہلی صورت خیر نہیں؟ اور جبکہ ہے، تو کیا یہ نسبت متفرق معبودوں اور خدائے واحد قہار کے درمیان نہیں؟ آخر متفرق معبود جبکہ بجز اپنی زیر اثر مخلوقات اور کسی دوسرے پر تصرف نہیں کر سکتے، تو پھر ان کے پوجنے والوں کو ان موجودات کے علاوہ اور کس پر قدرت ہو سکتی ہے، بخلاف خدائے واحد قہار کے۔ جب تمام نظام عالم اسی کے زیر نگین ہیں، تو اس کو راضی کر لینے کے بعد ہو سکتا ہے اور ہوا کہ تم چاند کے ٹکڑے اڑا سکتے ہو، آفتاب کو تھام سکتے ہو، ہوا کو روک سکتے ہو، وغیرہ ذالک۔

پس یہی قرآن کا بھی مطلب ہے کہ شرک وتوحید کے دعووں کو سامنے رکھنے کے بعد توحید کے علاوہ اور کوئی چیز خیر نہیں ہو سکتی اور اس کے خیر ثابت ہو جانے کے بعد اس کا یقینی ہونا قطعی ہو جاتا ہے، علی الخصوص جبکہ خلاف میں کوئی دلیل بھی نہیں اور اگر اس کے بعد بھی شبہ رہتا ہے، حالانکہ وہ ایک فطری قوت کے آثارِ طبعی میں سے ہے، تو پھر یہی شبہ بینائی اور شنوائی کے معلومات پر کیوں نہیں ہوگا؟ حالانکہ (جب تک ان کے خلاف پر دلیل نہیں قائم ہو جاتی) ان کے آثار پر تمام دنیا نے یقین وجزم کا اطلاق کیا ہے، تو پھر کیا وجہ ہے کہ توحید کے عقیدہ پر جو اسی طرح ایک جبلی قوت کے ثمرات میں سے ہے، یقین واذعان کا اطلاق نہ کیا جائے۔

یہ تو اس آیت کی ایک معمولی توضیح تھی، اب اس کی تعمیم کو بھی دیکھ لو:

توحید کا عقیدہ جب خیر وبہتر ٹھہرا اور شرک ایک خراب اور بری چیز قرار پائی، تو پھر کون ہے جو اس پر ایمان لانے سے جھجک سکتا ہے کہ دلیل تو جس احساس جبلی پر مبنی ہے، اس سے دنیا کا کوئی سلیم الفطرت انسان خالی نہیں۔

ایک دیہاتی تیل خریدنے کے لیے بازار آتا ہے، اس کے سامنے دو بیل آتے ہیں، ایک مضبوط وخوبصورت ہے، اور دوسرا لاغر وبدہیئت ہے، ایک چست وچالاک ہے، دوسرا سست ومریل ہے اور فرض کرو اگر قیمت میں پہلا اگر کم نہیں، تو مساوی ہے، ایسی صورت میں وہی جذبہ کیا دہقان میں تموج پرواز نہ ہوگا اور بعجلت تمام روپیہ نکالنے پر اسے مجبور نہ کرے گا؟ اور جب کہ دنیا کے ایسے معمولی واقعہ میں اس قوت کی بھی کارفرمائی ہے، تو ایسے مقام میں جہاں پر دین ودنیا کی صلاح وفلاح کی تلاش ہے، اس کی وہی قوت غیر کے اختیار کرنے پر کیوں نہیں مجبور کرے گی؟ اور وہ توحید کے علاوہ اور کیا چیز ہو سکتی ہے.....؟

اسی طرح ایک تاجر کسی شہر میں دوکان کرایہ پر لینے کے لیے آتا ہے، اس کے سامنے بھی دو دوکانیں پیش ہوتی ہیں، ایک عام شاہراہ پر واقع ہے اور دوسری کسی کوچہ کے تاریک گوشہ میں ہے، ایک خوبصورت فراخ ہے، دوسری سیاہ اور تنگ ہے اور فرض کرلو کہ کرایہ میں دونوں مساوی ہیں، تو ایسی صورت میں تاجر کیا کریگا؟ کیا خیر کو شر پر بلا کسی وجہ کے ترجیح دے سکتا ہے اور جبکہ یہاں نہیں دے سکتا، تو شرک وتوحید کے موقعہ میں اس کا یہ احساس کیوں

باطل ہو جائے گا؟

ازیں قبل دنیا کے ہر طبقہ میں اسی اصول پر عمل درآمد جاری ہے، انسان جو کچھ کرتا ہے، اسی احساس کی رہنمائی میں کرتا ہے۔ جو کچھ غلطی ہوتی ہے، وہ خیر وشر کے سمجھنے میں ہوتی ہے اور جبکہ واضح طور پر توحید کی بہتری شرک کے مقابلے میں ثابت ہو چکی، تو اب دنیا کا کوئی فیلسوف بھی اس کا منکر نہیں ہوسکتا کہ وہ بھی صرف اسی لئے حقائق پر نئے سرے سے غور کرتا ہے کہ غلط مسائل میں سے صحیح کو چھانٹ لے، اس کے سامنے بھی جب دو باتیں جن میں ایک غلط اور لغو ہوتی ہے اور دوسری صحیح اور باوقعت ہوتی ہے، پیش کیجاتی ہے، تو وہ صحیح کے اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور غلط کو رد کر دیتا ہے، پھر جبکہ شرک وتوحید میں بھی نسبت ہے، تو ''توحید'' کے تسلیم پر اس کی طبیعت کیوں مجبور نہیں ہوگی...! علاوہ اس کے آیت میں ''قہار'' کے لفظ سے دراصل اس دلیل کی طرف بھی اشارہ ہے، جسے میں نے اکسانیوفون کے خیالات کے تحت میں شرح کے طور پر درج کر دیا ہے۔ بخوفِ طوالت میں صرف اسی پر اکتفا کرتا ہوں، فلسفی کے لیے اس میں بہت کچھ ہے۔

توحید کے خیر و بہتر ہونے کی جو آسان و سہل وجوہات تھیں، وہ گذر چکیں، جس کے اندر انشاء اللہ کلام وگفتگو کی کسی طرح گنجائش نہیں اور اگر ہے، تو اسے ظاہر کرنا چاہیے۔ کافی سمجھ کر میں مضمون ختم کر چکا تھا کہ یکا یک خیال ہوا کہ اگر چند ارباب کے ماننے والے یہ کہیں کہ ہم ہر ایک معبود کو پوجیں گے، کیونکہ انسان اپنے کھانے پینے، رہنے سہنے، دواء وغیرہ وغیرہ میں ہر ایک موجود کا محتاج ہے اور جب ان کا محتاج ہوا، تو پھر ان کے خالقوں کا تو بدرجہ اولیٰ ہوا، اس لیے سب کو ماننا چاہئے اور اس صورت میں جو گم گشتگی لازم آئی تھی، وہ رفع ہوگئی۔ اس شبہ کا ذہن میں گذرنا تھا کہ میں نے پھر آیاتِ قرآنیہ پر نظر کی، فوراً معلوم ہوا کہ خداوند قدیر جل مجدہ نے اس کا بھی ازالہ فرما دیا ہے، ارشاد ہے:

﴿ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلاً رَّجُلاً فِيْهِ شُرَكَاء مُتَشَاكِسُوْنَ وَرَجُلاً سَلَماً لِّرَجُلٍ هَلْ يَسْتَوِيَانِ مَثَلاً اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ (الزمر: ۲۹)

''اللہ تعالیٰ ایک مثال بیان فرماتا ہے کہ ایک آدمی (غلام) ہے، جو مختلف

شرکاء میں مشترک ہے اور دوسرا غلام ایسا ہے کہ صرف ایک آدمی کے سپرد ہے، کیا دونوں (بہتری و خیریت) میں برابر ہو سکتے ہیں؟ سب تعریفیں خدا کے لیے ہیں، لیکن (توحید وشرک کے حسن وقبح) کو بہت کم لوگ جانتے ہیں (ورنہ اگر چاہتے، تو توحید کے ماننے پر اپنے کو مجبور پاتے)''۔

یعنی: اگر یہ صورت اختیار کی جائے کہ تمام ''ارباب متفرقوں'' کی عبادت کی جائے، اس کے بعد بھی مقابلہ کر کے دیکھ لو اور اندازہ کرو کہ شرک بہتر رہتا ہے، یا توحید؟ کیونکہ اس وقت بھی وہی دو صورتیں پیش ہوتی ہیں۔

(۱) ایک شخص ہے جو صرف ایک ہی شخص کا غلام ہے اور اسے صرف اسی کی خدمت کرنی پڑتی ہے۔

(۲) دوسرا شخص ہے جو بہت سے آقاؤں میں مشترک ہے، ان میں ہر آقا اس سے خدمت کا طلبگار رہے۔

بتاؤ کہ اس میں خیر و بہتر کون ہے، امن واطمینان کس کے لیے ہے؟ ظاہر ہے کہ ایک شخص ایک کا کام تو انجام دے کر بخوشی زندگی بسر کر سکتا ہے، بخلاف اس کے جس کے سیکڑوں آقا ہیں، کیونکہ کل دو صورتیں ہیں، یا تو وہ سب کا کام کرے، تو اس کا انجام بجز ہلاکت و بربادی کے اور کیا ہے....؟ پھر احتمال باقی ہے کہ پورا ہو، یا نہ ہو اور اگر ایک کا کرتا ہے، تو اور سب آقا اس سے خفا ہو کر اس کے درپے آزاد ہو جائیں گے، پس ہر حال میں پہلا دوسرے سے خیر و بہتر ہے۔ علاوہ اس کے فرض کرو کہ ایسے غلام مشترک کو اگر کبھی کوئی ضرورت پیش آئی، تو بوجہ شرکت کے ہر ایک دوسرے پر ٹالے گا اور دو ماموں کے بھانجے بھو کے رہ جاتے ہیں، وہ مثل پوری صادق آئے گی۔

پس یہی نسبت ان دونوں میں بھی ہوگی، جن میں سے ایک صرف ایک خدا کو مانتا ہے اور اسی کی عبادت کرتا ہے اور دوسرا متفرق معبودوں کو بلا کسی دلیل کے مانتا ہے اور سب کو پوجنا چاہتا ہے، اس لیے کہ کم از کم اگر کچھ بھی نہیں، تو اس مشرک ان گنت معبود والے انسانوں کی ذمہ داریاں موحد کی ذمہ داریوں سے بہت زیادہ مشکل ہوں گی اور ظاہر ہے سہل ومشکل کاموں میں جب مقابلہ ہو جاتا ہے اور مشکل کے اختیار کرنے کی کوئی وجہ بھی

نہیں ہوتی، تواس وقت سہل کام سے بہترین چیز اور کچھ نہیں ہوتی۔

پس جب مشرک کے اختیار کرنے میں انسان بہت سی صعوبتوں کا نشانہ بن جاتا ہے اوراس کے اختیار کرنے کی کوئی دلیل بھی نہیں، تواس صورت میں توحید سے بہترین چیز اور کیا ہوسکتی ہے......!

اور یہی مقصد تھا کہ توحید ہر حال میں شرک سے بہتر ہے اور جو چیز بہتر ہے اس کے ماننے پر انسان کی فطرت مجبور ہے، پس توحید کے ماننے پر انسان کی فطرت مجبور ہے۔ ھذا والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ (باقی آئندہ)

ذنابہ

اپنی بے بضاعتی کا مجھے ہر طرح اعتراف ہے اوراس لیے بہت ممکن ہے کہ میں نے کلام پاک کی صحیح ترجمانی نہ کی ہو، مگر مقصود صرف اس قدر ہے کہ اربابِ علم وفطانت کاش! قرآن کی دلیلوں پر غور کرتے اور قاضی وملا حسن کے مزخرف دلائل میں غرق ہونے کے بجائے قرآنی حجتوں میں ڈوب جاتے اور اگر وہ ایسا نہیں کرتے ہیں، تو باایں ہمہ کم مائگی میں بھی میں نے تو بھی ارادہ کرلیا ہے کہ:

جز صراحی و کتابم نبود یار ندیم
تا حریفاں و فارابہ جہاں کم بنیم

(ماہنامہ القاسم، دارالعلوم دیوبند)

قرآن کے طرز استدلال پر ایک سرسری نظر

شیوۂ حور و پری، خوب ولطیف است ولے

خوبی آنست و لطاف کہ فلالے دارد

استدلال واحتجاج، قرآن مجید کی پہلی ایجاد نہیں، دعوی کو زنجیرِ دلیل وبرہان میں جکڑنا ،انسان کی فطری عادتوں میں سے ہے اور یہی فطرت دراصل سنگِ بنیاد ہے، ان تمام فلسفی ایوانوں اور خطابی محلسراؤں کی، جسے ارسطو وافلاطن، ڈیکارٹ، میلبر انس، بر کلے، ابن رشد، ابن سینا، شیلانگ، ہیگل کے دماغی ہاتھوں نے تیار کئے۔

قیاس و حجت کی ابتداء معمولی دماغوں سے ہوئی اور بالآخر وہ دنیا کے چیدہ فطانتوں، فیلاسوفی ذکاوتوں کے لیے آماجگاہ بن گئی، اول الذکر طائفہ دوسرے گروہ سے مقصد میں متحد ہے، لیکن ضعف واستحکام کے مراتب ومدارج کے تفرقوں سے پھلا عامیانہ استدلال کے نام سے موسوم ہوا اور دوسرا فلسفہ وحکمت کے پرشوکت لفظوں کا مصداق قرار دیا گیا۔

عجیب بات ہے کہ وہی عامی استدلال، جب فلسفی قالب میں ڈھل جاتا ہے، تو عام ذہنوں کے حق میں، جن کی تعداد بہ نسبت خواص کے بہت ہی زیادہ ہے۔ پرپشہ سے بھی زیادہ کم رتبہ ثابت ہوا ہے، واقع میں گو وہ کتنا ہی پرزور ہو، لیکن اس کا علاج کیا ہے کہ عام سمجھ اس کے ادراک سے عاجز، حتی کہ سننے سے بھی بیزار ہے۔

آخر تم ایک ایسے دیہاتی کو جو تمدن وتہذیب، تفلسف وتمنطق کی آبادیوں سے دور کسی جھونپڑی میں بستا ہے، کیونکر افلاطن کے ان لفظوں کو سمجھا سکتے ہو کہ ”تمام عالم ممکن ہے اور جو ممکن ہے، وہ بغیر علت کے، لباس وجود حاصل نہیں کرسکتا اور جس طرح یہ ضروری ہے، اسی طرح یہ بھی بدیہی ہے کہ ہر ما بالغیر کی کسی ما بالذات پر انتہا ہو اور دونوں مقدموں کے تسلیم کے بعد یہ یقینی نتیجہ پیدا ہوتا ہے کہ موجودہ نظام امکانی کا پیدا کرنے والا کوئی ما بالذات وجود ہے، جسے ہم خدا کہتے ہیں“۔

یا ارسطو کے اس قول کا مقصد اس معمار کے سینے میں جس کی عمر بجز تعمیر، ترمیم کے اور کسی چیز میں صرف نہیں ہوئی، کس طرح اتارا جاسکتا ہے کہ ”جو زید آج پیدا ہوا ہے، اس سے پہلے جس قدر بھی علل گذرے ہیں، لامحالہ انہیں کسی وجود پر منتہی ہونا چاہئے، ورنہ دور لازم آئی گا، یا تسلسل، اور دونوں کے دونوں محال ہیں، پس وہ وجود جو منتہائے علل ہے، اسی کو فلسفہ کی زبان میں علۃ العلل (کازاف دی کاز) اور واجب کہتے ہیں اور عام لوگ خدا کے نام سے پکارتے ہیں“۔

ہم ہوں، یا تم، کوئی بھی ہو، ابطال لاتناہی، تکذیب دور کے دلائل و براہین کی تصویر اس بیچارے کے لوح ذہن پر کس طرح کھینچ سکتے ہیں، جب تک کہ اسے کسی یونانی فلسفہ کے مدرسے میں آٹھ نو برس رہ کر تحصیلِ حکمت کا موقع نہ دیا جائے، یا مثلاً اس افرنجی فیلسوف پروفیسر فلنٹ کے اس بے معنی کلام کو کس طرح عام لوگوں کے لئے قریب الفہم بنایا جاسکتا ہے کہ ”جو چیزیں ذہن میں آتی ہیں، وہ موجود ہے، اور چونکہ ہستی واجب کا تصور ہم کرتے ہیں، پس وہ موجود ہوئی، اس لئے کہ معدوم کا تصور محال ہے“۔

تم اندازہ کرسکتے ہو کہ اسپنیوزا کی اس تفصیل کو ایک ساہوکار، سیٹھ کس طرح ذہن نشین کرسکتا ہے کہ ”ہم جب کسی چیز کو دیکھتے ہیں، تو اس سے پہلے ہم کچھ عوارض و حالات کا انتزع کرتے ہیں اور دوسری چیز اس میں قائم بالذات نظر آتی ہے، جس پر ان عوارض ولوازم کا پردہ پڑا ہوا ہے اور وہی ان اعراض کی حامل ہے، پس وہ شے جو ان چیزوں کی حامل ہے اور اس کے اندر مستور ہے، وہ خدا ہے اور یہ تمام اشیاء جسے تم رنگ، مزہ، آواز، سختی، نرمی، روح، مادہ، فکر، سوچ وغیرہ کے لفظوں میں تعبیر کرتے ہو، اسی وجودِ باطن کے مظاہر ہیں۔

”وہ وجود جسے میں خدا کہتا ہوں، باوجود اس قدر پھیلاؤ کے غیر منقسم ہے، یعنی: غیر محدود ہونے کے ساتھ، وہ ناقابلِ انقسام بھی ہے، کیونکہ اگر وہ محدود ہو، تو اس کے احاطہ وجود کے بعد اور کوئی وجود بھی ہوگا، جس کے بعد پھر وحدت نہیں رہتی اور اگر منقسم ہوگا، تو پھر اس کے اجزاء باہم الگ الگ ہوں گے، جس سے پھر وحدت مجروح ہوجاتی ہے“۔

الغرض خواہ تم شفاء واشارات کی ورق گردانی کرو، طوسی اور دوانی کے کلمات میں تلاش کرو، باقر داماد کے مدعیانہ لٹریچر میں ٹٹولو، کیمبل فریز ہیرس، مارٹینو کی تالفات میں غرق ہو

کراثباتِ واجب کے دلائل مہیا کرو، سب کا خلاصہ صرف اس قدر ہوگا کہ کبھی تو سرے سے وہ الفاظ رہیں منت معنی نہ ہوں گے اور اگر اتفاق سے ہوئے بھی، تو صرف معدودے چند دماغوں کے لیے، جن کی ساری زندگی دشت فلسفہ کے سیر وسیاحت میں بسر ہوئی ہو۔

اور جس طرح ان حکمی براہین میں عام طبائع کے لیے شائبہ تسلی واطمینان نہیں، بجنسہ یہی حال ان عامیانہ دلیلوں کا ہے، جسے اکثر تم نے واعظوں، خطیبوں کی زبانی سنا ہوگا، مثلا: عرب کے ایک بدو نے خدا کے ثبوت میں صرف اس قدر کہنا کافی قرار دیا کہ ”مینگنی جو راستے پر پڑی ہوتی ہے، بتاتی ہے کہ ادھر سے کوئی اونٹ گذرا ہے، نقش قدم یقین دلاتے ہیں کہ ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے اور ہم اس کے ماننے پر اپنے کو مجبور پاتے ہیں، پھر کوئی وجہ نہیں کہ ان آسمانوں، زمینوں، سمندروں کو دیکھ کر ہم ایک ”فاطر لایزال، صاحب ارادہ“ کے آگے سر بسجود ہو کر نہ گر پڑیں۔

بلاشبہ یہ استدلال جس قدر سادہ اور عام فہم ہے، اسی قدر نازک اور لطیف ہے، لیکن کیا کیا جائے کہ ایک فیلسوف اسے سن کر متبسمانہ انداز کے ساتھ سطاحت وکوتہ نظری کے عیوب سے داغدار بنا دیتا ہے، وہ ہنس کر کہتا ہے کہ اس استدلال میں سب سے پہلے غلطی یہ ہوئی ہے کہ نفسِ علم بعرہ (مینگنی کے علم) کو تم نے اونٹ کے علم کا سبب قرار دیا، حالانکہ ایسا نہیں ہے، بلکہ اس سے پہلے چونکہ تم مینگنی کو اونٹ سے خارج ہوتے ہوئے دیکھ چکے تھے اور اس مشاہدے نے تمہارے اندر یہ مقدمہ جما دیا تھا کہ مینگنی اونٹ سے ہی نکلتی ہے، اسی لئے اب جبکہ تم نے صرف مینگنی کو دیکھا سمجھا کہ ضرور اونٹ ادھر آیا، ورنہ اگر اس سے پہلے تمہارے پاس یہ مقدمہ نہ ہوتا، تو یقیناً تم کو شبہ ہوسکتا تھا کہ آیا یہ خود بخود موجود ہے، یا کسی دوسرے وجود کا اثر ہے اور یہی حال نقش پا کا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جہاں یہ مشاہدہ نہ ہو گا، جیسا کہ آسمان وزمین کو تم نے کسی وجود سے پیدا ہوتے ہوئے نہیں دیکھا ہے، وہاں بھی اس قاعدہ کو جاری کرنا سطحی قیاس نہیں تو اور کیا ہے۔

بہر کیف مجھے اس وقت ابھی اس سے بحث نہیں کہ یہ اعتراض اس ڈاکٹر کا کس حد تک صحیح ہے، بلکہ دکھانا صرف اس قدر ہے کہ اگر مقدم الذکر فلسفی دلائل، اپنی دقت اور غایت ژولیدگی کی وجہ سے عام دماغوں کے نزدیک مجذوب کی بڑ سے زیادہ وقیع نہ تھے، تو پھر ان

عامیانہ استدلالوں کا حال بھی فلاسفروں کے نزدیک اسی کے قریب قریب ہے اور دونوں حصے میں یہ ایسا زبردست نقص ہے کہ جس کی تلافی کسی طرح بھی ممکن نہیں۔

اس مختصر تمہید کے بعد اب میں تمہیں اس کتاب کی ایک معمولی دلیل سے روشناس کرتا ہوں، جو لفظ کے اعتبار سے گرچہ بہت ہی موجز ہے، لیکن اپنے ہمہ گیر پہلوؤں کی حیثیت سے ایک کامل ذات کی کامل قوتِ استدلال کا نہایت مکمل نمونہ ہے، اور صرف اسی کے ساتھ نہیں، بلکہ اس کی کوئی دلیل بھی کسی خاص طبقے تک محدود نہیں، جس طرح وہ ایک بدو اور بقال، تاجر، مزدور، معمار، نجار وغیرہ عام لوگوں کے لیے اپنے اندر سامان تشفی رکھتی ہے، بعینہ وہ ایک بڑے سے بڑے مغرور فیلسوف کو بھی مبہوت بنا دیتی ہے، مثلاً: مذکورہ بالا مسئلہ کا مدعی ہو کر قرآن دلیل میں ان چند لفظوں کو پیش کرتا ہے:

﴿إِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى﴾(الأنعام: ٩٥)

''بیجوں اور گٹھلیوں کا پھاڑنے والا خدا ہے''۔

اس میں گویا دو چیزیں محل دلیل میں مذکور ہیں۔

(۱) وجودِ بیج اور گٹھلی۔ (۲) اس کا اگنے کے وقت پھٹنا۔

اب غور کرو! وہ دیہاتی بدو، جو نقش قدم سے راہگیر پر اور مینگنی سے اونٹ پر دلیل قائم کرتا تھا، اس کے حق میں فالق الحب والنویٰ (بیج اور گٹھلی کا پھٹنا) اثباتِ فاطر کے لیے کیوں کافی نہیں ہو سکتے؟ جبکہ وہ جانتا ہے کہ ایک سڑی ہوئی، بدبو مینگنی، بلا کسی مینگنی کرنے والے ممکن نہیں، تو کس طرح وہ یقین کرے گا کہ گیہوں کے ایسے عجیب التاثیر دانے، جن سے پیدا ہونے والے خونوں سے وہ دماغ وجود پذیر ہوتے ہیں، جن کی فراست و دانائی کی آوازوں سے معمورہ عالم گونجتا رہا ہے اور روزمرہ گونجتا رہتا ہے، وہی گیہوں بلا کسی خالق کے موجود ہو جائیں۔

اور اسی طرح جب وہ گرد کی سطح کو خاص شان کے ساتھ پھٹی ہوئی دیکھ کر سمجھ لیتا ہے کہ کسی نے اپنے پانوں سے بکھیرا ہے[1]، ایسا آدمی کس طرح اپنے دل کو اس پر راضی کرے گا

---

[1]: ......ہمیں اس سے بحث نہیں کہ یہ سمجھنا اس کا غلط ہے، یا صحیح؟ بلکہ کہنا یہ ہے کہ جس کی سمجھ ایسی ہے، وہ قرآن کی اس حجت کو تسلیم کرنے میں کبھی بھی پس و پیش نہیں کر سکتا۔ ۱۲ منہ

کہ بیج کے غلاف دانوں سے خود بخود ہٹ گئے اور کسی ارادی قوت کی اس کے چاک کرنے کے لیے ضرورت نہیں؟

اب ذرا اور اوپر چڑھو! تمہارے سامنے کسی شہر کے تاجر، ساہوکار، بنئے، لوہار، بڑھی، معمار وغیرہ آتے ہیں، جو بنسبت ایک دیہاتی کے متمدن اور زیادہ عقل والے کہے جاتے ہیں، اچھا تو تم اس جماعت سے کسی معمار، یا انجینئر کو اپنا مخاطب بناتے ہوئے دریافت کرو کہ آیا کسی تنکے سے مٹی کی دیوار میں سوراخ کیا جاسکتا ہے؟ کیا نیم کی خلال سے کسی چھت میں تم کوئی منفذ پیدا کر سکتے ہو؟ وہ اس کے جواب میں بجز ''نہیں'' بلکہ ناممکن کے اور کیا کہے گا؟ اس کے بعد اب اسے روئیدگی کی حقیقت کی طرف متوجہ کرتے ہوئے پوچھو کہ بیج سے جو ننھی سی آنکھ برآمد ہوتی ہے، حالانکہ اس میں لوہے کی سختی نہیں، لکڑی کی کرختگی نہیں اور نہ فقط یہ، بلکہ اس میں اس خشک تنکے کی بھی صلابت نہیں، جو ہواؤں میں اڑے پھرتے ہیں، کچھ نہیں، پھر یہ کیا ہے کہ وہ نہ صرف نرم کھیتوں میں، بلکہ گچھ کی سخت زمینوں کو پھوڑ کر، چار چار فٹ، بلکہ بعض دفعہ، دس بارہ اور اس سے بھی زیادہ گہرائیوں سے پھاڑتے چیرتے، زمین کی پشت پر آ کر نمودار ہو جاتی ہیں''۔

ہمیں بتاؤ کہ آخرہ وہ اس کا کیا جواب دے گا اور بجز یزدانی قاہرانہ قدرتوں کے وہ اور کہاں پناہ پاسکتا ہے اور اسی طرح اب کسی غلہ کے بیوپار کرنے والے کو مخاطب بناؤ اور اس سے استفسار کرو کہ ''تم نے اپنے تجارتی اناجوں کو کوٹھوں میں کیوں بند کیا ہے؟''۔ظاہر ہے کہ جواب میں جہاں چوروں، لٹیروں وغیرہ سے بچانے کا ذکر کرے گا، ساتھ ہی کہے گا کہ اگر ایسا نہ کریں تو اس پر مینہ برسیں گے، وہ بھیگ جائینگے، جس کے بعد غلہ سڑ گل کر خراب ہو جاتا ہے، حتی کہ اس کام کا بھی نہیں رہتا کہ اسے جانور کھاسکیں۔

آہ! کہ اس سے تم اسی جگہ کیوں نہیں پوچھ لیتے کہ کھیتوں میں تو ان دانوں پر آئے دن لاکھوں من پانی گذر جاتا ہے، مگر وہاں بجائے سڑنے کے ہرے، بجائے بگڑنے کے شاداب ہو جاتے ہیں، بجائے بدبو ہونے کے اپنے اندر سے دل و جان کو معطر کرنے والوں پھولوں کو لے کر برآمد ہوتے ہیں۔

میں جانتا ہوں کہ اس بنئے کا دماغ اگر فلسفیوں کے شکوک وشبہات کی طلسم پردازوں

سے آزاد ہوگا، تو یقیناً اس واقعی تفرقہ کو مشتیہ الہیہ کی طرف منسوب کرنے میں اپنے کو مجبور پائے گا اور پھر یہی نہیں تم ان جماعتوں کے ہر فرد فرد کو ان کے مناسب امثلہ میں صرف ان دو لفظوں ''فلق الحب والنوی'' کے ذریعے سے مسئلہ واجب کو دل نشین کر سکتے ہو اور یہ کوئی مشکل نہیں، اگر تم میں تھوڑا سا بھی استدلال کا سلیقہ ہے۔ اس وقت میں بخوفِ طوالت اس سے اعراض کرتا ہوا اس منکر و جبار طائفے کی طرف اب متوجہ ہوتا ہوں، جو ان بیانات کو سن کر پیہم صدائے، مغالطہ، دھوکہ، فریب سے دوسروں کو گمراہ کر رہی ہے۔ میرے ہر حملہ پر ان کا مستہزانہ قہقہہ نہیں رکتا، اسے غصہ آرہا ہے کہ ان نادان جماعتوں میں کس دیدہ دلیری کے ساتھ کام کر رہا ہوں۔

بہتر تو اب ان عقل کے بدمستوں کو بھی بلاؤ، جو اپنی دماغی مجلسوں میں، خدا و پیغمبر، صلوات اللہ علیہم اجمعین، ملائک وقدوسیوں کی دھجیاں اُڑاتے ہیں۔

موجودات کی مفصلہ بالا نیرنگیوں کو ایک نا قابل اعتبار چیز ''طبیعت'' کی طرف منسوب کر کے مطمئن بیٹھے ہوئے ہیں۔ میرے تمام گذشتہ سوالوں کے جواب میں ''نیچر'' بول کر یوں سمجھ رہے ہیں کہ ''ہم نے خدا کے تسلیم کی ضرورت اڑادی کہ جو کام خدا سے لیا جاسکتا ہے، وہ طبیعت کے ذریعے سے انجام پاسکتے ہیں'' مگر تمہیں بھی کوئی ضرورت نہیں کہ ان کی ان شغلانہ، زفرات سے ڈر جاؤ، بلکہ ''فلسفہ طبیعت'' کے متعلق ان سے ایک سوال کرو، پھر دیکھو کہ کیا ہوتا ہے۔ پوچھو! کہ ''کیا طبیعت دو متضاد چیزوں کی علت بن سکتی ہے، کیا جو دوا خشکی پیدا کرتی ہے، وہی ''دوا'' بغیر کسی دوسری چیز کے ملائے ہوئے ایک ہی محل، ایک ہی وقت، ایک ہی آن میں رطوبت بھی پیدا کر سکتی ہے؟ کیا آگ اگر جلاتی ہے، تو وہ ٹھنڈک بھی پہنچا سکتی ہے؟ کیا ڈھیلا، طبیعی میل سے اگر اوپر جاتا ہے، تو واسی میل کی وجہ سے نیچے بھی آسکتا ہے؟''۔

یقین کرو کہ وہ ان تمام سوالوں کے جواب نفی میں دینے پر مجبور ہوں گے، علاوہ اس کے کہ وہ خود اس کی تصریح کرتے ہیں، عقل کا مقتضی بھی یہی تھا کہ ایسا کبھی نہیں ہوسکتا کہ ایک ہی چیز سے ایک ہی وقت میں ایک ہی مقام پر دو متضاد امور طبعی طور سے صادر ہوں۔

پس اب تم کسی پودے کی طرف اشارہ کرو، جو بیج سے باہر نکل کر لہلہا رہا ہے کہ اگر اس

کی شاخوں کو بیج کے اندر سے باہر پھینکنے والی طاقت طبیعت ہے، تو یقیناً وہی طبیعت اس کی شاخ کو زمین کے اندر نہیں لے جاسکتی کہ یہ دونوں متضاد فعل ہیں، حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ہی بیج سے، ایک ہی وقت، ایک ہی ہوا، ایک ہی پانی، ایک ہی زمین میں دو شاخیں برآمد ہوتی ہیں، جن میں ایک آسمان کی طرف رخ کرتے ہوئے اوپر کی جانب چڑھتی جارہی ہیں، جس کا نام تم نے ''پھلنگ'' اور ''ٹہنی'' رکھا ہے اور دوسری بالکل جہت مخالف (تحت الثریٰ) کی طرف منہ کئے ہوئے، زمین میں دھنستی جارہی ہے، جسے تم ''جڑ'' اور ''بیخ'' کہتے ہو۔

پھر کیا ''فلسفۂ طبیعت'' کے مسلمہ اصول کی بناء پر اسے تم اب بھی طبیعت کی طرف منسوب کرسکتے ہو؟ مجھے یقین ہے کہ اس سوال کے بعد جو آواز میرے کان تک پہنچے گی، وہ:

فبهت الذى كفر

''جس نے خدا کا انکار کیا تھا، وہ مبہوت ہو کر رہ گیا''۔

کے علاوہ انشاء اللہ کچھ نہیں ہوسکتی۔

اور یہی وہ مقام ہے جہاں میرا یہ دعویٰ کہ قرآنی دلائل، اپنے پہلوؤں کے اعتبار سے، جس طرح ایک دہقانی کو تشفی بخش سکتے ہیں، بجنسہ وہ ایک دنیا کے مسلَّم عندالکل فیلسوف کو بھی اپنے دعاوی کے تسلیم پر مجبور کرسکتے ہیں اور یہی احاطہ کاملہ اور افادہ عامہ اس کی وہ انوکھی ادا ہے، جسے دیکھ دیکھ کر میں جھوم جاتا ہوں اور بے ساختہ خواجہ شیراز کا یہ شعر

شیوۂ حور و پری خوب ولطیف است ولے

خوبی آنست و لطافت کو فلانے دارد

زبان پر جاری ہوجاتا ہے۔ هذا والسلام على من اتبع الهدىٰ

ذنابہ

زمانہ نے فرصت دی، تو کبھی کبھی انشاء اللہ اپنے ناظرین کے سامنے قرآن کے اور دوسرے دلائل پر اسی طرز سے اور بھی کچھ لکھوں گا، صرف آپ لوگوں سے اس کا ملتجی ہوں کہ میرے لئے دعاء فرمائیں کہ رب غفار میرے معاصی، ذنوب سے درگذر فرمائے اور مجھ میں

قوت پیدا کرے کہ اس کی دین کی تائید سے کبھی نہ گھبراؤں۔ (واللہ علیٰ مایشاء قدیر) ایک بندے کے لیے اس سے زیادہ اور کوئی اہم فرض نہیں کہ اپنی تمام مسرتوں کو مالک کی مرضی میں جذب کردے۔

طالع اگر مدد کند امنش آورم بکف
گر بکشد زہے طرب، گر نہ کشد زہے شرف

وھا عبدہ العاصی محمد مناظر احسن (گیلانی)
غفر اللّٰہ لہ ولمن رباہ

بحوالہ القاسم دیوبند

تدوین حدیث

احادیث نبوی (علی صاحبہا الف سلام وتحیۃ) کی باقاعدہ تدوین کا کام کب اور کس نے شروع کیا؟ اس سلسلے میں کتبِ تاریخ اور حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ تدوین حدیث کا باقاعدگی سے کام دولت بنوامیہ کے خلیفۂ عادل حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ (۹۹ھ تا ۱۰۱ھ) کے عہد میں ہوا۔

حدیث کے ساتھ آثار صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین کو جمع کیا گیا۔

تدوین کا کام سب سے پہلے مدینہ منورہ میں محمد بن مسلم شہاب زہریؒ کے ہاتھوں میں ہوا۔

تدوین حدیث کی ابتدا کے سلسلے میں امام زہریؒ کے علاوہ امام مکحولؒ، امام شعبیؒ اور امام ابوبکر بن حزمؒ کے نام بھی قابلِ ذکر ہیں۔

شروع میں تدوین حدیث کی غرض صرف حفاظتِ احادیث تھی، لہٰذا ان کو کسی عنوان کے تحت نہیں، بلکہ جتنا ذخیرہ مل جاتا تھا، خواہ ان میں غلط احادیث ہی نہ ہو، جمع کرلیا جاتا تھا۔

احادیث کو مختلف فقہی ابواب میں جمع کرنے کا کام امام شافعیؒ (کوفہ) نے شروع کیا، لیکن امام شعبیؒ کے اس کام کی نوعیت صرف نمونے کی تھی، کیونکہ انہوں نے صرف باب طلاق سے متعلق احادیث کو جمع کیا تھا۔

چنانچہ اس کام کو حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے پورا کیا، آپ نے احکام کے متعلق احادیث وآثار صحابہ رضی اللہ عنہم میں صحیح اور معمولی روایات کا انتخاب کیا اور ایک مستقل تصنیف مسمیٰ بہ "کتاب الآثار" امت کے لئے چھوڑی۔ یہ احادیث صحیحہ کی قدیم ترین کتاب ہے، جو ابواب فقہیہ پر مرتب ومدوّن ہے اور جس میں صرف انہی احادیث و آثار اور فتاویٰ نے جگہ پائی ہے، جن کی روایت ثقافت واتقیاءِ امت میں برابر چلی آتی تھی اور امام ابوحنیفہؒ کے اس معیارِ صحت پر پوری تھیں، جو باتفاق محدثین بخاری ومسلم کے معیار سے بھی زیادہ سخت ہے۔ کتاب الآثار کے بعد حدیث کا دوسرا مجموعہ "موطا" امام مالک بن

انس ؒ ہے، جو اہل مدینہ کی روایات کا بہترین انتخاب ہے۔

مختصر یہ کہ ابھی دوسری صدی ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ یہ سلسلہ تدوین عالم اسلام کے علمی مراکز میں پورے احترام و اہتمام سے شروع ہو گیا تھا۔ اس زمانے کے مشہور محدثین میں ابن جریج ؒ (مکہ) ابن اسحاق ؒ اور امام مالک ؒ (مدینہ) ربیعہ بن صبیح ؒ، حماد بن مسلم ؒ، سعید بن ابی عروبہ ؒ (بصرہ) سفیان ثوری ؒ (کوفہ) امام اوزاعی ؒ (شام) ابن المبارک ؒ (خراسان) وغیرہ کے نام بہت مشہور ہیں۔ تیسری صدی ہجری میں تدوین حدیث کا انداز بدل گیا، علم حدیث کو ترقی ہوئی، اب تمام ذخیرے کو یکجا کرنے کے بجائے ایک صحابی، یا شیخ کی روایات کو ایک کتاب میں جمع کر لیتے تھے، جس کو اصطلاح میں ''مسند'' کہتے تھے۔ اس دور کو ''مسانید کا دور'' کہا جاتا ہے۔ مشہور مسند نویسوں میں عبید اللہ بن موسیٰ (کوفی) سدو بصری، اسد و ابن موسیٰ اور نعیم ابن حماد گزرے ہیں۔

اس عہد میں تدوین حدیث کا مقصد حفاظتِ حدیث تھا، صحیح اور غیر صحیح کی فکر کا وقت ابھی نہیں آیا تھا، اس لیے ہر صحابی اور شیخ کی جتنی بھی روایتیں ملتیں، ان کو صحت کی پرواہ کئے بغیر یکجا کر دیا جاتا، تاکہ فراہم شدہ احادیث میں سے کوئی تلف نہ ہو جائے۔ یہ سلسلہ جاری تھا کہ امام بخاری ؒ (۲۵۶ھ) کا دور شروع ہوا۔ انہوں نے صحیح حدیث کو غیر صحیح حدیث سے اور احادیث کو آثار سے جدا کرنے کا کام شروع کیا اور اصول تنقید اور قواعدِ جرح وتنقید کے مطابق روایات کی جانچ پڑتال کر کے صحیح روایات کا فیصلہ کیا اور اپنی کتاب کو مرتّب کیا۔ اس کے بعد امام مسلم ؒ نے ان کی تقلید کرتے ہوئے صحیح مسلم کو مرتّب کیا۔ اس طرح یہ دونوں کتابیں امت میں ''صحیحین'' کے نام سے مشہور ہیں۔ بعد میں اسی نہج پر امام ترمذی ؒ نے جامع ترمذی، امام دواؤد ؒ نے سنن ابی داؤد، امام نسائی ؒ نے سنن نسائی اور ابن ماجہ ؒ نے سنن ابن ماجہ مرتب کیں۔ ان محدثین نے اپنی اپنی کتابوں میں فرق مراتب کو ملحوظ رکھا، ان کتابوں کی تصنیف کا نتیجہ یہ نکلا کہ اب بہ آسانی حدیث کی صحت و قوت اور اس کے درجہ و مرتبہ کا حال اس کتاب کے نام لے دینے سے بھی معلوم ہو جاتا ہے، جس میں اس کی تخریج کی گئی ہے۔

تاریخ تدوین حدیث کے اس اجمالی خاکے کے بعد ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ

محدثین کے سامنے حدیث کے بارے میں صحیح قوی اور ضعیف کا سوال کیوں پیدا ہوا؟ جبکہ سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں ہیں، تو ان میں صحت وعدم صحت کا فرق کس راہ سے آیا؟ اس سوال کا جواب علمِ ''مصطلح الحدیث'' کی ضرورت اور اس کی تدوین کی تاریخ کی نشاندہی کرتا ہے۔ فی الحقیقت بغیر حدیث کے قرآن مجید کو سمجھنا اور اس پر عمل کرنا ممکن نہیں، اس لیے حفاظتِ قرآن کے ساتھ ساتھ تفسیر قرآن، یعنی: حدیث کی حفاظت اور حدیث کو غیر حدیث سے جدا کرنا ضروری ہے اور اس لیے حدیث کی کامل معرفت از بس ضروری ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو معرفتِ حدیث میں ملکہ تام حاصل تھا، اس کے باوجود وہ بہت احتیاط سے کام لیتے تھے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم صرف متواتر ومشہور روایات کو قبول کرتے تھے، یا پھر ایسی خبر آحاد کو، جن کے راوی معتبر ہوتے تھے، خبر احاد میں کسی روایت میں شک ہو جاتا، تو گواہ اور دلیل بھی طلب کرتے۔ یہ ساری احتیاطیں اس لیے کرتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان تھا کہ ''جو کسی قول کو مجھ سے غلط منسوب کرے گا، اس کا ٹھکانہ جہنم ہوگا''۔

غرض یہی وہ مرحلہ ہے جہاں سے علم قواعد مصطلح الحدیث کی بنیاد پڑی۔ خلفاءِ راشدین کے عہد میں حدیث کی چھان بین کے بہت سے واقعات ملتے ہیں، خود ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ''میراثِ جدہ'' کے مسئلے کو حل فرما کر ثبوت وصحت حدیث کے اہتمام کی بنیاد ڈالی کہ غیر معروف مسائل میں احادیث کی تحقیق کرنی چاہئے اور یہ سبق دیا کہ ثبوت حدیث میں زیادہ سے زیادہ صحت وقوت کی جستجو کرنی چاہئے اور حدیث کے ردّ وقبول میں لاپرواہی سے کام نہ لینا چاہئے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی سنتِ صدیقی کی نہ صرف پیروی کرتے ہیں، بلکہ اپنی خاص فطرت کی وجہ سے صحت حدیث کے معاملے میں بہت اشد معلوم ہوتے ہیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی کے طرزِ عمل نے لوگوں کو حدیثوں کے طرق میں کثرتِ رواۃ کی جستجو کا خیال پیدا کیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی نے محدثین کے لئے روایت نقل کرنے میں تثبت کا طریقہ جاری کیا۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا طریقہ بھی مطابق شیخین تھا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ

نے گواہی کے طریقے میں قسم لینے کا طریقے کو رائج کیا، البتہ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ صحابہ کا توقف ضعفِ راوی، یا احتمال کذب کی بناء پر قطعاً نہ تھا، بلکہ محض تثبت اور ضبط فی الحدیث کی سنت قائم کرنے کے لیے یہ اہتمام تھا، اس لیے کہ پہلی صدی ہجری میں جو صحابہ وکبار تابعین کا دور تھا، اس میں ''حارث اعور'' اور ''مختار کذاب'' جیسے اکّا دکّا شخص کو چھوڑ کر کسی ضعیف الروایۃ کا تقریباً وجود نہ تھا، لیکن جب خلیفۂ ثانی حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دور میں فتنہ وفساد کا طوفان شروع ہوا، تو حدیث میں بھی دروغ گوئی کا سلسلہ شروع ہوا۔ بقول ابن حجر سب سے پہلے عبداللہ بن سبا نے حدیث میں جھوٹ بولا اور جب مسلمانوں کے باہمی نزاع کے سبب شیعہ خوارج جیسے فرقے وجود میں آئے، تو خوب حدیثیں گھڑی گئیں اور خلیفۂ چہارم کی شہادت کے وقت یہ فتنہ اپنے عروج پر تھا۔ اس فتنہ سے احادیث نبوی کو محفوظ کرنے کے لیے محدثین ہمہ تن احادیث کی چھان بین میں مصروف ہو گئے اور اپنے حسن ذوق سے نقدِ حدیث کے اصول اختیار کیے گئے، گرچہ یہ اصول مدوّن نہیں ہوئے تھے، مگر اپنے معیار کے اعتبار سے ان کو برتتے تھے اور اس فتنے سے نمٹنے کے لیے اسناد کی پوچھ گچھ شروع ہوئی۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ فتنوں سے پہلے اسناد کی کوئی اہمیت نہ تھی، بلکہ صحابہ رضی اللہ عنہم بھی کبھی اسناد پیش کرتے تھے اور کبھی نہیں، بس التزام نہیں کرتے تھے، لیکن فتنوں کے بعد اسناد کا بیان ہر راوی کے لیے واجب تھا، تا کہ ثقہ اور غیر ثقہ راوی کا پتہ چل جائے اور کذّابین کی قلعی کھل جائے۔

تابعین کے آخری دور میں باقاعدہ جرح وتعدیلِ رواۃ کے قواعد وضوابط مرتب ہونے شروع ہوئے اور چونکہ جرح اور تعدیل اور احادیث کے صحت وضعف کے فیصلہ کا مدار رجال اسناد پر ہے، لہٰذا جب تک راویانِ حدیث کے تاریخی حالات پر بخوبی اطلاع نہ ہو، اسناد کی صحت وضعف کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا، اس لیے محدثین کو تاریخ رجال کی طرف مستقل توجہ کرنی پڑی، جس سے ''اسماء الرجال'' کا عظیم الشان فن مدوّن ہوا، جس کی نظیر دنیا میں نہیں ملتی۔

روزہ اور قرآن

سید مناظر احسن گیلانی

آیئے روزے کے قرآنی مطالبے کو قرآن ہی کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کیجئے۔

تقویٰ اور روزہ

''الصیام'' (یعنی: روزوں) کا مطالبہ سورۃ البقرہ کی آیات (۱۸۳ تا ۱۸۵) میں کیا گیا ہے۔

ان آیات میں بتایا گیا ہے کہ روزہ آدمی میں ''تقویٰ'' کے جذبہ کو ابھارتا اور بیدار کرتا ہے۔اس کے بعد اطلاع دی گئی ہے کہ رمضان ہی کے مہینے میں چونکہ قرآن کے نزول کی ابتدا ہوئی، اس لئے مسلمانوں کو چاہئے کہ اس مہینے کو روزے کے ساتھ گزاریں۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ ''تقویٰ'' کا مطلب کیا ہے، روزے سے اس کا کیا تعلق ہے اور تقویٰ کے جس جذبہ کو روزہ ابھارتا اور جگاتا ہے، انسانی فطرت کے اس جذبہ سے قرآن کا کیا تعلق ہے؟ ایک مثال اپنے سامنے رکھ لیجئے: روشنی سے وہی مستفید ہوسکتا ہے، جس کی بینائی کی قوت آلائشوں سے پاک وصاف ہو۔ اس مثال کے پیش نظر غور کیجئے، قرآن کیا ہے؟ آدمی کی آئینی زندگی کے قدرتی دستور العمل ہی کا نام قرآن ہے۔ اسی طرح تقویٰ جس کا ترجمہ عموماً پرہیز یا ڈر، وغیرہ الفاظ سے کر دیا جاتا ہے، فطرت انسانی کے اس خاص رجحان کی تعبیر ہے، جس نے آدمی کو آئین پسند بنا دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب تک جنون سے کسی کا دماغ ماؤف ہی نہ ہو، ہر شخص یہ محسوس کرتا ہے کہ اعمال وافعال میں ہم مطلق العنان بن کر نہیں پیدا کئے گئے ہیں۔ یعنی: جو جی میں آئے اسے کہہ گزریں، جسے چاہیں مار بیٹھیں، قتل کر دیں، جن کا مال چاہیں اڑا لیں، سڑکوں پر ننگے ہو کر ناچیں، تھرکیں۔ یہ یا اسی قسم کے بہت سے کام کرنے پر ہم آمادہ ہو جائیں، تو انہیں کر تو سکتے ہیں، لیکن اندر کی آواز ہمیں ٹوکتی ہے اور حدود میں رہنے کا تقاضا کرتی ہے۔ کچھ کام ایسے ہیں جو کئے جائیں اور

کچھ ایسے بھی ہیں جو نہ کئے جائیں، یہ تقسیم ہمارے اعمال وافعال کی سچ سے پوچھیئے، تو تقویٰ ہی کے فطری جذبہ کی پیداور ہے۔

کون کون سے کام کرنے کے ہیں اور کون سے نہ کرنے کے تفصیلات میں تو اختلاف ممکن ہے، لیکن ان دو حصوں میں اعمال کی تقسیم، انسان کا فطری احساس ہے۔ کسی شخص کے متعلق جوں ہی پتا چلتا ہے کہ اعمال وافعال کی حد بندی کے تقاضوں سے آزاد ہو گیا ہے، اس کے پاگل ہو جانے کا اعلان کر دیا جاتا ہے۔ اگر تقویٰ کی واقعی حقیقت یہی ہے جو عرض کی گئی، تو پھر کتنی آسانی کے ساتھ یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ قرآن کو، یعنی: آئینی زندگی کے قدرتی دستور العمل کو سپرد کرتے ہوئے تقویٰ کے احساس کو چونکانے والے اور جگانے والے عمل، یعنی: روزے کی پابندی کا بھی ٹھیک اسی مہینے میں کیوں مکلّف بنایا گیا، جس میں قرآن کے نزول کی ابتدا ہوئی۔ آئین ودستور کی پابندی کا مطالبہ باہر سے جن پر پیش ہو رہا تھا، ضرورت تھی کہ ان کے اندر بھی احساس اور جذبے کے اجاگر کرنے کا حکم کیا جائے، جس پر آدمی کی آئینی زندگی کا دارومدار ہے۔

یہ ہے ''تقویٰ'' اور ''قرآن'' میں تعلق، گویا آئین کے ساتھ آئین پسندی کے جذبے کو بھی بیدار رکھنے کا بندوبست کیا گیا ہے۔ اب رہی یہ بات کہ آدمی میں آئین پسندی، یعنی: تقویٰ کا جو جذبہ فطرتاً پایا جاتا ہے، اس کے ابھارنے اور اس کو تروتازہ رکھنے میں روزہ سے کیوں مدد ملتی ہے؟ اس کی وجہ بھی ظاہر ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ چوبیس گھنٹوں میں بار بار جس چیز کی ضرورت آدمی کو ہوتی ہو، روز مرہ کی اسی ضرورت سے اچانک دست بردار ہو جانے پر آمادہ ہونے کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ آئینی حدود کے اندر اپنے آپ کو روکے رکھنے کی پوری قوت اس کے اندر پائی جاتی ہے۔ سال کے گیارہ مہینوں میں جو کھا رہا تھا، پی رہا تھا، جنسی تقاضوں کی تکمیل پر جس کے کسی قسم کی روک ٹوک نہ تھی، وہی بارھویں مہینے میں اس امتحان میں کامیاب ہو کر نکلتا ہے کہ ساری چیزیں، جن کا گیارہ مہینوں میں عادی تھا، ان کو چھوڑ بیٹھا۔ آئینی جذبے کی مشق کی اس سے زیادہ بہتر صورت اور کیا ہو سکتی تھی۔

اب پڑھیئے روزہ والی آیتوں کو۔ انصاف سے بتایا جائے کہ خود قرآن نے روزہ کے

قانون کو نافذ کرتے ہوئے جو کچھ اس کے متعلق بیان کیا ہے، دل آویزی اور دل نشینی کی جتنی غیر معمولی خنکی اس میں پائی جاتی ہے، کیا عقل کے ناخن تراشوں کی تاویلوں میں اس کے بعد کچھ بھی جان رہ جاتی ہے؟ اور یہی میں کہنا چاہتا ہوں کہ روزہ اور اس کے اسرار و حکم اور وجوہ و مصالح کے سمجھنے کے لیے بجائے قرآن کے غیر قرآنی راہوں سے مدد لینے کی قطعاً حاجت نہیں۔

دوسرے مذاہب سے تعلق

روزے کے مطالبے کو مسلمانوں پر عائد کرتے ہوئے گذشتہ ادیان و مذاہب کو ماننے والی امتوں کے ساتھ اپنے تاریخی رشتہ کا اعادہ ''**کما کتب علی الذین من قبلکم**'' کے الفاظ میں فرمایا گیا ہے۔

اس سے مسلمانوں میں یہ نفسیاتی اثر پیدا ہوتا ہے کہ اس حکم الٰہی کا بار اٹھانے میں وہ تنہا نہیں ہیں، بلکہ جو انسانی نسلیں ان سے پہلے گزری ہیں، وہ بھی اس میں ان کی شریک ہیں۔ اسی سے خود بخود یہ بھی مجھ میں آجاتا ہے کہ روزے کا مطالبہ کوئی ایسا مطالبہ ہے بھی نہیں، جسے بار سمجھا جائے۔ آخر جس کام کو تاریخ کے نامعلوم زمانے سے انسانیت برداشت کرتی چلی آئی ہے، اس کو بار اور بوجھ قرار دینے کے معنی ہی کیا ہو سکتے ہیں، گویا برداشت کے لحاظ سے یہ تجربہ کیا ہوا، جانچا اور پرکھا ہوا عمل ہے، سمجھا جائے، تو یہ اشارہ بھی قرآن کے الفاظ سے ہمیں مل سکتا ہے۔

اسی کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح حیوانی ضرورتوں کے لیے حرارت، روشنی، ہوا، پانی وغیرہ جیسی قدرتی امدادوں کا آدمی ہر زمانے میں ہر جگہ محتاج رہا ہے، یہی نوعیت قدرت کے ان قوانین کی بھی ہے، جن کی پابندی کے بغیر انسان انسان نہیں رہ سکتا۔ یہ جو فرمایا گیا ہے کہ ''اگلوں پر بھی روزہ واجب کیا گیا تھا'' تو اس سے یہ بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ روزہ بھی قدرت کے ان ہی قوانین میں شریک ہے، جن سے نہ اگلے بے نیاز ہو کر رہ سکتے تھے اور نہ پچھلے اس سے مستغنی ہو سکتے ہیں۔

یورپ و امریکہ کے علمی حلقوں میں آج کل مذاہب و ادیان کی تنقید و تحقیق کے سلسلے

میں تقابلی مطالعے کو سب سے زیادہ "عالمانہ طریقہ" سمجھا جاتا ہے۔ پہلے تو مذہبی پیشہ وروں، یعنی: پادریوں نے اس کام کو شروع کیا تھا، بعد کو ان ہی پادریوں کی اولاد دوسرے علمی القاب اور خطاب کے ساتھ اسی کام کو ریسرچ اور تحقیق کے نام سے انجام دینے لگی۔ باور یہی کرایا جاتا ہے کہ تنقید و تحقیق کی ان راہوں میں کسی خاص مذہب، یا دین کی پاسداری ،خیانت اور علمی بددیانتی سمجھی جائے گی، لیکن سارے پاپڑ دراصل کسی خاص مذہب کی تائید و حمایت ہی کے لئے بیلے جاتے ہیں۔

اس تقابلی مطالعہ میں مختلف ادیان و مذاہب اور ان کے پیش کرنے والے بزرگوں کی تحقیر و تنقیص سے دامن ضرور آلودہ ہوتا ہے۔ تحقیر و تنقیص کے ان قصّوں سے دلوں کو جو دکھ پہنچ جاتا ہے، یا پہنچایا جاتا ہے، دل آزاری کی جو آندھیاں چل پڑتی ہیں، ان کا رکنا روکنا، ناممکن ہوتا ہے۔ اس بات میں غیروں سے نہ مجھے شکایت ہے اور نہ شکایت کا حق حاصل ہے، مگر مسلمانوں میں بھی دیکھ رہا ہوں کہ دعوت و تبلیغ کے قرآنی منہجِ خاص سے لاپروا ہو کر کچھ لوگ کچھ دنوں سے ان ہی باتوں کی حوصلہ افزائیوں میں مشغول ہیں،، جن سے تقابلی مطالعے اور اس طریقے کے سارے مفاسد اور زہریلے فتنوں کی نشو نما میں مدد مل رہی ہے۔ دیکھتا ہوں اور دل ہی دل میں گھٹتا ہوں، کڑھتا ہوں۔ قرآن سکھاتا ہے کہ بنی آدم کی جن جن نسلوں کو مسلمانوں سے پہلے اپنے اپنے وقت میں انسانی زندگی کے قدرتی دستور العمل کا مخاطب و مکلّف خالق کائنات نے بنایا تھا، ان سب سے مسلمانوں کا تاریخی رشتہ تکذیب و تغلیط اور تحقیر و توہین کا نہیں، قطعاً نہیں، بلکہ تصدیق و توثیق کا ہے۔ ایک ہی دیوانِ عشق کے ہم سبق، ہم سب کے سب ہیں، ایک ہی لاہوتی کالج سب کی تعلیم گاہ ہے، حقیقی معلم اور واقعی استاد بھی سب کا ایک ہی ہے اور بجز معمولی ردّ و بدل کے اصولاً تعلیمی نصاب بھی اگلوں اور پچھلوں کا اول سے آخر تک ایک ہی رہا ہے۔

قرآن نے اپنے ماننے والوں کی ذہنی تربیت ہی کچھ ایسے ڈھنگ سے کی ہے کہ ہمارے پیشوا تمہارے پیشوا، ہمارے دینی بزرگ، تمہارے دین بزرگ.....! یہ ہم تم کا سوال ہی، مذہب اور دین کے دائرے میں ان کی نگاہوں کے سامنے سے ہٹ گیا ہے۔ اسی تربیت کا نتیجہ ہے کہ مسلمان دنیا کے مذہبی پیشواؤں اور بزرگوں کا جب ذکر کرتے ہیں، تو

سننے والا یہ تمیز نہیں کرسکتا کہ خود اپنے گھر کے بزرگوں کا ذکر کر رہے ہیں، یا ان لوگوں کا جن کو یہودی اپنا پیغمبر، یا عیسائی اپنے دین کی سب سے بڑی ہستی تسلیم کرتے ہیں۔ دراصل گھر اور باہر کے اس فرق کو مسلمانوں کا دینی احساس پہچانتا ہی نہیں ہے۔

مسلمانوں پر روزے کو عائد کرتے ہوئے بجائے یہ فرمانے کے کہ مسلمانوں کے دین کا یہ کوئی امتیازی سرمایہ ہے، قرآن نے صاف لفظوں میں یہ اطلاع دی ہے کہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، بلکہ پہلے بھی لوگ اسی کی پابندی کرتے چلے آتے ہیں۔ قرآن اگر یہ کہتا ہے کہ بچھڑے ہوؤں کو ملانا اور اپنے بزرگوں کی راہ سے جو ہٹ گئے ہیں، اسی راہ پر ان کو واپس لانا، یہ بھی اس کا اسی نصب العین ہے، تو روزہ کے بارے میں اس بیان کی تعبیر اور کیا کی جائے۔ میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ دین کی دعوت میں لوگ دل آزاری کی راہوں کو چھوڑ کر قرآنی راستے پر اگر چلتے، تو جن قوموں کی اسلام سے محرومی کی مدت دراز سے دراز تر ہوتی چلی جارہی ہے، بہت مختصر ہو جاتی ہے۔

ضرورت ہے کہ تصدق وتوثیق کے رشتے کے ساتھ ساتھ لوگوں کو سمجھایا جائے کہ گذشتہ ادیان و مذاہب کے جن پہلوؤں کی تصحیح، یا تکمیل کا کام قرآن نے انجام دیا ہے، اس کا صحیح مطلب کیا ہے؟ اسی موقع پر دیکھئے، رمضان ہی کے مہینے کو روزے کے لیے متعین کرتے ہوئے نزولِ قرآن کے ذکر میں، یہ فرما کر کہ نسل انسانی کی ہدایت کا سرچشمہ یہ کتاب ہے، آگے اسی کی خصوصیت کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا گیا ہے: ''بینات من الھدی والفرقان''۔ ''ہدایت کی کھلی کھلی باتوں پر (قرآن مشتمل ہے) اور الفرقان بھی ہے''۔ مطلب یہی ہے کہ مذاہب وادیان کے بینات، یعنی: واضح اور کھلے کھلے حقائق جنہیں عام طور پر لوگ جانتے ہیں، ان کے سوا قرآن ''الفرقان'' بھی ہے، یعنی: بیرونی آمیزشوں اور خارجی آلائشوں کو تمام مذاہب وادیان سے جدا کرنا، سب کو پاک وصاف کرنا، یہ بھی قرآن ہی کا ایک پہلو ہے۔ اس لیے رمضان، یا نزول قرآن کا مہینہ ان لوگوں کا بھی دینی مہینہ ہے، جن کے پاس پہلے سے ہدایت کے بینات نہ تھے اور جن کے پاس کسی نہ کسی شکل میں ہدایت کے یہ بینات باقی رہ گئے تھے، ان کے لئے یہی رمضان اس لیے دینی مہینہ بن گیا کہ قرآن کے فرقانی پہلو سے استفادے کا موقعہ ان کو بھی ملا۔ یوں رمضان

ساری انسانی نسلوں، خاندانوں اور قبیلوں کا دینی مہینہ بن جاتا ہے۔

بہر حال مجھے کہنا یہی ہے کہ قرآن جیسی خود مکتفی کتاب کی اشاعت و تبلیغ کے لیے یا اس کی تعلیمات کی توجیہ و تاویل کے لیے غیر قرآنی ذرائع کی دست نگری کا نتیجہ یہ ہے کہ قرآن آگے تو کیا بڑھتا، خطرہ پیدا ہو گیا ہے کہ کہیں (لا فعلہ اللہ) اس کا دائرہ گھٹ نہ جائے، اگرچہ یہ خطرہ بھی صرف دلوں کے ایک وسواسی خطرے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔

روزہ میں یسر

روزے کے متعلق یہ طریقۂ تعبیر اختیار کیا گیا ہے کہ پہلے تو ایام معدودات، یعنی: چند گنے چنے دن روزہ فرض ہوا اور بعد کو پھر رمضان کا مہینہ مقرر کر دیا گیا۔ یہ دونوں حصے ایک دوسرے سے جدا سمجھے جاتے ہیں، لیکن مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ دونوں دو مستقل مطالبے نہیں ہیں، رمضان ہی کے مہینے کو روزے کے حکم کی تعمیل کا مہینہ مقرر کرنا مقصود تھا، لیکن اسی مقصد کو پہلے عام الفاظ میں ادا کیا گیا، یعنی: بڑی مدت روزے کے لیے نہیں، بلکہ چند گنے چنے دن کی حد تک اس عمل میں مسلمانوں کو مشغول ہونا پڑے گا، پھر ان ہی گنے چنے دنوں کی تفصیل یہ کی گئی کہ وہ ''رمضان کا مہینہ'' ہے۔ یہ یسر کی وضاحت ہے۔

روزہ کی یہ حقیقت قابل غور ہے کہ سب سے زیادہ آدمی جن چیزوں کا عادی ہوتا ہے، روزے کی وجہ سے اپنی اسی دوامی عادت سے دست برداری کی مشق پیدا ہوتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دین ہو، یا دنیا، زندگی کے تمام شعبوں میں اس مشق سے یہ مدد ملتی ہے کہ عادت کے خلاف کسی قسم کے مشکلات سے دوچار ہونے کا موقعہ سامنے آجائے، تو روزے کی مشق ان مشکلات کو قدرتاً روزہ رکھنے والوں کے لئے آسان بنا دیتی ہے، اس لیے یہ فرماتے ہوئے کہ جن رعایتوں اور جن شروط کے ساتھ روزہ کا مطالبہ واجب کیا گیا ہے، ان ہی کو دیکھ کر تم یہ سمجھ سکتے ہو کہ مشقت اور دشواری میں مبتلا کرنے کا ارادہ نہیں کیا گیا ہے، بلکہ اس کے مقابلے میں روزے کی مشق سے زندگی کے عام عادی مشکلات میں مدد ملتی ہے، خصوصاً قمری مہینے کی وجہ سے ہر موسم اور سال کے ہر حال میں روزہ رکھنے کی عادت سہولت کے دائرے میں جس وسعت کو پیدا کرتی ہے اور مشقت کی برداشت کی قوت کو بڑھاتی ہے، اس

کو دیکھتے ہوئے یہی کہا جا سکتا ہے کہ روزے سے آسانی پیدا کرنے کا ارادہ کیا گیا ہے۔

شکر اور وفاقی تعلق

انسانیت ہدایت کے جس نظام کی پابندی کر کے اپنے صحیح انجام تک پہنچ سکتی ہے، یقیناً اس کا علم ساری انسانی نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت ہے۔ روزہ اس غیر معمولی، انمول نعمت سے سرفراز فرمانے والے کی بڑائی کے اقرار کی بہترین عملی شکل ہے کہ آدمی سب سے زیادہ جن چیزوں کا رسیا اور عادی ہے، ہر ایک کو ٹھکرا کر اس بڑے کے حکم کی تعمیل کیلئے کھڑا ہو جاتا ہے، ''تا کہ بڑائی کرو اللہ کی اس نعمت کے مقابلہ میں کہ تمہاری رہنمائی اس نے کی''۔

سچ تو یہ ہے کہ زندگی بھر جو ہمیں کھلاتا پلاتا رہتا ہے اور طرح طرح کی نعمتوں سے نوازتا ہے، آدمی کا جی چاہتا ہے کہ اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرے۔ کوئی شک نہیں کہ شکر اور گن گانے کی صورتیں یہ بھی ہیں کہ زبان سے شکر کے الفاظ ادا ہوتے ہوں، یا دل میں تشکر و امتنان کے جذبات پیدا ہوں، لیکن کھلانے پلانے والے کے شکر کی یہ شکل..... جتنی دیر کے لیے کھانا چھوڑ دینے کا حکم کھلانے والے، پلانے والے نے دیا، اتنی دیر کے لیے ہم اس کو چھوڑ بیٹھیں..... حق تو یہ ہے کہ زبان اور دل والے شکریوں سے شکر کا یہ عملی قالب خود شکر کرنے والوں ہی کے لیے زیادہ اطمینان بخش ہے، اس کی طرف آخر میں ''تا کہ تم شکر ادا کرو'' کے الفاظ سے اشارہ فرمایا گیا تھا۔

''جب تجھ سے پوچھیں میرے بندے میرے متعلق، تو میں قریب ہوں، جواب دیتا ہوں پکارنے والے کی پکار کا''۔ اس آیت سے پہلے بھی روزے کا ذکر ہے اور اس کے بعد بھی۔ بیچ میں اس آیت کا ہونا یقیناً بلا وجہ نہیں ہو سکتا۔ بظاہر یہی خیال گزرتا ہے کہ حق تعالیٰ کے حکم کے مطابق جب بندہ پسندیدہ عادتوں سے دستبردار ہو کر اپنے پیدا کرنے والے کی خوشی اور اسی کی مرضی کے مطابق اپنی خوشی اور اپنی مرضی کو بنا دیتا ہے، تو روزہ کے زمانہ میں روزہ دار کا خالق کائنات کے ساتھ اس وفاقی تعلق کو قرآن بتانا چاہتا ہے، معمولی حال نہ سمجھنا۔ منطقی طور پر یوں ترتیب قائم کی جائے کہ ساری کائنات حق تعالیٰ کی مرضی مبارک کے مطابق چل رہی ہے، انسان جب اسی عالمگیر مرضی کے مطابق اپنے آپ کو کر لیتا ہے، تو

اس خاص حال میں عالم کا ہر قانون انسان کی مرضی کی مطابقت کے لیے ہو جاتا ہے، یعنی: اس کی ہر دعا کو حق تعالیٰ قبول فرماتے ہیں۔ آپ ہی بتایئے اس کے سوا دوسری توقع ہی کیا کی جاسکتی ہے؟ (ماہنامہ الاشرف کراچی)

بیت اللہ مرکز ارضی تجلی گاہ ربانی

مرکز ارضی

کثرتوں کا ارتکازی مجموعہ خواہ چھوٹا ہو، یا بڑا، ہاتھی کا کوہ پیکر جثہ ہو، یا برگد کے پھلوں کا خشخاشی تخم، ہر ایک میں ان کے بکھرے ہوئے اجزا کی پیوستگی اور باہمی ارتباط کو قائم رکھنے کے لیے بھی اور اپنے اپنے نوعی کمالات کو نشو ونما اور ارتقا کے آخری مقام تک پہنچانے کے لیے بھی ایک مرکزی نقطہ پایا جاتا ہے۔ اس مرکزی نقطہ کے وجود کو اگر اس سے نکال لیا جائے، تو ایک طرف سارے سمٹے ہوئے اجزا بکھر جائیں گے اور دوسری طرف بیرونی فیوض کو جذب کر کے ارتقا و نشو ونما کے جس عمل کو یہ مرکزی نقطہ جاری رکھے ہوئے تھا، وہ عمل بھی رک جائے گا۔

میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں، اس کو مثال سے سمجھئے، آم کی گٹھلی، یا اس قسم کے پھلوں کے تخم کو آپ نے دیکھا ہوگا، آم کا درخت اسی گٹھلی سے برآمد ہوتا ہے۔ پتے، شاخیں، پھول، پھل کا ایک طوفان ہوتا ہے، جو اسی گٹھلی کی راہ سے اپنی اپنی شکلوں کے ساتھ باہر نکل نکل کر آم کے درخت کا جز بنتا رہتا ہے، لیکن آم کی اسی گٹھلی کو چیریئے، اس میں ایک چیز آپ کو نظر آئے گی، جسے "انکھوا" کہتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ گٹھلی سے اس انکھوے کو نکال لینے کے بعد، خواہ کتنی ہی اچھی، نرم اور پاکیزہ زمین میں اس کو بویا جائے اور چشموں کے کیسے صاف وشفاف پانی سے اس کی آبیاری کی جائے، بجائے اس کے کہ اس گٹھلی سے پودا نکلے، گٹھلی سڑتی چلی جائے گی، تا اینکہ بالآخر سڑ سڑ کر اس کے اجزا مٹی میں مل کر ادھر ادھر غائب ہو جائیں گے۔

حاصل یہی ہے کہ گٹھلیوں کا یہی مرکزی نقطہ، وہ نقطہ ہے کہ دیکھنے میں خواہ کتنا بھی بے

حیثیت اور معمولی چیز نظر آتا ہو، لیکن کسی درخت کے شجری نظام اوراس کے سارے آثار و نتائج کا حصول یقیناً اسی مرکزی نقطہ کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس کو نوچ کر گٹھلی سے اگر الگ کرلیا جائے، تو سارے فیوض جن سے درخت کا تنا، اس کی ڈالیاں، شاخیں، پتے، پھول، پھل مستفید ہوتے رہتے ہیں، ان کا قصہ ہی ختم ہوجائے گا۔

الغرض حیوانی وانسانی اجسام میں جو حیثیت قلب کی ہے اور نباتی حقائق کے لحاظ سے جو اہمیت گٹھلیوں کے اس مرکزی نقطہ کی ہے، دل یہ پوچھتا ہے کہ مٹی کا یہ تودہ، جس کا نام زمین اور دھرتی ہے، جس سے علاوہ عناصر اور معدنی مرکبات کے نباتی، حیوانی، انسانی ہستیوں کی بے پناہ موجیں ابل رہی ہیں، ان ساری پیداواروں کے لیے زمین بھی اپنے اندر کیا کوئی ایسی چیز رکھتی ہے، جسے ارضی فیوض وبرکات کا مرکزی نقطہ ٹھہرایا جائے؟ کیا اس کا بھی کوئی دل ہے، جس سے مختلف ارضی پیداواروں کی رگوں میں نشو ونما اور ارتقا و بقا کا خون دوڑ رہا ہے؟ یا یوں پوچھیے کہ یہ خاکی گٹھلی بھی اپنے اندر کیا کوئی ایسا "انکھوا" رکھتی ہے کہ اسی کے ساتھ ان ساری چیزوں کا قیام وابستہ ہو، جو زمین سے پیدا ہورہی ہیں اور تمام خطرات کا مقابلہ کرتے ہوئے اس خاکی کرّے کی پشت پر نمایاں ہو ہو کر جسدِ ارضی پر اپنے اقتضائی کمالات کو حاصل کرتی چلی جارہی ہیں؟ نہ ماننے والوں سے ابھی بحث نہیں، لیکن جنھوں نے مانا ہے کہ

﴿جعل الله الكعبة البيت الحرام قياماً للناس﴾

(المائدة)

"بنایا اللہ نے کعبہ کو، جو بیت الحرام ہے، سارے انسانوں کے قیام کا ذریعہ"۔

اسی کی خبر ہے جو زمین کا اور زمین میں جو کچھ ہے، سب کا پیدا کرنے والا ہے، بتایئے ان سوالوں کے جواب میں ایک مومن بالقرآن کی نظر "کعبہ" کے سوا کیا کسی دوسری چیز پر پڑ سکتی ہے......؟

سرچشمۂ فیوض وامن

''وھی الکعبة البیت الحرام ''جس کا تذکرہ کرتے ہوئے جب اسی قرآن میں قیام وبقا سے بھی آگے بڑھ کر

﴿واذجعلنا البیت مثابة للناس وامنا﴾(البقرة)

''اور جب بنایا ہم نے اسی البیت (گھر) کو انسانوں کیلیے مثابہ اور امن (کا ذریعہ) کی بھی تصریح کردی گئی ہے۔

مثابہ کی لغوی واصطلاحی تشریح کرتے ہوئے علامہ راغب اصفہانیؒ اپنے ''مفردات'' میں لکھتے ہیں: ''پینے والوں کے لیے کنویں کے منہ پر جو جگہ ہوتی ہے، اسی کو ''مثابہ'' کہتے ہیں''۔ اب سوچئے کہ مثابہ ہونے کی یہی حیثیت جب الکعبہ کو حاصل ہے، تو اس کا حاصل اس کے سوا اور کیا ہوا کہ سارے فیوض وبرکات جو زمین کے اس کرّے پر تقسیم ہورہے ہیں، ان کے گزرنے کا مرکزی نقطہ یہی الکعبہ ہے۔ اور صرف مثابۃ ہی نہیں، بلکہ اسی آیت کے لفظ ''امناً'' سے بھی یہ معلوم ہورہا ہے کہ امن وامان سارا قدرت نے اسی ''البیت الحرام'' کے ساتھ وابستہ فرمادیا ہے۔

الغرض یہاں جس کسی کو جہاں کہیں جو کچھ بھی مل رہا ہے، اسی الکعبہ کی راہ سے مل رہا ہے۔ یہ قرآن کے نصوص صریحہ کا اقتضا ہے، گویا یوں سمجھنا چاہئے کہ ساری کائنات کے ساتھ العرش کی جو نسبت قرآن نے بیان کی ہے کہ الرحمٰن اسی العرش کو مرکز بنا کر اپنی رحمتیں دنیا میں تقسیم فرمارہا ہے، یہی نسبت زمین کے خاص کرّے کے ساتھ الکعبہ بھی رکھتا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کو خطاب کرکے رب العزت نے جو فرمایا اس سے کہ ''اے آدم! اتارا ہے میں نے تیرے لئے ایک گھر، تو اس گھر کا اسی طرح طواف کرے گا جیسے ''العرش'' کے گرد طواف کیا جاتا ہے اور تو اس گھر کے آگے اسی طرح نماز پڑھے گا، جیسے میرے عرش کے سامنے نماز پڑھی جاتی ہے''۔ (تاریخ الخمیس، ج:۱،ص:۸۹) اور دوسری روایتوں سے بھی اسی کی تصدیق ہوتی ہے کہ کرّہ ارض کا ''قلب'' اور وہ مرکزی نقطہ جس سے سارے برکات وفیوض اس زمین پر بنٹ رہے ہیں، یہی الکعبہ ہے۔

مشہور قرآنی آیت:

﴿ان اول بیت وضع للناس للذی ببکة مبارکا

وھدی للعالمین﴾(آل عمران)

''سب سے پہلا گھر جولوگوں کے لیے بنایا گیا، وہ قطعاوہی ہے جو''مکہ''میں ہے، جو سارے جہانوں کے لیے مبارک بھی ہے اور ان کی ہدایت کا سرچشمہ بھی'' کے بعد تو اس قسم کی روایتوں سے تائید حاصل کرنے کی بھی قطعاضرورت باقی نہیں رہتی۔آخر روایتوں سے یہی تو معلوم ہوتا ہے کہ زمین کے کرّے پر جوسب سے پہلا نقطہ متعین کیا گیا، یہ وہی حصہ ہے جسے''الکعبہ'' کی دیواریں اس وقت تک گھیرے ہوئے ہیں۔ روایتوں پرتو یہ اعتراض ہوسکتا ہے کہ اس واقعہ کا مشاہدہ کرنے والا اس وقت کون موجود تھا؟ لیکن جوقرآن کی خبروں پریقین کرتے ہیں کہ خالق کائنات کی دی ہوئی خبریں ہیں، ان کے لیے تو اس شبہ کی گنجائش بھی باقی نہیں رہتی، کیونکہ یہ تاریخی شہادت تو اسی کی ہے، جواس وقت بھی موجود تھا، جب نہ زمین پھیلائی گئی تھی اور نہ آسمانوں کے خیمے تانے گئے تھے اوراس وقت بھی وہ غائب نہ تھا، جب''الناس''یعنی:نسل انسانی کے لئے یہ سب سے پہلا گھر بنایا جارہا تھا، بلکہ اس واقعہ کی خبر دینے والا ہی وہ ہے، جس نے حد بندی کے اس عمل سے زمین کے اس خاص حصہ کوامتیاز بخشاہے،اس سے بڑھ کریقینی خبراورکس کی ہوسکتی ہے.....؟

یہی نہیں، بلکہ آگے''مبارکاً'' کے لفظ کا مطلب اس کے سوااور کیا ہوسکتا ہے کہ برکتوں کاخزینہ اورفیوض کا حقیقی دفینہ بھی زمین کے اسی حصہ کو بنایا گیا،یہی وہ قدرتی سرچشمہ ہے ،جس کی برکتیں ابل رہی ہیں اوروہیں سے چھلک چھلک کرساری دنیامیں تقسیم ہورہی ہیں۔

یہ میں اس لیے کہہ رہاہوں کہ العالمین،یعنی: سارے جہانوں کے لیے رہنمائی اور ہدایت کا توحیدی نظام جب قائم کیا گیا اورنبوت کوختم کرکے العالمین کی ہدایت کا مرکزی مقام مکہ منتخب ہوا، جیسا کہ''ھدی للعالمین'' کے الفاظ کا اقتضا ہے،تو یہ اتفاقی واقعہ نہ تھا، بلکہ جومقام مادی برکتوں کا سرچشمہ تھا،اسی کو دینی واخلاقی تعلیمات کی اشاعت کا مرکز بھی مقرر کیا گیا۔آخر''للعالمین'' کے لفظ کا تعلق صرف''ھدی''ہی کے لفظ سے کیوں سمجھا جائے،میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ''مبارکاً'' کے لفظ کوبھی للعالمین سے مربوط سمجھنا چاہئے۔

مجھےتو حیرت ہوتی ہے کہ ان صریح نصوص اورواضح بینات کی روشنی میں بھی ام القریٰ، جومکہ کا قرآنی نام ہے،اس کے سمجھنے،یاسمجھانے سے لوگ کیوں گریز کرتے ہیں۔''القریٰ

''کا لفظ یقیناً ایک عام اور مطلق لفظ ہے، ان ساری آبادیوں کو حاوی ہے جو زمین کے کسی گوشہ میں شرقاً وغرباً، شمالاً وجنوباً پہلے پائی گئی ہوں، یا اب پائی جاتی ہوں، یا آئندہ پائی جانے والی ہوں، وہ ایشیا میں ہوں، یا افریقہ میں، امریکہ میں ہوں، یا یورپ میں۔ قرآنی الفاظ کے مستند شارح علامہ راغبؒ نے بھی ''ام القریٰ'' کی یہی تشریح کرتے ہوئے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ ''ساری دنیا اسی کے نیچے سے پھیلائی گئی ہے'' اشارہ اسی برکاتی مرکزیت کی طرف ہے، جسے قرآن میں ''مبارکاً'' کے لفظ سے ادا کیا گیا ہے۔

سب سے پہلا گھر

بجائے مکہ کے اسی آبادی کے دوسرے نام، یا تلفظ، یعنی: ''بکہ'' کے لفظ کو قرآن نے یہاں جو اختیار کیا ہے، یہ بھی میرے خیال سے کوئی اتفاقی بات نہیں ہے۔ نزول قرآن سے صدیوں پہلے الکعبہ کی اسی عالمگیر اہمیت کا انکشاف کرتے ہوئے پیغمبر داؤد علیہ السلام کتاب ''زبور'' میں یہ والہانہ تمہیدی فقرات ارشاد فرماتے ہیں:

''اے لشکروں کے خداوند! تیرے مسکن کیا ہی دلکش ہیں! میری روح خداوند کی یادگار کے لیے آرزومند، بلکہ گداز ہوتی ہے۔ میرا من، میرا تن، زندہ خدا کے لیے للکارتا ہے''۔

پھر اس کی مثال دیتے ہوئے کہ ہر چیز ایک مرکز رکھتی ہے، فرماتے ہیں:

''گوریے نے اپنا گھونسلا اور ابابیل نے بھی اپنا آشیانہ پایا ہے، جہاں وہ اپنے بچے''۔

آخر میں زبور کا یہ مشہور فقرہ ہے کہ:

''مبارک وہ انسان ہیں، جن میں قوت تجھ سے ہے اور ان کے دل میں تیری راہیں ہیں، وہ بکہ کی وادی میں گزر کرتے ہیں اور اسے ایک کنواں بناتے ہیں، پہلی برسات اسے برکتوں سے ڈھانپ لیتی ہے''۔

یہ داؤد علیہ السلام کی کتاب ''زبور'' کے مزبور ۸۱ کے فقرے ہیں۔ اس میں چاہ زمزم ہی کی طرف اشارہ نہیں کیا گیا ہے، بلکہ قرآنی لفظ ''مبارک'' کے مفہوم کو بھی خاص پیرایہ میں ادا

کردیا گیا ہے۔پہلی برسات ''الرحمٰن'' کی پہلی توجہ ہے، جو کرۂ زمین کی آبادی کے لیے کی گئی۔

آج کل زبور کے جو تراجم شائع ہورہے ہیں، ان میں ''بکہ'' کے لفظ کو اپنی اصلی صورت پر باقی نہیں رکھا گیا ہے، لیکن آپ مشہور عیسائی عالم پروفیسر مارگولیوتھ کی جو نسلاً یہودی تھا، یہ شہادت پڑھ سکتے ہیں کہ بجز مکہ معظّمہ کے زبور کا یہ ''بکہ'' اور کوئی دوسرا مقام نہیں ہوسکتا۔ میرا خیال ہے کہ بجائے عام اور مشہور نام ''مکہ'' کے یہ بتاتے ہوئے کہ یہی سب سے پہلا گھر ہے، بکہ کے نام اور تلفظ کو جو اختیار کیا گیا ہے، تو یہ اشارہ غالباً اسی مزبور (۸۱) کی طرف ہے، جس میں داؤد علیہ لاسلام نے بکہ ہی کے لفظ سے اس کو یاد کیا ہے۔ یہ ''الکعبہ'' کی قدامت کے لیے یقیناً ایک اہم تاریخی وثیقہ ہے، موجودہ زمانہ کے حساب سے تین ہزار سال سے کم پرانی شہادت یہ نہیں ہے۔

لیکن داؤد علیہ السلام کا زمانہ تو نسبتاً بعد کا زمانہ ہے، ان سے پہلے انبیا علیہم السلام کی طرف منسوب نوشتے جو بائبل کے موجودہ مجموعہ میں پائے جاتے ہیں، ان میں الکعبہ کے متعلق آپ کو مسلسل تاریخی شہادتیں ملتی چلی جائیں گی۔ تورات کا فقرہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق ہے:

''اس نے بیت ایل کے جنوب کے ایک پہاڑ کے پاس اپنا ڈیرہ قائم کیا۔ ''یم'' (یعنی: سمندر) اس کے مغرب میں، اور ''عی'' اس کے جنوب میں تھا''۔ (تکوین باب ۱۲)۔ تورات کے عالم جانتے ہیں کہ یہ بیت ایل، یعنی: بیت اللہ جس کے جنوب میں ابراہیم علیہ السلام نے اپنا ڈیرا گاڑا تھا، یہ وہی الکعبہ (بیت اللہ الحرام) کا مرکزی نقطہ تھا، جہاں بعد کو حضرت ابراہیم علیہم السلام نے اپنے صاحبزادے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ساتھ گھر اٹھایا تھا۔ ''یم''، یعنی: سمندر کا الکعبہ کے مغربی سمت میں ہونا تو ایک عام کھلی ہوئی حقیقت ہے۔ رہا ''عی'' قدیم جغرافیہ عرب کا مطالعہ اس کے لیے کرنا چاہئے۔

بہر حال اگرچہ بنی اسرائیل کے پیغمبروں کے یہ نوشتے صدیوں سے بگاڑنے اور مشتبہ کرنے کی مسلسل کوششوں کی آماجگاہ بنے ہوئے ہیں، لیکن بچی کھچی جو چیزیں اس وقت تک ان کتابوں میں پائی جاتی ہیں، جن میں کرّہ زمین کے اس مرکزی ''مقام مبارک'' کا تذکرہ کیا گیا ہے، اگر سب کو جمع کیا جائے، تو وہ کافی ضخیم رسالہ بن سکتا ہے۔ ایسا رسالہ جسے

دیکھ کر اضطراراً آدمی اس قرآنی دعویٰ کی، یعنی: ''(اہل کتاب) جانتے ہیں اس ''الکعبہ'' کو اسی طرح جیسے پہچانتے ہیں وہ اپنے بچوں کو'' تصدیق واعتراف پر مجبور ہو جاتا ہے۔ کاش کسی کو توفیق ہوتی کہ اس قرآنی اشارے کی توضیح کے لیے بائبل کی ان گواہیوں کو جمع کر دیتا۔ کیا عہد اسلامی سے پہلے بنی اسرائیل کے ان نوشتوں کے متعلق بھی اس شبہ کی گنجائش ہے کہ مسلمانوں نے اپنی طرف سے ان الفاظ کا اسرائیلی کتابوں میں اضافہ کر دیا ہے۔

اور یہ کتابیں تو خیر مذہب ودین سے تعلق رکھتی ہیں، مگر مسلمانوں سے پہلے بہت پہلے یونان وروم کے مؤرخوں کی کتابوں میں سرزمین عرب کے اس پرانے معبد ''الکعبہ'' کا ذکر جن الفاظ میں پایا جاتا ہے، ان کو دیکھنے کے بعد یہ دعویٰ کیا غیر تاریخی، یا بے بنیاد ٹھہرایا جاسکتا ہے کہ پشت زمین پر آج جتنے مکانات پائے جاتے ہیں، ان میں کوئی مکان، یا گھر قرآن کے اس ''اول البیت'' کے مقابلہ میں اس حیثیت سے اپنے کو نہیں پیش کرسکتا کہ مسلسل نہ صرف اپنے وجود کو، بلکہ احترام وعزت کی مرکزیت کو باقی رکھتے ہوئے موجودہ عہد تک چلا آیا ہو۔

ہیروڈوٹس جو حضرت مسیح سے چھ سو سال پہلے گزرا ہے، اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ عرب کے اس معبد کا بہت قدیم زمانے سے لوگ احترام کرتے چلے آئے ہیں۔ ہیروڈوٹس کی شہادت ہی تقریباً اڑھائی ہزار سال کی ہے۔ خیال کرنا چاہئے کہ اڑھائی ہزار سال پہلے بھی جس گھر اور مکان کے متعلق یہ خبر دی جاتی ہو کہ بہت قدیم زمانہ سے لوگ اس کا احترام کرتے چلے آئے ہیں، تو اس کی قدامت کی تاریخ کتنی طویل ہو جاتی ہے۔ خصوصاً جب اس کو بھی پیش نظر رکھ لیا جائے کہ دنیا کے عام شہروں اور آبادیوں کے متعلق جن معلومات کو صحیح تاریخی معلومات قرار دیا جاسکتا ہے، ان کی مدت اڑھائی تین ہزار سال سے آگے نہیں بڑھتی، کارتھیج ہو، یا ایتھنز ہو، یا پامپیائی ہو، یا روم، سب ہی کا حال یہی ہے۔

اب سمجھ میں آتا ہے کہ قرآن نے اسی الکعبہ کا ذکر کرتے ہوئے منجملہ دوسرے صفات کے، بعض مقامات میں اس کو ''البیت العتیق'' کے نام سے موسوم کیا ہے۔ یہ صفت صرف اضافی ہی نہیں ہے۔ تاریخی تحقیقات کے سلسلے کو لوگ اگر جاری رکھیں، تو ان پر واضح ہوتا چلا جائے گا کہ اس مکان کی حقیقی صفت یہی ہے، یعنی: ثابت ہوگا کہ دنیا کے تمام پرانے گھروں

میں جو کبھی پائے گئے، یا اب بھی کہیں پائے جاتے ہیں، سب کے مقابلے میں یہی مکان کرّۂ زمین کا قدیم ترین گھر ہے۔

وسط زمین

اور سچ تو یہ ہے کہ بائبل کا ''بیت ایل'' اور قرآن کا ''بیت اللہ'' جس آبادی میں پایا جاتا ہے، اس کے اور جس ملک سے اس آبادی کا تعلق ہے، اس کے متعلق تاریخی شہادتوں کے علاوہ ان کے جغرفیائی پوزیشن پر بھی اگر توجہ کی جائے، تو اس قرآنی اشارے کا مطلب سمجھ میں آسکتا ہے، جسے ''سورۃ البقرۃ'' میں ہم پاتے ہیں۔ امت اسلامیہ محمدیہ (علی صاحبہا الف الف صلاۃ وتحیۃ) کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ:

﴿ و کذٰلك جعلنا کم امة وسطاً ﴾

''اور اسی طرح بنایا ہم نے تم لوگوں کو وسط اور بیچ والی امت''۔

اس سے پیشتر جیسا کہ ہر قرآن پڑھنے والا جانتا ہے ''الکعبہ'' ہی کا ذکر ہے اور فرمایا گیا ہے کہ بجائے مشرقی خطوں اور مغربی اقلیموں کے، مسلمانوں کو زمین کے اس حصہ میں قبلہ عطا کیا گیا ہے، جو نہ مشرق سے زیادہ دور ہے اور نہ مغرب سے اور یہ خدا کا فضل اور اس کی حکمت کا اقتضا ہے۔

بہر حال اس آیت کی صحیح تفسیر کا یہاں موقع نہیں ہے۔ جب مسلمانوں کو وسط اور بیچ میں واقع ہونے والی درمیانی امت قرار دیتے ہوئے ان کے اس حال کو قبلہ سے تشبیہ دی گئی ہے، تو صاف اور واضح مطلب یہ ہے کہ قرآن مطلع کرتا ہے کہ جغرافیائی حیثیت سے ان کا قبلہ بھی وسط اور ایسے علاقہ میں واقع ہے، جو دنیا کے معمور اور آباد علاقوں کے درمیانی حصہ ہونے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے معنی یہی ہوئے کہ روایتوں میں الکعبہ، یا مکہ کو جو ''سرۃ الارض'' (نافِ زمین) کے لفظ سے موسوم کیا گیا ہے، یہ دراصل اسی قرآنی خبر کی تعبیر اور توضیح ہے۔

آج ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ مشرق و مغرب کے سارے مواصلاتی ذرائع، خواہ ان کا تعلق خشکی سے ہو، یا تری سے، یا فضا اور ہوا سے، تقریباً عام حالات میں ہر ایک کو اسی

علاقے سے گزرنا پڑتا ہے، جس میں الکعبہ واقع ہے۔اسی طرح شمال میں ۸۰ درجہ تک، اسی طرح اس کے بالمقابل جنوب میں ۴۰ درجے تک، عموماً انسانی آبادیاں پائی جاتی ہیں۔ مجموعی طور پر ۱۲۰ درجے تک دنیا کی آبادی شمالاً وجنوباً پھیلی ہوئی ہے، اس لیے دنیا کے درمیانی علاقے وہی ہو سکتے ہیں، جو ۲۰ اور ۲۱ درجے پر واقع ہیں، اب اطلس اٹھا کر دیکھ لیجئے۔ وہی آپ کو جواب دے گا کہ عرب کا ملک جس میں الکعبہ واقع ہے، اس کا محل وقوع اس سلسلے میں کہاں ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن نے یہ بتایا ہے کہ ''العالمین'' کی ہدایت وارشاد کا نظام اسی مقام میں قائم ہوگا، جو اس سے پہلے اسی عالمگیر تبلیغی نظام کی تمہید میں ابراہیم علیہ السلام کا مقام بنا۔اسی کے ساتھ اس نے یہ بھی بتایا کہ: ﴿فیه آیات بینات﴾ یعنی: ''اس گھر میں اور بھی کھلی کھلی نشانیاں ہیں''۔ ان آیاتِ بینات اور کھلی کھلی نشانیوں کو آپ تلاش کرتے چلے جائیے، راز کے بعد راز کا مسلسل انکشاف آپ پر ہوتا چلا جائے گا، تاریخ کے اوراق بھی اس باب میں آپ کی مدد کریں گے، جغرافیہ کے اطلسوں سے بھی آپ اس سلسلے میں اعانت حاصل کر سکتے ہیں، اقوام وامم کے آسمانی رہنماؤں کے کلام میں بھی اس ''البیت العتیق'' کے متعلق اتے پتے ملتے چلے جائیں گے۔

یہ ساری نشانیاں آپ پر واضح کریں گی کہ اس گھر کے ساتھ مسلمانوں کا تعلق، نری خوش اعتقادی پر مبنی نہیں ہے، بلکہ قدرت کے مقررہ طبعی قوانین کا یہ منطقی نتیجہ ہے۔ مسلمان اگر سمجھتے ہیں کہ نسل انسانی کا پہلا ابتدائی قبلہ بھی ''الکعبہ'' ہی تھا، پھر جب مختلف علاقوں کے بکھرے ہوئے انسانوں کو باہم ایک دوسرے سے قریب تر ہو جانے کی صورت نکل آئی، تو مختلف مقامی قبلوں سے ہٹا کر سب کو اسی پرانے واحد مرکزی قبلہ پر جمع کر دیا گیا، تو یہ ایک ایسی بات ہے جس کی تائید ان ہی ''آیاتِ بینات'' سے ہو رہی ہے، جن کی طرف قرآن نے اشارہ کیا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف یہ بات منسوب کی گئی ہے کہ ''ہندوستان سے الکعبہ کا حج حضرت آدم علیہ السلام نے چالیس دفعہ فرمایا''۔ میں مانتا ہوں کہ سنداً اس قسم کی روایتوں کا ذخیرہ بہت کچھ محلِ اشتباہ ہے، لیکن جب قرآن کے نص قطعی سے معلوم ہوتا

ہے کہ "الناس" یعنی: آدمیوں کے لئے سب سے پہلا گھر مکہ ہی میں بنایا گیا، تو ان روایتوں کا جو حاصل ہے، یعنی: حضرت آدم علیہ السلام وادی "بکہ" کے اس اول ایست سے تعلق رکھتے تھے، آخر اس کو مشتبہ قرار دینے کی کیا وجہ ہوسکتی ہے....؟

رہا یہ مسئلہ کہ زمین کے اس خاص حصہ کی تحدید و تعین کے لیے ابتدا میں کیا صورت اختیار کی گئی تھی، یہ ایسی کوئی بات نہیں ہے جس کی تحقیق میں سر کھپایا جائے، پتھر لگائے گئے تھے، یا صرف مٹی کی دیواریں اٹھائی گئی تھیں، پھر پتھر اگر استعمال کئے گئے تھے تو کس قسم کے پتھر سے اس کی تعمیر ہوئی تھی؟ قرآن میں اس کا کوئی تذکرہ نہیں کیا گیا ہے اور اس کا عمومی دستور ہے کہ غیر ضروری امور سے اعراض کر کے مسلمانوں کو بھی گویا سکھاتا ہے کہ ان لایعنی مشاغل سے جہاں تک ممکن ہو، اپنے آپ کو محفوظ رکھیں۔

تجلّی گاہِ ربانی

آپ دیکھ رہے ہیں کہ "الکعبہ" کی مرکزیّت کے اظہار کے لیے ان تمام حقائق سے قرآن نے پردہ اٹھایا ہے، جن کے متعلق ممکن ہے کہ غیر ایمانی، عامیانہ فطرتوں میں ہچکچاہٹ پیدا ہو۔ اس نے صاف صاف لفظوں میں اعلان کیا ہے کہ "الناس" کے قیام و بقا کا تعلق بھی اسی الکعبہ سے ہے، وہی الناس کے لیے مثابہ (پن گھٹ) ہے اور ان کا امن و امان بھی اسی کے ساتھ وابستہ ہے۔ "العالمین" یعنی: سارے جہانوں کے لیے وہ مبارک بھی ہے اور ان میں ہدایت کی عمومی روشنی کی تقسیم کا مرکز بھی یہی گھر بنے گا۔

(ماہنامہ الخیر، ملتان)

حضرت ابوذر غفاریؓ کے آخری لمحات!

حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی

ہجرت کا بتیسواں سال اپنی ہستی کو فنا کرتے ہوئے اپنے اخیر مہینہ میں قدم رکھ چکا ہے۔ عرب وعجم کی بے شمار روحیں، عشق الٰہی میں سرشار ومست ہو ہو کر مکہ معظّمہ کی وادیوں میں پھیل رہی ہیں۔ عراق کے مسافر "ذات عرق" کے راستہ سے "ربذہ" کی پرفضا منزل سے گزر کر "لبیک اللّٰھم لبیک، لبیک لاشریک لک" کی دل گداز آوازوں سے ان دبی چھپی چنگاریوں کو بھڑکا رہے ہیں، جنہوں نے حضرت ابوذرؓ کے سینے کو آتشدان بنا رکھا تھا۔

"ربذہ" کے سامنے سے جو حاجی مستانہ لباس میں پابرہنہ گزرتا، اگر اور کچھ نہیں کرتا تھا، تو کم از کم ابوذرؓ کے دل کو ضرور رلا ڈالتا تھا، خصوصاً اس سال کے تمام ممالک محروسہ اسلام میں یہ اعلان عام طور پر شائع ہوگیا تھا کہ اس سال بھی "مدینہ" کا روحانی وجسمانی سلطان اپنے حقیقی ملیک قدوس کے آستانہ پر جبین نیاز جھکانے آئے گا۔ یعنی: عام طور پر یہ خبر ملک میں گرم تھی کہ حضرت عثمانؓ اس حج میں شریک ہوں گے، دور دور کے لوگ "بیک کرشمہ دوکار" کا اصول پیش نظر رکھ کر "مکہ" میں امنڈے چلے آتے تھے کہ حقیقی مجازی دونوں جمال وجلال کا نظارہ ایک ہی سفر میں ملتا ہے۔ مختلف ملکوں کے صوبیداروں، والیوں کے نام بھی پروانہ جاری کیا گیا تھا کہ اس سال خدائے واحد کے دربار میں آکر بیت اللہ کے خادم عثمان سے مل جائیں۔

الغرض اس سال کی مختلف خصوصیتوں نے عشق کے بازار کو گرم وتیز کر دیا تھا اور ظاہر ہے کہ اس حالت میں "ربذہ" کے درویش کی آگ بھی قدر اشتعال انگیز بھبک رہی تھی، اس کی کوئی انتہا نہیں ہوسکتی، نتیجہ یہ ہوا کہ آخر بیماری دل نے کام تمام کیا، مدت سے آہستہ آہستہ سلگنے والی آگ دل وجگر کے ہر ریشہ میں پیوست ہوگئی، جو جسم انسانی تھا، وہ از فرق تا بقدم انگارہ اور فقط انگارہ ہو کر دہکنے لگا، حتیٰ کہ طاقت رفتار نے ساتھ چھوڑ دیا، قوتوں نے جواب دے دیا اور وہ جو کہ سامان سفر میں مصروف تھا، بستر مرض پر یاس وناکامی کی چند ٹھنڈی

آہوں کے بعد اس طرح لیٹ گیا کہ پھر کبھی نہ اٹھا۔

دنیا نے سمجھا کہ کوئی مادی بیماری ہے، لیکن جنہوں نے آپ کے حالات کا مطالعہ ابتداء سے کیا تھا، وہ سمجھ گئے کہ جو چر کہ مکہ کے کسی چبوترے پر لگایا تھا، وہ اب گہرا ہو کر بیماری کی صورت میں ظاہر ہوا ہے، حتیٰ کہ ضعف نے آپ کو اس درجے مجبور کیا کہ باوجود قرب کے سب سے آگے رہنے والا سر بازار آج سب سے پیچھے رہ گیا، یا رکھ لیا گیا، آپ جس خیمہ میں بیمار ہو کر پڑ گئے، اسی کے سامنے سے روزانہ حاجیوں کا قافلہ امنگوں اور ارمانوں کے ساتھ گزرتا اور آپ کے دل پر رہ رہ کر چوٹ پڑتی، آرزوؤں کا ولولہ اٹھاتا اور تن زار کی کمزوری گراتی، ایک عجیب کشاکشی تھی۔ ہر بن مو سے گویا آواز آرہی تھی:

بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یاں
طاقت بقدر لذت دیدار بھی نہیں

ضعف کا یہ حال کہ دو قدم چلنا بھی دوبھر تھا اور حسرتوں کی وہ سینہ زوریاں کہ جس طرح بھی ابراہیم کے سر پر ٹپکنے والی بجلی، یا فاران والی فارقلیط کی روح کو منور کرنے والی ہزار ایک دفعہ دل وجان پر کوند جاتی، گزر جاتی، لیکن جہاں صرف اپنی خواہشوں کی پابندی ہو، وہاں ان باتوں کو کون پوچھتا ہے۔ آہ کہ جس پر وہ اجلال کے ناصیہ پر کہ: ''ان اللـه غنی عن العالمین''۔ (اللہ تمام عالم سے مستغنی ہے) آتشیں حروف میں لکھا ہوا ہو، وہاں ''میں جس یہ چاہتا ہوں'' کی آواز کون سنتا ہے۔ ابوذرؓ نے چاہا، لیکن جسے ابوذرؓ چاہتا تھا، اس نے نہ چاہا، پھر کس کی مجال تھی کہ ''ربذہ'' کا بیمار ایک قدم بھی آگے بڑھ سکتا ہو۔ آخر یہی ہوا کہ بیماری ونقاہت نے مجبور کیا، حضرت ابوذر غفاریؓ اس پرشوکت حج سے شریک نہ ہو سکے، کیا کرتے، تھک کر ''ربذہ'' کے خیمہ میں پڑ گئے۔

''ربذہ'' کے باشندے ایک تو یوں ہی تھوڑے تھے، اس پر کل سرکاری آدمی ان بے چاروں کو کیا علم تھا کہ افق غیب میں کیا مستور ہے، حضرت عثمانؓ کی آمد کی خبر سن کر وہاں کے کل آدمی مکہ معظمہ روانہ ہو گئے، ''ربذہ'' بالکل خالی ہو گیا، زندہ نفوس میں وہاں صرف آپ کا ایک جسم بیمار اور اہل وعیال رہ گئے اور بس، ادھر مناسک وزیارت کے دن بھی قریب آچکے تھے کہ مسافروں کی آمد ورفت کا سلسلہ بھی بند ہو گیا۔ سڑک بھی سنسان پڑی ہوئی تھی،

''سبحان اللہ'' کسی کی زبان سے کچھ نکل گیا تھا، فقط اس کو پورا کرنے کے لیے کیا کیا سامان ہورہے ہیں، ابوذرؓ ''دمشق'' سے بلوائے جاتے ہیں، مدینہ سے ربذہ بھیجے جاتے ہیں، حج کے بہانے سے ''ربذہ'' کو خالی کیا جاتا ہے اور آہ کہ وقت بھی وہ رکھا جاتا ہے کہ راہ کا راہی اور سڑک کا کوئی مسافر بھی میسر نہ آسکے:

این ہمہ غوغا برائے نیم جانے می شود

کہ ''فعال لما یرید'' کی قوتوں کو مانو اور اس کے آگے سربسجود ہو جاؤ۔

خیر جب سارا سامان تیار ہو گیا، دیکھ لیا گیا کہ شرائط جو زبان سے ادا ہوئے تھے، ٹھیک پورے ہو چکے ہیں کہ یکا یک اس ہو کے میدان میں جہاں چند جانوں کے علاوہ دور دور تک شاید پر مارنے والا پرندہ بھی موجود نہ تھا، ''ربذہ'' کی صوفی خیمہ والی کالی تیماردار عورت (یعنی: ابوذرؓ کی زوجہ محترمہ نے) ایک چیخ ماری، خدا جانے انہوں نے کیا دیکھا اور کس کو دیکھا، مگر فوراً ہچکیوں میں ملی ہوئی نرم لہجے ابوذرؓ کے بستر سے آواز آئی کہ: ''تم کو کس نے رلایا؟''۔ بیوی صاحبہ: ''تمہارا وقت قریب آ گیا ہے اور میں عورت ہوں، اتنی قوت نہیں کہ اس پتھریلی زمیں میں تمہارے لئے قبر کھود سکوں گی اور آہ! گھر میں کپڑا بھی نہیں، جس میں تمہیں لپیٹ کر دفن کر سکوں گی''۔

حضرت ابوذرؓ نے یہ سن کر نہایت سکون و اطمینان کے ساتھ ان سامانوں کا جو اصلی نشان تھا، ان الفاظ میں ظاہر فرمانے لگے کہ: ''مت روؤ اس کے لیے نہ روؤ، میں صحابہ کی ایک جماعت کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھا تھا، اس وقت آپ ﷺ نے فرمایا کہ قطعاً تم لوگوں میں ایک شخص چٹیل سنسان وادی میں جان دے گا، جس کے جنازے میں مسلمانوں کا ایک گروہ آکر شریک ہوگا اور میں اس دن سے اندازہ کر رہا ہوں کہ وہاں جتنے لوگ تھے، ان میں سب کے سب کسی شہر، یا آبادی میں وفات پا چکے اور اب صرف میں اکیلا رہ گیا ہوں، جو اس وقت اس وادی بے کسی میں دم توڑ رہا ہوں۔ پس جا راستہ پر جا کر بیٹھ، مسلمانوں کی کوئی جماعت ضرور آرہی ہوگی، کیونکہ خدا کی قسم نہ میں جھوٹ بول رہا ہوں اور نہ مجھ سے جھوٹ کہا گیا ہے''۔

بیوی صاحبہ: ''خدا جانے اب لوگ کہاں سے آئیں گے، حاجیوں کی آمد و رفت کا

سلسلہ بند ہو چکا ہے، راستہ بالکل سنسان پڑا ہوا ہے''۔ حضرت ابوذرؓ نے فرمایا کہ تم جاؤ تو سہی، جا کر دیکھو بھی تو۔ سمجھنے والوں کو اب جا کر معلوم ہو گیا ہو گا کہ اس سے پہلے جو کچھ ہوا تھا:

سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

غفار کا بہادر جواں صید گاہ عشق میں کودا تھا، اس پر جو تیر چلایا تھا، آج جا کر نشانے پر بیٹھتا ہے، روتی دھوتی یاس و ناکامی کے ساتھ آپ کی بیوی صاحبہ اٹھیں اور لب سڑک آ کر بیٹھ گئیں، مایوسانہ نگاہیں افق تک پھیل کر کسی چیز کو انتہاء بے کسی کے ساتھ ڈھونڈ رہی تھیں اور پھر ناکامیوں کے ہجوم میں واپس آ جاتیں، یہ سلسلہ آمد و رفت کا اسی طرح قائم تھا کہ یکا یک مبتداء کے چہرہ سے نقاب الٹا گیا اور اس کی خبر گرد و غبار کی صورت میں ایک جانب سے آ گئی، بیوی صاحبہ کا اس وقت کیا حال ہوا ہو گا، لکھنے کی ضرورت نہیں، سوچنے کی ضرورت ہے، پردہ چاک ہوتا ہے اور اندر سے گردنیں اٹھائے سترہ اونٹوں کی ایک قطار انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ نمودار ہوئی۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ وہ اس طرح اڑے چلے آتے تھے گویا بھاری پرندوں کی ٹولیاں زناٹے بھرتی ہوئی آ رہی ہیں، عربی عماموں والے شتر سوار گرد و غبار میں ڈوبے ہوئے اس پر سوار تھے۔ آناً فاناً وہ لوگ بیوی صاحبہ کے سر پر پہنچ گئے، ان لوگوں کی نگاہ یکا یک آپ پر پڑی، اس عالم تنہائی میں ایک عورت کا اس طرح سے کھڑا رہنا حیرت میں ڈال دینے کے لئے کافی تھا، انگلیوں نے نکیلوں کو ڈھیلا کر دیا، اونٹ روک دیئے گئے، جو آگے تھا، اس نے آپ کو مخاطب کر کے پوچھا کہ: ''بیوی صاحبہ! آپ یہاں کیوں کھڑی ہیں؟ آپ پر کیا حادثہ گزرا؟'' بیوی صاحبہ: ''مسلمانو! ایک آدمی بیچارہ مر رہا ہے، خدا کے لیے اس کے کفن دفن کا سامان کرو''۔ اس کے بعد جو جملہ آپ کی زبان سے نکلا، دل کے ٹکڑے ٹکڑے اڑا دیتا ہے، کلیجہ پاش پاش ہوا جاتا ہے، نیاز کی بے نیازیوں کا مرقع کچھ اس طرح آنکھوں کے سامنے عریاں ہوتا ہے کہ دل بیٹھا جاتا ہے، ''اللہ اکبر'' ابوذرؓ، راتوں کو پیشانی گھس گھس کر صبح کر دینے والا ابوذرؓ، صبح کو فاقہ و بھوک کی شدت میں شام کرنے والا ابوذرؓ، سچ کی حمایت میں دنیا کو اپنا دشمن بنانے والا ابوذرؓ، آہ کہ وہی ابوذرؓ جس نے عشق و سرمستی میں اپنی عمر کاٹ دی، توحید و سنت کی اشاعت میں دربدر پھرنے والا ابوذرؓ، محض آسمانی محبوب کی رضا جوئی میں دولت و امارت سے کنارہ کش ہونے والا ابوذرؓ، صرف اس

کی پوجا کے لیے آبادیوں کو چھوڑ کر جنگل کے بکھیروں کی طرح زندگی گزارنے والا ابوذرؓ، آج ایک جنگل میں جان دے رہا ہے اور اسطرح دے رہا ہے کہ ان کی بیوی اللہ اللہ! مسافروں کے سامنے اسطرح کھڑی ہیں کہ ان کے کفن کے لیے بھیک مانگیں، غنی مطلق کے استغنائے مطلق کی یہ کارفرمائیاں ہیں، اس روحانی بادشاہ کی بیوی کی زبان سے یہ الفاظ نکلتے ہیں اور مقربوں، صدیقوں کا زہرہ آب ہوا جاتا ہے۔

''اس بیچارے مسلمان کے پاس کفن نہیں ہے، خدارا اس کے کفن کا بھی سامان کرو، خدا کے یہاں اجر پاؤ گے''۔ شتر سواروں نے پوچھا کہ: ''وہ کون آدمی ہے؟'' آواز آئی کہ: ''ابوذرؓ، صحابی رسول اللہ'' یہ سن کر ہوش اڑ گئے، حواس باختہ ہو گئے، کہرام مچ گیا، سننے والوں نے شور برپا کردیا، غل تھا کہ وہ، ان پر ہمارے ماں باپ قربان ہوں، وہ ان پر ہمارے ماں باپ قربان ہوں''۔ اونٹوں کی پیٹھیں خالی ہوگئی، کوڑے ان کی گردنوں میں لٹکا کر چیختے ہوئے گریاں و نالاں وافتاں وخیزاں اس خیمہ مریض کی طرف دوڑ پڑے۔

حضرت ابوذرؓ نے بیوی صاحبہ کو ادھر بھیج کر اپنی بچی کو پکارا اور فرمایا کہ: ''بیٹی! ایک بکری ذبح کرلو اور فوراً اس کے گوشت کو آگ پر چڑھا دو، گھر میں مہمان آرہے ہیں، جب وہ مجھے دفن کرلیں، تو تم ان سے کہنا کہ ابوذرؓ نے آپ لوگوں کو خدا کی قسم دی ہے کہ جب تک کھانا کھا نہ لیں، اپنی سواریوں پر سوار نہ ہوں''۔ اس کے بعد فرمایا کہ ''مہمانوں کی ایک اور جماعت آنے والی ہے، جو کھاتی پیتی نہیں، سونگھتی ہے، ایک نافہ مشک کا پڑا ہوا ہے، اسی کو گھس کر پانی میں ملاؤ اور تمام خیمہ میں چھڑک دو، عنقریب وہ آنے والے ہیں''۔

روح جسم کو چھوڑ رہی ہے، سکرات کی حالتیں طاری ہیں، لیکن اس وقت بھی جو خیال عملی صورت میں اختیار کر رہا ہے، وہ وہی ہے جو میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ علم عمل پر منطبق ہو جائے۔

خلیلِ ابوذر علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے بتایا تھا کہ مہمانوں کا اکرام کیا کرو، پس گو جان نکل رہی ہے، لیکن یہ قول اس میں منجذب ہو گیا تھا، اس پر عمل کرنا بھی ضروری ہے، حجۃ الوداع کی آخری وصیت نبوی ﷺ کہ: (الا فلیبلغ الشاهد الغائب) ''دیکھو جو یہاں موجود ہے، وہ غیر حاضر لوگوں کو میرا قول پہنچا دے''۔ موت کی تمام سختیوں پر غالب آگئی،

ان لوگوں کو دیکھ کر فرمانے لگے کہ:

"تمہیں خوشخبری ہو، تم لوگوں کے متعلق آنحضرت ﷺ ایک مژدہ سنا گئے ہیں (یعنی: فرمایا تھا) کہ مسلمانوں کی ایک جماعت آپ کے کفن دفن میں شریک ہوگی، حضور ﷺ کی یہ تصدیق کہ فلاں شخص ہے، یا فلاں جماعت مسلمانوں کی ہے، حقیقت یہ ہے کہ اس سے زیادہ جان بخش گراں مایہ مژدہ اور کیا ہوسکتا ہے"۔ اس کے بعد ابوذرؓ نے فرمایا کہ: "ایک اور مژدہ سنو! میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ جن دو مسلمانوں کے درمیان دو بچے مرگئے ہوں، یا تین بچے مرگئے ہوں، یا ان کی موت پر انہوں نے صبر سے کام لیا ہو اور صبر پر ثواب کی امید لگائی ہو، تو یہ دونوں ہمیشہ کے لیے آگ کے شعلوں سے جدا ہو گئے"۔

یہ تو ظاہر ہے کہ حضرت ابوذرؓ نے جو یہ حدیث بیان کی عموماً اس پر برانگیختہ کرنے والا تبلیغ کا جذبہ دیرینہ تھا، تاہم یہ بات البتہ قابل غور ہے کہ آپ نے خاص کر اسی روایت کو کیوں بیان کیا، میں اس کا قطعی تو جواب نہیں دے سکتا، پھر بھی قرائن و قیاسات کا مقتضیٰ ہے کہ آپ کو یہ بھی جتانا منظور تھا کہ دیکھو ابوذرؓ اس دنیا سے جاتا ہے، مگر اپنے اعمال وافعال پر بھروسہ کر کے نہیں جاتا، اپنے صدقات وخیرات پر اعتماد کرتے ہوئے اپنی جان ملک الموت کے سپرد نہیں کرتا، ان چیزوں میں سے اس کو کسی پر غرہ نہیں، کسی پر بھروسہ نہیں۔ ہاں! صرف ایک آس ہے کہ اس کے چند بچے مرگئے ہیں، ارحم الراحمین شاید اسی کو بخشنا اور مغفرت کا ذریعہ بنادے، فقط ایک یہی چیز ہے کہ جو ممکن ہے، رحمت ایزدی کو اپنی طرف متوجہ کرسکے اور یہ ایک صوفیانہ نکتہ ہے کہ موت سے پہلے جس قدر خشیت وخوف اپنے دل پر غالب کرسکتے ہو، کرو، پھر جب موت کی گھڑیاں سر پر آجائیں، اس وقت بیم و دہشت کو سینے سے باہر نکال کر صرف امید ونجات وفور رحمت وغفران سے دل کو لبریز کرلو۔ شیخ المجاذیب اس وقت اسی شغل میں مصروف ہیں۔

اس کے بعد آپ کے دل سے اس شورش انگیز، روح فرسا، حوصلہ گسل آواز اٹھی اور بصد حسرت ویاس اٹھی، صحابی رسول ﷺ نے فرمایا کہ: "اے کاش کہ میرے پاس اتنا کپڑا ہوتا کہ میں اس میں سما کر اپنا کفن بنالیتا، تو پھر میں اس کے علاوہ اور کسی کفن کی ضرورت

محسوس نہ کرتا، مگر (یعنی: جب خدا کی مرضی یہی ہے کہ اپنے کفن میں لپٹا ہوا نہ جاؤں اور آپ لوگ کفن دیں) اب آپ لوگوں کو وصیت کرتا ہوں اور خدا کی قسم دیتا ہوں کہ مجھے جو شخص کفن دے، وہ نہ تو کسی صوبہ کا والی اور نہ عریف ہو اور نہ واکیہ ہو"۔

اتفاق تو دیکھو کہ اس جماعت میں جتنے آدمی تھے، قریب قریب ہر ایک شخص ان عہدوں میں سے کسی ایک پر ممتاز تھا، صرف ایک انصاری جوان البتہ ایسا تھا جس میں یہ باتیں نہیں تھیں، وہی بول اٹھا کہ: "مجھ میں آپ کی تمام شرائط پائی جاتی ہیں اور میرے تھیلے میں دو چادریں بھی نئی رکھی ہوئی ہیں، جس کے سوت میری ماں کے ہاتھ نے کاتے ہیں"۔ بعض روایتوں میں ہے کہ: "ان چادروں کو میری ماں نے بنا ہے اور ایک چادر یہ ہے، جو میرے بدن پر پڑی ہوئی ہے، یہ ملا کر تین کپڑے ہو جاتے ہیں جو کفن کے لیے کافی ووافی ہیں"۔

حضرت ابو ذرؓ نے یہ سن کر فرمایا کہ: "ہاں! تم میرے حسبِ منشاء ہو۔ بس! انہیں کپڑوں میں مجھے کفنانا"۔ اس گفتگو کے بعد اور کیا کیا باتیں ہوئیں، مورخین ان سے ساکت ہیں، ہاں! طبقات ہی میں ایک اور روایت موجود ہے، جو ظاہراً بلکہ یقیناً اس روایت سے مختلف ہے۔ حافظ ابن قیمؒ نے "زاد المعاد" میں اس کے تضاد پر تنبیہ بھی کی ہے اور بغیر کسی جواب کے آگے نکل گئے ہیں، لیکن میرے نزدیک راویوں سے اس میں چوک ہوئی ہے، اقرب الی الصحت اس کی ترکیب یوں معلوم ہوتی ہے کہ: "مجھے نہلا دھلا کر کفن پہنا کر، سڑک پر جا کر ڈال دینا اور دیکھتے رہنا سب سے پہلے سواروں کی جو جماعت گزرے، ان کو ٹھہرا کر کہنا کہ یہ ابو ذر صاحبِ رسول اللہ ہے، تم لوگ ان کے دفن میں میری مدد کرو"۔

۸ ذی الحجہ ۳۲ ہجری

خدا کی ہر چیز خدا کی طرف جانے والی ہے، آخرت وقت عظیم آ گیا، آسمانوں سے فرشتے اتر پڑے اور اس خستہ و نزار سوختہ و بریاں جاں کو جس نے خدا جانے اس عنصری دور میں نشیب و فراز عالم کے کتنے حوادث دیکھے اور خود اس کی قفس خاکی میں بند ہو کر کیا کیا تھا، اسی کو لینے کے لیے دنیاوی مخمصوں سے نجات کے لیے قدوسیوں کے جھرمٹ میں موت کا فرشتہ مشک بیز خیمہ میں اپنے میزبانوں کے پاس پہنچ گیا، حجابات اٹھنے لگے، ان دیکھی

چیزیں آنکھوں کے سامنے چلتی پھرتی نظر آنے لگیں، ابوذرؓ نے ٹوٹی ہوئی آواز میں دنیا والوں کو اس آخری لفظ سے مخاطب فرمایا کہ: ''قبلہ کی طرف میرا رخ کردو''۔ آخری حکم کی آخر تعمیل کردی گئی، اس کے بعد خلوص وسچائی کے اندر ڈوبے ہوئے الفاظ خیمہ میں اس طرح گونجے ''بسم اللہ وباللہ وعلیٰ ملۃ رسول اللہ'' انہیں پاک آوازوں کے ساتھ خاک وآب و آتش وباد کے کرے، ایک تاباں روشنی مقدس تعلق سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گئے۔ سراج منیر ﷺ کے انوار سے دمکنے والا ماہتاب ٹھیک ۸ ذی الحجہ کو ''ربذہ'' کے حوالئی افق میں غروب ہو گیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون (نفس مطمئنة فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی) کی صدائے روح پرور زمین سے اکھڑا اور جہاں بلایا گیا پہنچ گیا، جس نے اپنے کو خدا کے لیے بنایا تھا، وہ نہایت امانت کے ساتھ پیمان وفا کو پورا کرتے ہوئے جلال و جمال کی مستور کشتیوں میں غرق ہو کر جس کے لیے تھا اسی کے پاس چلا گیا۔

وما كان قيس هلكا هلك واحد

ولكنه بنيان قوم تمعدما

مجذوبوں کا سردار رئیس الطائفہ فقیری کی ایک جدید یادگار چھوڑ کر دنیا سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گیا۔

جنازہ

آنکھیں بند کی گئیں، انگوٹھے باندھے گئے، غسل دینے والوں نے نہلایا، انصاری نوجوان نے کپڑے نکال کر دیئے اور اس جسم کو جس نے اسلام کے بعد خدا کی مرضی میں اپنی خواہشوں کو جذب کر دیا تھا، ایک غیر کے کپڑے میں کفنایا گیا۔ حسبِ وصیت آپ کا جنازہ اٹھایا گیا اور عام گزرگاہ پر لا کر رکھ دیا گیا، ادھر کوفہ سے استاد المسلمین، معلم الامتہ، فقیہ الاسلام حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ عمرہ کا احرام باندھے معہ ایک جماعت کے مکہ مکرمہ کے ارادے سے تشریف لا رہے تھے، آپ کو اس المناک حادثہ کا علم تھا، یا نہیں؟ مجھے کیا معلوم! تاہم ظاہر حال یہ تھا کہ آپ نہایت تیزی کے ساتھ اپنے اونٹ کو بھگاتے ہوئے لا رہے تھے، حتیٰ کہ قریب تھا کہ جس کا جنازہ بے کسی کے ساتھ راستہ پر پڑا تھا، وہ سواری کے نیچے

آ جائے، لیکن یکا یک آپ ٹھٹک گئے، جنازہ کو اس طرح پڑا ہوا دیکھ کر اپنے اونٹ کو روک لیا اور اپنے ساتھیوں کو بھی ٹھہرا لیا، جو لوگ سڑک کے نیچے آنے والوں کا انتظار کر رہے تھے، اِن لوگوں کو دیکھ کر سامنے آ گئے اور کہا کہ: "ابوذرؓ صاحب رسول اللہ ﷺ ہیں، ان کے دفن میں ہم لوگوں کی مدد کیجئے"۔ ایک زبردست دھکا تھا، جس نے اچانک حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کی روح میں زلزلہ ڈال دیا۔ حضرت ابن عبدالبر کی روایت ہے کہ سنتے ہی آپ نے چیخ ماری اور مجنونانہ اپنے اونٹ سے اتر پڑے، روتے جاتے تھے اور حالت وارفتگی میں آپ کی زبان پر یہ الفاظ جاری تھے کہ: "میرے دوست، میرے بھائی" اخیر میں فرماتے کہ: "مبارک ہو تم کو، رسول خدا ﷺ نے سچ فرمایا تھا کہ ابوذرؓ اکیلا ہی چلتا ہے، اکیلا ہی مرے گا اور اکیلا ہی اٹھے گا"۔

حتیٰ کہ کم از کم مرنے والا اگر اپنے ساتھ کچھ نہیں لے جاتا، تو اپنے گھر کا کفن یقیناً لے جاتا ہے، لیکن حضرت ابوذرؓ صاحب رسول ﷺ کی تنہائی کا یہ عالم ہے کہ کفن بھی اپنا نہیں۔ لوگوں نے حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے نماز جنازہ پڑھانے کی درخواست کی، جنازہ آگے رکھ دیا، اس وقت کا نظارہ کتنا عظیم الشان اور دل ہلا دینے والا نظارہ ہوگا، سامنے ان کا جنازہ رکھا ہوا ہے، جو اپنے محبوب سے اسی طرح ملنے جا رہا ہے، جس طرح اسے چھوڑ کر آپ ﷺ تشریف لے گئے تھے، جنازہ کا امام وہ شخص ہے جس کی مرضی دنیا کے سب سے بڑے آدمی کی مرضی قرار دی گئی اور جن کے عہد علوم پر اعتماد کی تصدیق سرور کائنات ﷺ نے خود فرمائی اور جن کا بیشتر حصہ ان لوگوں پر مشتمل تھا، جن کے ملک سے عرب کے نبی ہاشمی ﷺ کے ایمان کی خوشبو آئی۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ پہلا گروہ کل یمانیوں پر مشتمل تھا۔ ابن اثیرؒ نے دونوں گروہوں کے آدمیوں کے اسماء بھی لکھے ہیں، میں بھی ان کی تفصیل اسی سے نقل کرتا ہوں:

حضرت عبداللہ ابن مسعود، ابو مفضر تمیمی، اسود ابن یزید، علقمہ ابن قیس نخعی، مالک بن الاشتر نخعی، خلخال حنفی، حارث ابن سوید تمیمی، عمر ابن عتبہ السلمی، ابن ربیعہ سلمی، ابو رافع مزنی، سوید ابن شعبہ تمیمی، یزید ابن معاویہ تمیمی، آخر القرثع حنفی، آخر معصد شیبانی (رضوان اللہ علیہم اجمعین)

الغرض میدان میں بصد بے کسی جو دم توڑ رہا تھا محض اس کی خاطر تھی کہ کوفہ کی زمین میں ملائی جاتی ہے اور فقیہ الاسلام کو زبردستی کھینچ کر جنازہ پر لا کھڑا کیا جاتا ہے، تا کہ جاننے والے جانیں کہ جو خدا کے لیے مرتا ہے، خدا اس کے لئے کیا کرتا ہے۔

مجھے بار بار حیرت ہوتی ہے کہ حج کا موسم ختم ہو رہا ہے، ایام حج بھی گزر رہے ہیں، ایسے وقت میں حضرت عبداللہ ابن مسعود ؓ کا مکہ آنا ایک محض بے موقع سی بات معلوم ہوتی ہے۔ ان کو اگر آنا تھا، تو پھر خوانخواہ انہوں نے چند دنوں کے لیے حج کو کیوں چھوڑا؟ میں اس معمہ کو بالکل نہیں سمجھ سکا، پھر اس پر حضرت ابوذر ؓ کا یہ فرمانا کہ: ''دیکھتے رہنا کوئی آتا ہوگا''۔ عجیب اسرار ہیں، جو علت اور معلول کے سلسلہ میں کسی طرح درج نہیں ہوتے، رہ رہ کر میری زبان پر یہ مصرعہ جاری ہو جاتا ہے کہ:

اے زائر حرم غرض ازیں خانہ چیست

نماز کے بعد جنازہ اٹھا، کن کے کاندھوں پر اٹھا، چشم بصیرت دیکھے اور رشک وغبطہ کی موجیں دلوں سے اچھل اچھل کر نجات کی راہیں ڈھونڈنے والوں کو تڑپائیں، سب سے پہلی منزل کے دہانہ پر جب ایک بڑے انسان کو لایا گیا، قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ اور لوگوں کے ساتھ قبر میں اترے، اتر کر اس سرچشمہ صدق وامانت کو جس سے زیادہ سچی زبان والے انسان پر آسمان نے کبھی سایہ نہیں ڈالا اور نہ جس سے زیادہ صدیق وراست باز لہجہ کو زمین نے اپنی پشت پر کبھی اٹھایا، ''ربذہ'' کی ایک کنج عافیت میں ہمیشہ کے لیے مستور ومخفی کر دیا گیا اور وہیں آج تک موجود ومودع ہے، عام زیارت گاہ ہے، پس جو تنہا ہی چلتا تھا، تنہا ہی رہتا تھا، وہ تنہا ہی عرصہ بلاد آزمائش سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گیا۔ حقیقی جذب وسرمستی کا چراغ گو اس کے بعد گل ہو گیا، لیکن اس کے بعد بھی جہاں کہیں اس کی کچھ روشنی پائی گئی، یا اس وقت بھی پائی جاتی ہے، وہ اسی کی فیض ریز شعاعوں کا نتیجہ ہے۔ اسی طرح عیسوی زہد وورع ہدی محمدی علیٰ صاحبہا الف الف صلوٰۃ وتحیۃ کے ساتھ اس کے بعد جہاں کہیں سے جمع ہوئے، وہ اسی اجماع کا اثر جاری ہے۔ فرضی اللہ تعالیٰ عنہ وعن الذین اتبعوہ باحسان!

حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کی روانگی اور آپ کے اہل وعیال کا انتظام

الغرض قضاوقدر نے جو کچھ چاہا، وہ ہوا، دفن کرنے کے بعد حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ اپنے رفقا کے ساتھ با چشم تر آپ کے خیمہ میں آئے۔ بیوی صاحبہ اور ان کی یتیم صاحبزادی صاحبہ وہاں موجود تھیں، آپ نے تسلی وتشفی کے کلمات ان کو کہے، خود بھی سنبھلے اور ان کو بھی سنبھالا، جب یک گونہ سکون پیدا ہو گیا، تو چلنے کے ارادے سے اٹھے۔

حضرت ابوذرؓ کی صاحبزادی صاحبہ نے پوچھا کہ کہاں تشریف لے چلے؟ ابا جان نے وصیت کی ہے اور خدا کی قسم دی کہ جب تک آپ لوگ کچھ نہ کھالیں، سوار نہ ہوں، انہوں نے اپنی زندگی میں بکری ذبح کرا کے پکانے کا حکم دے دیا تھا، جو پک کر تیار رکھی ہوئی ہے، یہ فرما کر کھانا پیش کر دیا، کھایا تو کیا جاتا لیکن مرنے والے کے اس خلوص کو دیکھ کر حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ دنگ ہو گئے کہ حضرت ابوذرؓ نے آنحضرت ﷺ کے ارشادات پر اس وقت بھی عمل کیا، جب کہ وہ دنیا سے رخصت ہو رہے تھے، تا کہ یہ دعوے کہ: ''میں آنحضرت ﷺ سے اسی طرح ملوں گا، جس طرح آپ ﷺ نے مجھ کو چھوڑا ہے''۔ عملی طور پر مدلل ہو جائے۔

الغرض جو کچھ کھا سکے، کھایا۔ اس کے بعد حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے کیا کیا؟ طبری نے اس کے متعلق دو روایتیں درج کی ہیں، ایک میں ہے کہ آپ نے حضرت ابوذرؓ کے تمام اہل وعیال کو ساتھ لیا اور مکہ معظّمہ میں جا کر حضرت عثمانؓ کے حوالے کر دیا اور دوسری روایت یہ ہے کہ یہیں ان لوگوں کو تسلی دلاسا دے کر آپ اسی وقت مکہ معظّمہ روانہ ہو گئے اور حضرت عثمانؓ کو اس جانکاہ حادثہ کی خبر دی، حضرت عثمانؓ کو سخت صدمہ ہوا اور بجائے اصلی راستہ کے آپ مدینہ کو ربذہ کی طرف سے لوٹے، راستہ مین ربذہ میں اترے اور تعزیت وغیرہ کر کے سب کو اپنے ساتھ لے کر مدینہ منورہ آئے۔ الغرض خواہ یہ ہو، یا وہ ہو، اس پر دونوں روایتیں متفق ہیں کہ: ''ضمہ عثمان الی اهله'' ''حضرت عثمانؓ نے آپؓ کے بال بچوں کو اپنے بچوں کے ساتھ ملا لیا''۔ (ماہنامہ لولاک، ملتان)

مختصر تعارف

حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمہ اللہ

حضرت مولانا گیلانیؒ بہار کی مردم خیز سرزمین کے درشاہوار تھے۔ ۹ ربیع الاول ۱۳۱۰ھ کو اپنی ننھال ''استھانوں'' میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم اپنے آبائی وطن ''گیلانی'' میں اپنے چچا حکیم سید ابوالنصر سے پائی۔

۱۳۳۱ھ میں انہوں نے دورہ حدیث میں داخلہ لیا اور ۱۳۳۲ھ میں دورہ حدیث میں شریک رہ کر دارالعلوم سے کتب حدیث کی سند حاصل کی۔ دارالعلوم میں حضرت شیخ الہندؒ، حضرت شاہ صاحبؒ، حضرت علامہ عثمانیؒ اور دوسرے اساتذہ کے علمی اور روحانی فیضان و تربیت سے ان کی زندگی کا رخ معقولات کے بجائے تفسیر وحدیث اور سلوک ومعرفت میں تبدیل ہوگیا اور فکر ونظر کی وہ تمام بنیادیں متزلزل ہوگئیں، جو خاندان، تعلیم اور گردوپیش نے ان کے گرد چنی تھیں۔

مولانا گیلانیؒ تعلیم سے فراغت کے بعد کچھ مدت تک رسالہ ''القاسم'' اور ''الرشید'' میں معاون مدیر کی حیثیت سے کام کرتے رہے، اس زمانے میں انہوں نے اپنے علمی اور تحقیقی مضامین اور والہانہ طرز نگارش سے علمی حلقوں میں نمایاں مقام حاصل کرلیا تھا۔ ''سوانح ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ'' اور ''کائنات روحانی'' یہ دونوں کتابیں ان کے اسی دور کی یادگار ہیں۔

''النبی الخاتم''، ''الدین القیم''، ''تدوین حدیث''، ''ہزار سال پہلے''، ''نظام تعلیم و تربیت'' ان کی مشہور تصانیف ہیں۔ ان کے علاوہ سینکڑوں مقالات ومضامین ان کے قلم سے نکلے اور ملک کے بلند پایہ رسائل وجرائد میں شائع ہوئے، (حضرت کا ایک دلچسپ مضمون ''احاطۂ دارالعلوم میں بیتے ہوئے دن'' جو کئی اقساط میں شائع ہوتا رہا، اب الحمد للہ ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان سے کتابی شکل میں طبع ہو چکا ہے) ان کا جو والہانہ اسلوب

تحریر میں پایا جاتا ہے، وہی والہانہ رنگ تقریر میں بھی تھا، وہ علم وفضل، معلومات، کثرتِ مطالعہ، دقتِ نظر، نکتہ رسی اور دقیقہ سنجی میں نادرہ روزگار تھے۔ ان کی کتاب ''ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت'' اپنے موضوع پر معلومات کا بیش بہا خزانہ ہے۔

آخر میں جامعہ عثمانیہ سے وظیفہ یاب ہوکر اپنے وطن ''گیلانی'' میں مقیم ہوگئے تھے، وہیں طویل علالت کے بعد ۲۵ شوال ۱۳۷۵ھ (۵ جون ۱۹۵۶ء) کو وفات پائی۔

...

خصال الفطرة

قال النبی صلی الله علیه وسلم: عشر من الفطرة :''قص الشارب، اعفاء اللحیه، السواك،الا ستنشاق بالماء،وقص الاظفار، غسل البراجم، ونتف الابط،وحلق العانة،وانتقاص الماء، یعنی:الا ستنجاء''. قال الراوی:''ونسیت العاشر، الاان تکون المضمضة''.

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''دس چیزیں فطرت سے ہیں: مونچھیں کٹانی، ڈاڑھی بڑھانی، مسواک، ناک میں پانی دینا، ناخن ترشوانے، انگلیوں کے جوڑ دھونے، بغل کے بال اکھاڑنا، زیرِ ناف مونڈنا، استنجاء''۔ راوی نے کہا کہ میں دسویں چیز بھول گیا، شاید کہ کلی ہو۔

موجود ایک مفہوم ہے، جس کی ماتحتی میں دنیا کی ہر ہستی درج ہے، واجب جوہر، عرض، قار، غیر قار سب ہی کو اپنے اندر سمیٹ کر، دلوں، اور دماغوں کے آگے روشن ہوتا ہے۔ غور کرو خدا کیا ہے؟ موجود ہے۔ ملائک ومجردات کیا ہیں؟ موجود ہیں۔ افلاک واجرام سماویہ کیا ہیں؟ موجود ہیں۔ عناصر وبسائط کیا ہیں؟ موجود ہیں، روح ومثل کیا ہیں؟ موجود ہیں۔ سیاہی وسپیدی، لمبائی چوڑائی کیا ہیں؟ موجود ہیں۔ زمانہ، وقت، آن، سال، ومہینے کیا ہیں؟ موجود ہیں۔ وہ جلد جلد ٹلنے والی، اپنے ہم جنس کے پیدا ہونے کے ساتھ فنا ہوجانے

والی آوازیں کیا ہیں؟ موجود ہیں۔

تم نے دیکھا کہ جس طرح اس کا احاطہ ایک ضعیف سے ضعیف ہستی کو عام ہے، بجنسہ وہ اپنے اندر اس وجودِ ازلی وابدی، سرمدی، دائمی، کو بھی لئے ہوئے ہے، جسے ہم اپنا مالک و پروردگار مانتے ہیں۔ اسکے بعد اب تم سے پوچھا جاتا ہے کہ اگر کہا جائے کھانا فطری ہے، تو کیا اسکا یہ مطلب سمجھنا صحیح ہوگا کہ نفسِ موجود (جس کے احاطہ وشمول کا اندازہ تم نے کرلیا ہوگا) فطرت میں داخل ہے، یعنی: اس کا اقتضاء ''ممکنات'' و''باری الممکنات'' دونوں کی اصل حقیقت میں رچا ہوا ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے کہ خداوند تعالیٰ اس سے بری ہے، پھر اگر یہ بھی نہیں، تو کیا یہ سمجھنا صحیح ہے کہ وہ تمام مخلوقات کو جوہرِ ذات کا مقتضی ہے؟ حالانکہ یہ بھی نہیں کہ اعراض وعناصر وغیرہ اس سے پاک ہیں اور اگر یہ بھی صحیح نہیں، تو کیا یہ صحیح ہے کہ وہ تمام جواہر کے فطرت میں داخل ہے؟ حالانکہ یہ بھی نہیں کہ بسائط، جمادات وغیرہ اس سے مستثنیٰ ہیں، بلکہ اس کا کھلا ہوا مطلب یہی ہے کہ وہ بعض چیزوں، جیسے: حیوان وانسان، درخت، بیل بوٹے وغیرہ کی نوعی طبیعتوں کی فطرت میں داخل ہے کہ بغیر کھانے کے وہ اپنی ہستی برقرار نہیں رکھ سکتے۔

اسی طرح اگر کہا جائے کہ فکر، ارتقاوعروج، تفنن، اختراع وایجاد فطری چیزیں ہیں، تو کیا یہ حکم جس طرح انسانوں کو عام ہے، حیوانوں کو بھی شامل ہوگا؟ حالانکہ ایسا نہیں۔ انسان اپنے حفظِ جان، وصیانتِ مال، عیش وآرام کے لیے، آئے دن نئی نئی ایجادیں کررہا ہے اور کرتا رہے گا۔ پہلے وہ لکڑیوں سے اپنے دشمن پر حملے کرتا تھا، پھر لوہے سے اپنے کو بچانے لگا، اس کے بعد اس نے تیر وکمان سنبھالے اور اب وہ توپ وبندوق سے لڑتا ہے اور خداوند تعالیٰ کے علم میں ہے کہ آئندہ وہ کس رتبہ پر ہوگا، بخلاف حیوانوں کے کہ جو طریقے حفاظت نفس کے ان کی سب سے پہلی نسل میں مروج تھے، وہی اب بھی ہیں، ہرنوں کی سب سے پہلی ڈار، لٹھ چلانے والے انسانوں کو دیکھ کر بھاگی تھی، تو آج بھی جب کہ گولیوں سے انسان اس پر حملہ کرتا ہے، فرار کے علاوہ اور کوئی چیز وہ اپنے پاس نہیں رکھتے کہ فلاں چیز فطری ہے، نہ تمام موجودات کو عام ہے، نہ تمام ممکنات کو، نہ تمام جواہر کو، نہ دنیا کی ہر نوع کو، بلکہ اگر بعض چیزوں کی فطرت میں وہ چیز پائی جائے، تو اس جملہ کا مفہوم صحیح ہو جاتا ہے، پھر

اسی اصل کو پیش نظر رکھتے ہوئے، اگر ہم سرور کائنات ﷺ کے اس کلام اقدس کا مقصد:

"عشر من الفطرة".

"دس چیزیں فطرت میں داخل ہیں"۔

صرف فطرت امتِ حنیفیہ، ملتِ ابراہیمیہ علی صاحبہا الف الف صلوات کے ساتھ مخصوص کریں، تو اس کی غلط ہونے کی آخر کیا وجہ ہوگی؟ اور اسی خیال سے متاثر ہو کر حکیم الہند حضرت الامام المجدد، شاہ ولی اللہ الدہلوی اس حدیث کے تحت میں ارقام فرماتے ہیں:

"اقول هذه الطهارات منقولة عن ابراهيم عليه السلام متداولة فى طوائف الامم الحنفية، اشربت فى قلوبهم ودخلت فى صميم اعتقادهم، عليها محيلهم وعليها مماتهم، عصرا بعد عصر ولذالك سميت بالفطرة".

"میں کہتا ہوں کہ یہ طہارات ابرہیم علیہ السلام سے منقول ہیں اور امم حنیفیہ عام طور سے متداول ہیں، ان کے دلوں میں گویا یہ چیزیں پلا دی گئی ہیں اور اعتقادوں کی جڑوں میں رچ گئی ہیں، اسی پر ان کا مرنا اور اسی پر جینا ہے، اسی لئے ان کو "فطرۃ" کہا گیا۔ (کہ فطرت کے معنی جبلت اور سرشت کے ہیں، پس چونکہ یہ چیزیں امتِ حنیفیہ کی سرشت میں داخل ہوگئی تھیں، اس لیے فطرت کا اطلاق اس پر صحیح ہوا)

آپ کے اس قول کا حاصلِ مطلب یہ ہے کہ فطرتی امور کے لیے یہ ضروری قرار دینا کہ وہ تمام موجودات، تمام ممکنات، یا کم از کم تمام افراد انسانی کی سرشت وفطرت میں داخل ہو، سراسر غلط ہے، بلکہ بجائے اس کے یوں سمجھو کہ فطرتی امور کی حقیقت صرف ان دو چیزوں سے تیار ہو جاتی ہے:

۱۔ کسی جماعت کسی امت، کسی طائفہ کی وہ عادت جو نسلاً بعد نسل منتقل ہو رہی ہو۔

۲۔ وہ ان کے دلوں میں رچی ہوئی اعتقادیات کے اندر پیوست ہوگئی ہو، مرنے جینے کسی میں وہ اسے نہ بھولیں۔

پس جو چیز ایسی ہے، وہ فطرتی چیز ہے اور چونکہ یہ باتیں امتِ ابراہیمیہ کے اندر اسی طرح موجود تھیں، اس لیے آپ نے فرمایا کہ ''عشر من الفطرۃ''۔ حضرت شاہ صاحب قدس سرہ اس تشریح کے بعد فرماتے ہیں کہ اور ان چیزوں کو جناب نبی کریم ﷺ نے شعائر اسلامیہ میں سے قرار دیا۔

اب یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں:

۱۔ کسی ملت و مذہب کے لیے کسی خاص امتیازی نشانی کی کیا ضرورت ہے؟

۲۔ اور بالفرض اگر ضرورت ہو بھی، تو ان چیزوں کی تخصیص کیوجہ؟ شعار اسلامی خاص کر کے ان چیزوں ہی کو کیوں قرار دیا گیا؟ شاہ صاحب پہلے سوال کا جواب ان مختصر الفاظوں میں دیتے ہیں:

''لیکون طاعتھا وعصیانھا امرا محسوسا''.

''تا کہ طاعت وعصیان محسوس ہو جائیں''۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ ایک شخص جب مسلمان ہوتا ہے، تو گویا وہ طواغیت وشیاطین ، اصنام، اوثان، دیوتاؤں، دیویوں وغیرہ کی حکومت سے نکل کر خدائے واحد کی سلطنت میں داخل ہوتا ہے۔

بجائے معدوم چیزیوں، فرضی خداؤں کے، ملک قیوم کی رعیّتوں میں شامل ہوتا ہے، گویا وہ پہلے اگر دھری تھا، تو اپنے بھیجے کی تموّجات (عقلی فطریات) کا غلام تھا اور اگر کسی باطل مذہب کا پیرو تھا، تو پرندوں کی بیٹوں سے خراب ہونے والے درختوں، گھوروں پر اگنے والے پیڑوں، یا پتھر کے چند ٹکروں، عورتوں کے شکم میں پیدا ہونے والے جسموں، حیض کے خونوں سے بننے والے گوشتوں اور ہڈیوں کا حلقہ بگوش تھا، مگر ملتِ حنیفیہ ابراہیمیہ پر ایمان لانے کے ساتھ ہی وہ ذوالجلال والاکرام، خدائے یگانہ وقدّوس، ملیک، مقتدر، لم یلد ولم یولد کے سرفروشوں اور بندوں میں داخل ہو جاتا ہے، اسی کو اپنے لئے عزت سمجھتا اور اس کا مایہ فخر ومباہات قرار پاتا ہے، وہ جس وقت گمراہوں کی جماعت پر نظر ڈالتا ہے، ان کی ابتری اور اپنی سلامت روی دیکھ کر جھومتا ہوا پڑھتا ہے:

﴿إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ

رَبِّ الْعَالَمِيْنَ. لَا شَرِيْكَ لَهُ وَبِذٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَاْ أَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ﴾(الأنعام: ١٦٢، ١٦٣)

''میری نمازیں، میری عبادتیں، میری زندگی، میری موت، خدا ہی کے لیے ہے، جو سارے عالم کا پالنے والا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور میں سب سے پہلا مسلمان ہوں''۔

الغرض امتِ مرحومہ، ملتِ حنیفہ کا ہر فرد خداوند ذوالجلال کا غلام اور چاکر ہے۔

پس اب مجھے بتاؤ کہ کوئی غلام، اگرچہ اپنے دل میں آقا کی محبت رکھتا ہو، اس کا سینہ اس کی عزت وعظمت سے معمور ہو، اس کے رگ وپے میں جذبہ خلوص موجزن ہو، لیکن جس وقت کہ اس کا آقا لوگوں کے سامنے آتا ہے، تو وہ بجائے سلام کرنے کہ اکڑتا ہے، وہ بجائے جھکنے کے پیٹھ پھیر کر کھڑا ہو جاتا ہے، بجائے سر ڈھانکنے کے کرتہ، پائجامہ سب اتار کر ننگا ہو جاتا ہے، کیا تم ایسے غلام کے آقا بنو، تو اپنے غیظ وغضب کو ایسی حالت میں دبا سکتے ہو؟ کیا اس کی ان بے ادبیوں پر اگرچہ تمہیں اس کے اخلاص کا یقین کامل ہے، منٹ بھر کے لیے بھی صبر کر سکتے ہو؟ پھر تم نے سمجھا کہ باوجود اس کے باطنی خلوص، اندرونی اعتقادِ عظمت، کے تم کیوں برافروختہ ہوئے؟

صرف اس لئے کہ جن چیزوں کو وہ اپنے اندر رکھتا ہے، وہ تمہیں محسوس نہیں ہوئیں، نہ تمہاری عقل نے رہنمائی کی۔ وہ دو چیزوں کا مجموعہ ہے: روح اور جسم، تمہاری عظمت کامل اس وقت ہو سکتی ہے کہ اس کے ہر ہر جز پر تمہاری اقرارِ عظمت پھیل جائے، نہ صرف جسم کے متاثر ہونے سے یہ بات کامل ہو سکتی ہے اور نہ صرف روح کے، بلکہ کمال ہر دو کی اثر پذیری کے بعد ہوگا اور جب کہ تمہارے غلام کے لیے جو حقیقۃً تمہارا غلام نہیں، ضرورت ہے کہ اس کے ظاہر وباطن ہر دو پر اثر انقیاد واطاعت طاری ہو، تو پھر خدائے کامل تو اس کا زیادہ مستحق ہے کہ اس کے غلام اس کی اطاعتوں کو کامل طور سے نمایاں کریں، روح کو انوار خلوص واعتقاد سے چمکائیں اور جسم کو شعائر مقررہ وعبادات جسمانیہ سے آراستہ ومزین بنائیں۔

الغرض اس طویل تقریر سے مقدمہ ضرور حاصل ہو جاتا ہے کہ حقیقت، اطاعت کی مکمل نہیں ہو سکتی جب تک کہ ظاہر کو باطن کے ساتھ شریک نہ کیا جائے۔

اور یہی وجہ ہوئی کہ مسلمانوں کے لیے ایک خاص شعار مقرر کر دیا گیا، تا کہ یہ محسوس ہو جائے کہ فلاں شخص کی اطاعت ابھی ناقص اور معصیت کے ساتھ ملی ہوئی ہے کہ اس نے اطاعت کے تمام اجزاء کا استقصاء نہیں کیا اور انشاء اللہ تعالیٰ یہی مراد ہے حضرت شاہ صاحب کے اس کلام سے:

"لیکون طاعتها و عصیانها امرا محسوسا"

"تا کہ طاعت وعصیان محسوس ہو جائیں"۔

علاوہ اس کے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ باطن کے حالات سے صرف خدا واقف ہوتا ہے اور مقصد الٰہی یہی نہیں ہے، بلکہ یہ بھی ہے کہ دوسرے بھی محسوس کریں کہ فلاں شخص میرے رقبہ غلامی میں داخل ہے اور فلاں نہیں ہے اور اسی لئے ایک خاص شعار کو مشروع کیا گیا اور میرا خیال ایسا ہے کہ مشروعیتِ شعار کا الٰہی راز یہی ہے۔ اس کے بعد شاہ صاحب کی دوسری وجہ بھی قابل ذکر ہے، جو موجودہ مذاق سے زیادہ اقرب ہے، جسے میں بعض نسخوں کی بنا پر الگ علت قرار دیتا ہوں۔

"یعرفون بها ویواخذون علیها".

"پہچانے جائیں اس کی وجہ سے اور مواخذہ کریں غیروں سے اس پر"۔

اس عبارت کے سمجھنے کے لیے ذیل کے مقدمات ذہن نشین کر لینا چاہیے۔

۱:......قومی اختلافات، مذہبی مناقشے کبھی نہیں مٹ سکتے کہ تجربات اور بعض الٰہی اغراض اسی کی مقتضی ہیں۔

۲:......مدینہ وحضارہ، جس پر بناء حیاتِ انسانی ہے اور بغیر تعاون وتناصر کے قائم نہیں رہ سکتی۔

۳:......اپنی قوم، اپنے ہم مذہب لوگوں سے جو معاونت ہمدردی حاصل ہوتی ہے، وہ بہر صورت قوم کے افراد سے ناممکن ہے۔

۴:......اور ظاہر ہے کہ ایک قوم، ایک مذہب کے ہر فرد کا اپنے دوسرے افراد سے واقف ہونا ضروری نہیں۔

۵:......اور معاونت قومیہ کا مدار اسی پر ہے کہ پہلے معلوم ہو کہ وہ ہماری قوم کا ہے۔

ان چند مقدمات کے تسلیم کر لینے کے بعد، جن میں بعض برہانی اور اکثر تجربیات سے حاصل ہوئے ہیں، ماننا پڑتا ہے۔ کہ شعار ہر ایک امت، ہر ایک قوم کے لیے بہت ضروری ہے، نہ صرف مسلمانوں کو اس کی ضرورت ہے، بلکہ دنیا کی ہر قوم، ہر مذہب کو اس سے چارہ نہیں، جیسا شاہ صاحب عام طور پر نصیحت فرماتے ہیں:

"ولا بدلکل امة من شعائر".

"ہر قوم کے لئے شعار کا ہونا بہت ضروری ہے"۔

کہ بغیر اس کے قوموں، امتوں کے درمیان باہمی تفاوت نہیں رہ سکتا، بجز شعار کے اور کیا چیز ہوسکتی ہے، جس کے ذریعے سے ہم اپنے ہم قوم کو غیر قوم سے الگ کرلیں گے؟ آنکھ، ناک، کان میں تمام انسان برابر ہیں، رنگ کا تفرقہ اس وقت مفید ہوسکتا ہے، جب کہ ملکی سوال ہو اور یہاں کلام مذہبی تمیز میں ہے، پھر مذہب کو تو کسی رنگ سے تعلق نہیں، اسی لئے شاہ صاحب نے فرمایا:

"یعرفون بها ویواخذون علیها".

یعنی: شعار ایک معیار ہوگا، جس پر "ہم قوم" کو غیر قوم سے تمیز بخشا جاسکتا ہے، جو اس شعار میں نظر آئے، اسے اپنا جان لینا چاہئے اور جو اس میں نہ ہو، اسے اپنی مخالف قوموں کا آدمی سمجھ کر اس کے ساتھ وہی برتاؤ کرنا چاہئے۔

ابھی تک جو کچھ تفصیل وتشریح تھی، وہ محض پہلے سوال کا جواب تھا کہ شعار کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اب میں دوسرے سوال کی طرف متوجہ ہوتا ہوں کہ اگر شعار کی ضرورت تسلیم کرلی جائے، تو پھر انہیں خاص چیزوں کو آنحضرت ﷺ نے کیوں شعار مقرر فرمایا؟

حضرت شاہ صاحبؒ نے اس جواب کو نہایت ہی مختصر، لیکن جامع بیان میں ادا کیا ہے، جس کی شرح میں خیال کے اعتبار سے یہ ہے کہ "شعار قومی کے معنی ایک علامت و نشان خاص کے ہیں، جسے کوئی قوم اپنے لئے مخصوص کرے، اور واقعہ یہ ہے کہ امتیازی علامت جس طرح ناخنوں کے کٹانے سے حاصل ہوسکتی ہے، تو بڑھانے سے بھی ممکن ہے کہ یہاں مقصود امتیاز ہے اور وہ ہر حال میں حاصل ہے"۔

مسلمان اگر مونچھوں کے کٹانے سے امتیاز حاصل کرتے ہیں، تو نانک شاہی لوگ سکھ

ان کے بڑھانے کی وجہ سے ممتاز ہیں اور اسی پر کیا منحصر ہے، اگر مقصود صرف امتیاز ہے، تو سر پر ایک ہانڈی، یا ہاتھ میں کسی قسم کا لوہا، یا گلے میں کوئی دھاگہ، یا دھجی، یا چیتھڑا ڈال دینے سے بھی بخوبی میسر آسکتا ہے اور تم بسیط ہند کی قوموں پر نظر ڈالو، کیا یہاں کی قوموں نے اپنے لئے اسی قسم کی چیزوں کو نشان قومی نہیں مقرر کیا؟ مگر دین کامل، ملت ظاہرہ میں یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہ اٹکل پچو محض امتیاز کو (خواہ امتیاز کامل، یا ناقص) پیش نظر رہ کر کسی خاص شعار کو مقرر کردے، جیسا کہ اوروں نے کہا۔

یہ نہیں ہوسکتا، بلکہ جہاں اسے شعار سے امتیاز کا فائدہ حاصل کرنا منظور ہے، وہیں اور منافع سے یہی بنی نوع انسان کی خدمت کرنا چاہتا ہے۔ اس نے شعار کے لیے چند اصول مقرر کئے، پس جو چیزیں کہ اس اصول کے ماتحت نظر آئیں، خاص کر ان کو چن لیا۔ ہم ان اصولوں کو ذیل کے نمبروں میں بیان کرتے ہیں۔

ا۔ شعار ایسی چیزوں کو مقرر کرنا چاہیے، جن سے حقیقتِ امتیاز پورے طور سے مکمل ہوسکتی ہو، شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اور حقیقتِ امتیاز کی تکمیل کے لیے تین باتوں کی اشد ضرورت ہے:

(ا) ماکثر وجودہ: جس کا وجود بہت ہو۔ مطلب یہ ہے کہ اس کے حصول میں دقت نہ ہو، دستیابی اس کی ہر شخص کے لیے تقریباً ممکن ہو، مثلاً: اگر کسی نے سونے کا کنٹھ، یا جواہرات کسی چیز کو قومی نشان قرار دیا، تو ''علم الاقوام'' کے عمرانی کے نشیب وفراز، تفاوت ہائے غربت، وامارت سے ناواقف ہے۔ ناممکن ہے کہ کسی چھوٹی سی چھوٹی قوم کا ہر فرد سونے چاندی کی چیزوں پر قادر ہوسکے اور نہ صرف سونا چاندی، بلکہ وہ جو ''علم المدن'' کے باہمی تفرقوں کے ماہر ہیں، جانتے ہیں کہ بسا اوقات کسی قوم کے ہر فرد میں لوہے، تانبے حتی کہ کبھی تو کپڑے کی بھی استطاعت نہیں رہتی، اس لئے ضرورت ہے کہ ''شعار'' ایسی چیزیں مقرر کی جائیں، جن کا وجود بکثرت ہو۔

(۲) ماتکرر وقوعہ: جو واقع بھی بکثرت ہوسکتے ہوں۔

مقصد یہ ہے کہ بسا اوقات کسی قوم کا کوئی فرد بوجہ طغیان وسرکشی، یا بوجہ صحبتِ اغیار کے اپنے قومی نشان کو چھوڑ بیٹھتا ہے، پھر اکثر ایسا ہوا کہ تھوڑے دن کے بعد اس کی حالت

درست ہو جاتی ہے، اگر پہلے مذہب وقوم کو وہ نفرت کی نگاہ سے دیکھتا تھا، تو اب اس سے زیادہ کوئی چیز اسے محبوب نظر نہیں آتی، اب اس کا دل ہر قومی چیز، مذہبی علامت کو پیار کرتا ہے، وہ مضطر ہو کر ٹھیٹ ویسا بننا چاہتا ہے، جیسا کہ اس کے اور ہم قوم اپنے صحیح مذہبی تعلیمات ،قومی روایات پر قائم ہیں۔

پھر فرض کرو کہ اگراس قوم کا شعار ایسا ہوا، جواب دوبارہ اسے حاصل نہیں ہوسکتا، تو اسے کس درجہ رنج ہوگا...! علاوہ اس کے شعار کے وہ فوائد جسے گذشتہ نمبر میں بیان کر چکا ہوں، وہ مفقود ہو جائیں گے، مثلاً: کسی قوم نے دانت رکھنے کو اپنا شعار مقرر کیا اور اتفاق سے اس قوم کا کوئی فرد امریکہ پہنچ کر اپنے اگلے دو دانتوں کو اکھڑوا دیتا ہے، جیسا کہ وہاں کی رسم ہے، پھر جب اپنے وطن کو واپس آتا ہے، تو اسے اپنی قومی بانے کا شوق ہوتا ہے، لیکن کیا اب پھر وہ دوبارہ اسے حاصل کرسکتا ہے؟

علاوہ اس کے چونکہ دانت اکثر بڑھاپے میں گر پڑتے ہیں اوراس طرح کہ پھر دوبارہ نہیں نکلتے، تو جتنے بوڑھے ہوں گے، اس قومی نشان سے محروم ہو جائیں گے، بخلاف ڈاڑھی کے کہ مثلاً: جو شخص اسے برا سمجھ کر غیر قوموں کی ریس میں آکر اسے منڈاتا ہے، اسے جب کبھی مذہبی جوش، قومی محبت اس شعار کے حاصل کرنے پر ابھارے گی، وہ چند ہفتوں میں حاصل کرسکتا ہے۔

(۳) ویکون ظاھراً: اسے باطنی چیز نہیں ہونا چاہئے، بلکہ اس کا تعلق ظاہر سے ہو۔ وجہ یہ ہے کہ اگر بعض فانی چیزوں کو مثلاً: عقائد وخیالات کو شعار مقرر کرلیا جائے، تو اس سے تکمیل امتیاز کیا، سرے سے امتیاز ہی حاصل نہیں ہوسکتا، بخلاف اس کے کہ اس کا تعلق ظاہر اعضا سے ہو، تو وہ چیز محسوس ہوگی، اس سے بقدر اس کے ظہور کے امتیاز میں مدد ملے گی، مثلاً: بغلوں کے منڈانے میں امتیاز ضرور ہے کہ کپڑا اتار کر معائنہ کیا جاسکتا ہے، مگر چونکہ اس میں بہ نسبت ڈاڑھی کے پوشیدگی ہے، اسلئے اس کا امتیاز لامحالہ ڈاڑھی کے امتیاز سے کم ہوگا، مگر ہوگا ضرور کہ وہ محسوس چیز ہے۔

الغرض مقصود یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے امتیازی خیالات، اچھوتے عقائد کو اگر شعار مقرر کر کے قناعت کرتا ہے، تو وہ امتیاز کی حقیقت اور شعار کے فوائد سے ناواقف ہے۔ یہ

تین چیزیں تو وہ ہیں، جن سے نفس حقیقت امتیاز کی تکمیل ہوتی ہے، جو اصول شعار کی پہلی اصل ہے۔اس کے بعد حضرت شاہ صاحب قدس سرہ دوسری اصل کو ان لفظوں میں بیان فرماتے ہیں:

"وفیه فوائد خمسة یقبله اذهان الناس اشد قبول".

"اور اس میں فوائد کثیرہ ہوں، جسے لوگوں کی طبیعتیں اچھی طرح قبول کرلیں"۔

حاصل اس کا یہ ہے کہ اگر محض شعار سے امتیاز کا فائدہ حاصل کیا گیا، تو یہ کوئی بات نہیں، بلکہ جہاں امتیاز مقصود ہو، وہیں بہت ضرورت ہے۔ وہ چیزیں ایسی ہوں جو انسانوں کے حق میں جسمانی، یا روحانی طور پر مفید ہوں، اس کے علاوہ اس کے کہ یہ "ایک کرشمہ برآبد دو کار" ہے، خود امتیاز کے مقصد کو بھی مدد ملتی ہے، اسلئے کہ جب وہ چیزیں منافع عامہ، وفوائد بشریہ پر مشتمل ہے، تو لامحالہ لوگوں کے دل اس کی طرف مائل ہوں گے کہ انسان کی طبیعت اپنے فوائد کی طرف فطرۃً متوجہ ہوتی ہے، تو اس توجہ کے کم افراد ایسے رہیں گے، جو ان شعائر کو اپنے لئے مخصوص نہ کریں گے، کیونکہ ظاہر ہے کہ اگر وہ صرف نشان قومی ہوں اور اس میں اور فوائد انہوں نے جیسا کہ گلے میں ایک دھاگہ ڈال دینے سے، یا سر پر ٹیک رکھنے میں بجز امتیاز کے اور کوئی فائدہ نہیں، یا بجائے فائدہ، اذیت ہو جیسا کہ جسم کے اندر بڑے بڑے بال رکھنے سے بجائے فائدہ کے سراسر نقصان ہے، جیسا کہ عنقریب ہم اسکو مفصلاً بیان کریں گے، تو ان کی طرف وہی لوگ جھک سکتے ہیں، جن کے دل میں الفت قومیہ رچی ہوئی ہو کہ اس کے علاوہ اور دوسری چیز ان کو ادھر ابھار نہیں سکتی، بخلاف اُن کے جن کے دل و دماغ میں قومیت، مذہب کی وقعت مضمحل ہوگئی ہے، وہ بلاوجہ اس کی طرف کیونکر متوجہ ہونے لگے۔ ہاں! اگر اس میں اور بھی منافع و مصالح پوشیدہ ہوں، تو ان کی جبلّت اس کے اختیار پر مجبور کرے گی اور اس صورت میں پوری قوم کی قوم، غیروں سے ممتاز ہو جائے گی، بخلاف اولیٰ کے بہت سے لوگ بغیر اس امتیاز کے رہیں گے، جن سے مقدار امتیازی گھٹ جائے گی۔

الغرض "شعار کامل" کی مصداق وہی چیزیں قرار پاسکتی ہیں، جن کو حصولِ امتیاز میں کامل طور سے دخل ہو اور ساتھ ہی وہ اور فوائد کو بھی اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہوں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ شارعِ اسلام علیہ والصلاۃ و السلام نے جن چیزوں کو مسلمانوں کے لیے مذہبی نشان، قومی شعار قرار دیا ہے، ان میں یہ باتیں پائی جاتی ہیں، یا نہیں اور اسی کے بعد بحث کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

حضرت شاہ صاحب قدس سرہ نے خود اس پر بحث فرمائی ہے، میں اسی کی شرح کرتا ہوں، ان مضامین کو درج کرتا ہوں۔

(۱) "حدیثِ شعار" میں پہلی چیز قص الشارب (مونچھیں کٹانی) ہے۔ اب اس پر مفصلہ بالا اصول کے اعتبار سے روشنی ڈالو۔

پہلی بات یہ تھی کہ وہ اکثروں کو میسر آسکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ مونچھیں کٹانی کس کو میسر نہیں آسکتی ہے، وہ سونے، چاندی، لوہے، تانبے، کپڑے کی طرح نہیں، جن کی استطاعت اکثروں میں نہیں ہوتی۔ الغرض اس میں تو وہ کامل ہے۔ اسی طرح دوسری بات، یعنی: اس کا وقوع بکثرت ہو۔ کیا شبہ ہے کہ انسان مکلّف ہر حال میں اس کے کثرت وقوع کے کٹانے پر قادر ہے۔ تیسری بات کہ وہ ظاہر ہو، محسوس ہو، تو تراشی ہوئی مونچھوں سے بڑھ کر اور کیا چیز محسوس وظاہر ہوگی....؟! اسی طرح اس کے کٹانے میں جتنے منافع ہیں، سچ تو یہ ہے کہ اگر لوگوں کو وہ معلوم ہو جائے تو کوئی وجہ نہیں اس سے اعراض کریں۔

حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں، جس کا ماحصل ادنی وضاحت کے ساتھ یہ ہے:

"جن کی مونچھیں بڑھ جاتی ہیں، تو پانی، غذا وغیرہ ان کے بالوں میں پھنس کر متعفن مادے زہریلے کیڑوں کو پیدا کرتے ہیں، پھر چونکہ اتفاق سے وہ ٹھیک اس گذرگاہ پر واقع ہوتے ہیں، جن سے انسان سانس لیتا ہے، جو براہ راست پھیپھڑے وغیرہ میں پہنچتی ہے، جس کے پاس ہی قلب ہے اور اسی طرح اسکو تعلق قریبی دماغ سے بھی ہے، تو بسا اوقات ان دونوں عضو رئیس کو اس سے نقصان پہنچتا ہے اور پھیپھڑے تو یقیناً چند دنوں کے بعد اکثر کے خراب ہو جاتے ہیں، جسے آئے دن سل ودق کی صورتوں میں ہم دیکھتے ہیں"۔

اخیر میں شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ:

"یہ شعار ہے اور شعار کا مقصد امتیاز ہے، تو جو چیز عام ہو، دوسری قومیں اسے کرتی

ہوں، وہ کس طرح امتیاز بخش سکتی ہیں، تو پھر مونچھیں بڑھانی کیونکر شعار مقرر کی جاسکتی تھی کہ زمانہ نبوی میں بھی مجوسیوں کا یہ طریقہ تھا''۔

اسی واسطے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(خالفوا علی المشرکین قصوا الشوارب) (الحدیث)

''مشرکین کا خلاف کرو، یعنی: مونچھیں کٹاؤ''۔

(۲) دوسرا جزاعفاء اللحیہ (ڈاڑھیاں بڑھانی) ہے۔ اس میں بھی وہ تمام اصولی خصائص بوجہ اتم پائے جاتے ہیں، باسانی اکثروں کو میسر بھی آسکتی ہے، اگر مونڈی گئی، تو فوراً حاصل بھی ہوسکتی ہے، ظہور میں تو اس کے شبہ ہی نہیں کہ انسان کے تمام بدن میں جو چیز کھلی رہتی ہے، اس میں چہرہ سب سے پہلے نمبر میں ہے اور چونکہ ڈاڑھی کا مقام چہرہ ہے، تو اس کا ظہور بھی یقیناً اور تمام چیزوں کے ظہور سے زیادہ ہے۔ رہا یہ کہ ڈاڑھی کے منافع وفوائد کیا کیا ہیں، یہ ایک مستقل بحث کی صورت رکھتی ہے اور ممکن ہے کہ مرتبہ تفصیل میں ایک طولانی دفتر کی شکل اختیار کرلے۔

اس لئے بنظر اختصار ہم محض ان توضیحات وکنایات پر اس مقام میں اکتفا کرتے ہیں جو حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کی عبارت سے حاصل ہوسکتے ہیں۔ آپ کے کلام سے میں نے جو کچھ سمجھا ہے، وہ ذیل کے نمبروں میں بیان کئے جاتے ہیں:

(۱) اپنی ہستی کا احساس گو ایک علم بدیہی ہے، ہر شخص جو زندہ ہے، جانتا ہے کہ میں موجود ہوں، تاہم بسا اوقات جن کے صفات وکمالات جس احساس کے مقتضی ہوتے ہیں، اس سے اکثر اشخاص غافل ہوجاتے ہیں اور نہ صرف یہ اشخاص وافراد تک محدود ہے، بلکہ دیکھا گیا ہے کہ کسی خاص جمود نکبت وزی کی وجہ قوموں اور امتوں پر بھی یہ حالت طاری ہوجاتی ہے، وہ نہیں سمجھتے کہ میں کون ہوں؟ اور کہاں ہوں؟ کس مرتبہ پر مجھے رہنا چاہئے اور آج میں کس رتبہ پر ہوں؟

ایک شخص اپنے سینے میں شاعرانہ طبیعت رکھتا ہے، اس کے دماغ میں لطیف جذبات تموج ریزیاں کرتے ہیں، درختوں کی سبزی، گھانسوں کی لاجوردانہ فراشی، پانیوں کی نزہت افزاء روانی، کرنوں کی موجوں کے ساتھ طرب انگیز قلابازی ان تمام فطری مناظر سے وہ

متاثر ہوتا ہے، لیکن وہ غافل ہوتا ہے کہ آخر میں کیا کرنا چاہتا ہوں اور میری طبیعت کس مرتبہ کی مقتضی ہے؟ مجھے کیا بننا چاہیے؟

اسی طرح اکثر اہل کمال اپنے کمال کے مرتبہ سے محض ناواقف ہوتے ہیں، اسی کا نتیجہ ہوتا ہے کہ نہیں سمجھتے کہ اس کمال کی قدر کیونکر کی جاتی ہے، حتیٰ کہ وہ برباد ہو جاتا ہے اور قوموں کے ابھرنے، بگڑنے، گرنے اور سنبھلنے کا تو سارا اسرار اسی میں پوشیدہ ہے کہ جب تک انہیں اپنی ہستی کے مراتب کمالیہ کا احساس رہا، وہ اس وقت ان اعمال وظائف کے پابند ہوتے ہیں، جو ارتقا، عروج کے بنیاد، اساس قرار دیئے گئے ہیں اور پھر جس وقت اس احساس کا فقدان شروع ہوتا ہے، بس وہی دن ہوتا ہے کہ ان کے دلوں اور جسموں سے وہ مقررہ چیزیں ایک ایک کر کے الگ ہونی شروع ہوتی ہیں، حتیٰ کہ ایک وہ وقت آتا ہے جب کہ ان کے پاس بجائے سب کچھ ہونے کے کچھ نہیں رہتا۔ اسی کے بعد ان کی دیوار عظمت یکا یک سر بسجود ہو جاتی ہے۔ قرآن میں بار بار اس کا ذکر کر کے اللہ نے فرمایا:

﴿كَذٰلِكَ وَأَوْرَثْنَاهَا قَوْماً آخَرِيْنَ﴾ (الدخان:۲۸)

''ایسا ہی ہے، پھر ان کے وارث دوسری قوم کو ہم بنا دیتے ہیں''۔

اسی طرح اس میں کوئی شبہ نہیں ایک شخص جب جوان ہوتا ہے اس پر کبر سنی طاری ہوتی ہے، تو فطری طور پر اس کا اقتضا ہونا چاہیئے کہ وہ سمجھے میں بڑا ہو گیا ہوں، مجھ پر اب وہ فرائض عائد ہیں، جو ایام طفلی میں نہ تھے، میری تمام حرکات نشست و برخاست، بات چیت، معاملات، مخاصمات کے قوانین اب ان ضوابط سے بالکل الگ ہیں، جن کی ماتحتی میں بچپن کا زمانہ بسر ہوا، لیکن جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ کبھی اپنی ہستی کے خصوصیات و کمالات سے انسان غافل ہوتا ہے، اپنے مراتب و مدارج سے اقوام و امم بے خبر ہو جاتی ہے۔

اسی طرح کبھی کبھی کیا اکثر بہت سے پیر نابالغی کے مدعی ہوتے ہیں، بہت سے جوان جنہوں نے تیس چالیس کی مسافت قطع کر لی ہے، وہ اکثر طفلی نگشت کے پورے مصداق بنے رہتے ہیں، ان کی ہر ادا ان کے ہر فعل رفتار و گفتار طرز و طریقہ سب ہی میں صاف صاف طفلگی کے آثار نمایاں طور پر پائے جاتے ہیں، وہ بالکل نہیں سمجھتے کہ میرے فرائض و مناصب کے یہ چیزیں خلاف شان ہیں، جس سے تمدن و عمران کے اجتماعی ایوان کو

بسا اوقات سخت صدمہ پہنچتا ہے، ان کی ماں بھوکی مرتی ہے، چہل سالہ صاحبزادے صاحب چونکہ اپنے کو چار سالہ خیال فرماتے ہیں، اسلیئے بجائے مسکینہ ماں کی مدد کرنے خود اس کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہیں اور میں نے تو سنا ہے بہت سے ایسے حضرات کھانے پینے، روپے پیسوں کے لیے اپنی اماں جان کے پاس جا کر ٹسوے بھی بہاتے ہیں۔

پھر اسی طرح کی اور بہت سی باتیں ہیں، جس کے بعد جن برے نتائج کا ظہور ہوا ہے، وہ اضطراری افلاس کی تاریخ پڑھنے سے بخوبی واضح ہو سکتے ہیں، پس جب کہ ایک شاعرانہ طبیعت رکھنے والے آدمی کے لیے ناگزیر ہے کہ کوئی مسلح ملے، اپنی اسلحہ تذکیر و وعظ، تحریر و تقریر سے مسلح ہو کر اپنی قوم کو اس کی ہستی کا احساس کرائے، تو اسی طرح کبر سنی کے احساس کرانے کے لیے بھی واجب ہونا چاہئے کہ کوئی چیز ہو، جو ہمیشہ ہمیشہ اسے اس کی ہستی کے احساس پر ابھارے، اسے جتلائے کہ تم اب بچے نہیں رہے، تمہاری عمر زیادہ ہوگئی، تمہارے وظائف و اعمال کی نوعیّتوں کو اب بدل جانے چاہئیں، ممکن ہے کہ یہ اور چیزوں سے بھی حاصل ہو سکتی ہو، لیکن غور کرنے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ڈاڑھی جس طرح انسان کو اس مسئلہ کی طرف اٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے، سوتے جاگتے، غرض ہر وقت ہر آن میں تنبیہ کر سکتی ہے، شائد اور کسی چیز سے ممکن نہیں۔ علی الخصوص جب کہ وہ بحیثیت امتیاز کے ایک زبردست شعار ہونے کے بھی صلاحیت رکھتی ہے اور انشاء اللہ یہی مقصد ہے حضرت شاہ صاحب کی اس عبارت کا:

"فھی الفارقد بین الصغیر والکبیر"

"ڈاڑھی صغیر و کبیر کی ہستیوں میں تفرقہ قائم کرتی ہے"۔

اور غور کرنے والے کے لیے تو شاہ صاحب کی اس عبارت میں اس سے زیادہ دقائق مضمر نظر آتے ہیں، لیکن چونکہ ان کی وضاحت کے لیے بعض ادق علمی مسائل کا ذکر ضروری ہو جاتا ہے، اسلیئے ہم صرف ایک اور معمولی پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہیں، غور کرو شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ڈاڑھی کبیر (بڑوں) اور صغیر (چھوٹوں) میں امتیاز پیدا کرتی ہے، یہ نہیں کہا کہ صبیان (بچے) اور شباب (جوان) اس کی وجہ سے تفرقہ حاصل ہوتا ہے۔ اسی صغیر و کبیر کے لفظ سے گویا وہ ایک معاشرتی مسئلہ کی طرف اشارہ کر گئے، جس کا ماحصل یہ

ہے کہ فلسفہ تہذیب و معاشرت کا یہ مسلّم اصولی ہے کہ ''چھوٹوں کو بڑوں کی عزت کرنی چاہیئے، ان کے واسطے فلسفہ تہذیب نے خاص خاص ضوابط وقوانین ہر ملک میں اس اعتبار سے وضع کئے ہیں، پھر صغیر وکبیر کے مراتب متفاوت ہیں اور ہر مرتبہ علیحدہ علیحدہ تہذیبوں کا طالب ہوتا ہے، جیسا کہ عام طور پر ہر ایک شخص جانتا ہے شریعت نے بھی اس قانون کو عزت کی نگاہ سے دیکھا ہے''۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا:

(ان ننزل الناس منازلهم)(مسلم)

''لوگوں کو ان کے مرتبہ پر اتاریں''۔

میں اس کی خاص طور پر تاکید ہے۔

(عظموا كبراء كم)

''عظمت کروا پنے بڑوں کی''۔

میں بھی اس کی طرف توجہ دلائی ہے۔ بہرکیف جب کہ یہ مسلّم ہے، تو اب فرض کرو کہ تمہارے سامنے ایک شخص آتا ہے، جو تم سے عمر میں بڑا ہے، مثلاً: تم بیس برس کے ہو اور وہ تیس پینتیس کا ہے، لیکن چونکہ اس کے چہرے پر ڈاڑھی نہیں ہے، اسلئے بمشکل اس کا امتیاز ہوسکتا ہے کہ وہ تمہارے برابر ہے، یا تم سے بڑا ہے۔ اگر خدانخواستہ برابری کا خیال پیدا ہوا، تو لامحالہ تمدن کے مروجہ قانون کی حیثیت سے تم اس کی حیثیت کے موافق تعظیم نہ کرسکو گے، جس کی وجہ سے علاوہ ایک فرض منصبی کے چھوٹ جانے کی بسا اوقات نقصان اٹھانا پڑتا ہے، بنتا ہوا کام بگڑ جاتا ہے۔

الغرض تمدن کے اس قاعدہ کی نگہداشت اگر ممکن ہے، تو ڈاڑھی کی صورت بخوبی ہوسکتی ہے اور وہی اس کی اکیلی نگہبان بننے کی اصلاحیت رکھتی ہے۔

ڈاڑھی کے حکم وفوائد

سچ تو یہ ہے کہ اگر نظام تمدنی وآئین معاشرت کی اصلاح وشائستگی کے اندر ڈاڑھی کے چند بالوں سے اگر اتنی بھی مدد ملتی ہے، جسے تم گذشتہ صفحات میں پڑھ آئے، تو یقیناً اس کا بار

اتنا گراں نہیں رہتا، جتنا کہ اور قوموں نے سمجھ رکھا ہے، بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ ملت حنیفہ کا کوئی متبع محض اسی وجہ سے اگر اپنے اس شعار کو دنیا کی اور تمام شعائر قومیہ، مذہبی وضع کے مقابلے میں پیش کر کے ''کنتم خیرامۃ'' (تم دنیا کی بہترین امت ہو) کے دعوی کو مدلل کرنے کی جرات کرے، تو بصد فراخ دلی کرسکتا ہے کہ وہ اس کا مستحق ہے اور کوئی اس استحقاق کو اس سے نہیں چھین سکتا۔

اوروں کا حال تو ابھی تک معلوم نہیں، لیکن خود میرا دل تو صرف اسی نکتہ کی وجہ سے بہت کچھ مطمئن ہے، حتیٰ کہ اگر میں حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے کلام کا شارح نہ ہوتا، تو صرف اسی پر قناعت کر لیتا کہ ''کردم اشارتے مکررنمے کنم'' میری عادت ہے، لیکن کیا کیا جائے کہ شاہ صاحب کا قلم جیسا کہ مباحث مشکلہ کی تفصیل و توجیہ میں نہیں تھکتا، یہاں بھی اس کی یکہ تازی وہی ہے، اسلئے میں اضافہ پر مجبور ہوں۔

آپ کے کلام کی دو شرحیں ہوسکتی ہیں، ایک تو ظاہر ہے اور اسی کو میں مقدم کرتا ہوں، فرماتے ہیں:

''وھی تمام ھیئتھم''

''اور ڈاڑھی مرد کی صورت کو مکمل کرتی ہے''۔

مطلب کو ذہن نشین کرانے سے پہلے ایک مثال سمجھاتا ہوں۔ ''ایک درزی شیروانی سیتا ہے، ظاہر ہے، کرتہ، قمیض اچکن وغیرہ میں وہی کپڑے استعمال کئے جاتے ہیں، جو شیروانیوں کے لیے مستعمل ہیں، لیکن چونکہ اچکن اور شیروانی کی صورت اور ہیئت میں فرق ہے، اس لئے درزی شیروانی کے مناسب اس کی قطع برید کرتا ہے، پہلے وہ آگے پیچھے آستین وغیرہ کو سیتا ہے، پھر اس کے بعد اخیر میں کالر وغیرہ بناتا ہے، یا ایک معمار کسی کوٹھی، یا بنگلہ کو تیار کرتا ہے، تو پہلے اس کی دیوار کو اس کی نوعیت کے موافق بلند کرتا ہے، پھر چھت پاٹتا ہے، حتیٰ کہ کنگرے وغیرہ وغیرہ تعمیر کر کے کہتا ہے کہ کوٹھی کی تعمیر تما ہوگئی''۔

اب فرض کرو کہ شیروانی کا مالک اس غریب درزی پر بگڑ کر کہتا ہے کہ یہ تم نے کیا کیا....؟ اس کے اندر دو آستین لگا دیں اور حکم کرتا ہے کہ ایک آستین اس کی اڑا دو، تو کیا تم اسے مجنون و دیوانہ نہ قرار دو گے؟ یا اسی طرح مالک مکان معمار کو اجرت اسلئے نہیں دیتا کہ

اس نے مکان کی چھتوں کو کیوں پاٹا، اس پر خوبصورت کنگرے کیوں بنائے؟ تو کیا ایسے شخص کی عقل پر آفت ومصیبت کا شبہ نہیں؟ اور اگر ہے اور ہونا چاہئے، تو تم کو سمجھنا چاہئے کہ مردوں کی ہیت جو قدرت نے تیار کی ہے، اس کی ابتداء گو ماں کے پیٹ سے ہوتی ہے، لیکن رفتہ رفتہ آخر جوانی کے زمانے میں ایوان رجولیہ کی تکمیل ڈاڑھی کے اوپر ختم ہوجاتی ہے، پس جو شخص استروں کی کھلاڑیوں سے اسے ڈھا دیتا ہے، اس شخص کی مانند نہیں جس نے اپنی شیروانی کی ایک آستین کٹوادی تھی اور اسی کو پہن کر بازاروں میں پھرتا اور سڑکوں پر ٹہلتا تھا، یا وہ اس شخص سے کسی طرح کم ہے، جس نے خواہ نخواہ اپنی کوٹھی کی چھتیں کھلوادیں اور اس کے کنگرے گرادیئے اور یہی مطلب ہے اس جملہ کا: ''وھی تمام ھیئتم''.(اور ڈاڑھی مردوں کی ہیئت کو تمام کردیتی ہے)، پس جو شخص اس کو ضائع کرتا ہے، اپنی ہیئت برباد کرتا ہے، جیسا کہ ایک آستین کی شیروانی والا اپنے لباس کو بگاڑ بیٹھا تھا۔

کہا جاسکتا ہے کہ یہی شبہ مونچھوں کے کٹانے پر بھی وارد ہوسکتا ہے کہ وہ بھی مردوں کی شکل وصورت کے جزء ہیں، ان کا کاٹنا بھی ایسا ہی ہے، جیسا کہ شیروانی سے کسی آستین کو کاٹ دینا، اگر ڈاڑھی کے صاف کرانے سے مردانہ صورت بگڑ جاتی ہے، تو یہی حال مونچھوں کا بھی ہے، مگر دیکھنا یہ ہے کہ شاہ صاحب کا کیا مقصد ہے؟

میں جہاں تک سمجھتا ہوں آپ کی غرض یہ ہے کہ کمال ہر چیز کی نقص سے بہتر ہے اور یہ بطور علوم متعارفہ کے عام طور سے مسلم ہے، حتیٰ کہ کہا جاتا ہے کہ کمال تو چوری اور قزاقی کا بھی کمال ہے اور اسی بنا پر آستین کٹی ہوئی شیروانی ناپسند سمجھی جاتی ہے کہ وہ کامل نہیں، بے چھت کا مکان بے کار قرار دیا جاتا ہے کہ تعمیری تکمیل اس کی نہیں ہوتی ہے اور ڈاڑھی کے صاف کرانے پر جو اعتراض ہے، وہ بھی یہی ہے کہ اس سے بھی جنس ذکور کی صورت ناقص ہوجاتی ہے اور یقیناً یہی مرتبہ مردانہ شکل وصورت میں مونچھوں کو حاصل ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ہر کمال قابل عمل کرنے اور برتنے کی ہے؟ اور اگر ہے، تو پھر ڈاکٹر کبھی دو پاؤں والے انسان کو یک پایہ کیوں بنا دیتے ہیں؟ حالانکہ یقیناً دو ٹانگیں بہ نسبت ایک کے جسم انسانی کے لئے کمال ہیں۔

بلکہ اصل یہ ہے کہ مسلمان سے تم، یا روح تمدن وتہذیب معاشرت باہمی وغیرہ کی

کسی شاخ کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو، وہ کمال نہ صرف قابل اعراض و نا التفاتی ہے، بلکہ مصلح کا فرض ہونا چاہئے کہ وہ اسے ممنوع قرار دے۔

یقیناً سحر ایک کمال ہے اور اعلیٰ کمال ہے، لیکن شارع علیہ السلام اسے حرام قرار دیتے ہیں کہ اس سے امن عام میں برہمی کا سخت اندیشہ ہے، وہ ایسے مخفی اسباب وآلات پر مبنی ہے کہ پولیس کی رعب وداب نہ اسے دبا سکتی ہیں اور نہ ساحر کو اپنے دشمن کے مقابلہ کا خوف ہوتا ہے، بے چارہ ڈاکٹر بھی اسی لئے ہاتھوں کو کاٹتا، اور ٹانگوں کو اڑاتا ہے کہ اس کمال سے بقیہ اعضاء پر بڑا اثر پڑے گا، اس کے زہریلے زخم اپنی جراثیم کو اور دوسرے صحیح وسلام حصے تک پھیلا دیں گے، پس ایسے کمال سے نقص ہزار گنا بہتر ہے۔ اسی طرح میں مانتا ہوں کہ مونچھوں سے مردیت کی حقیقت زیادہ شگفتہ ہوتی ہے، لیکن جیسا کہ تم پڑھ چکے اگر پھیپھڑے کی حفاظت پر دل ودماغ کی نگرانی پر ہم اس کمال کو قربان کردیں، تو تم انصاف کرو کہ کیا برا کرتے ہیں، بلکہ محکمہ ''حفظ صحت'' کا حکم ہونا چاہئے کہ ایسے خوفناک وجود جب کبھی سر نکالیں، تو انہیں قینچیوں کے قدموں سے ٹھکرا دیا جائے۔

ضرورت ہے کہ مونچھوں کے کٹانے پر لوگ مجبور کئے جائیں، جیسا کہ اور بہت سے حفظ صحت کے قانون پر عمل پیرا ہونے کے لیے ان پر زبردستی کی جاتی ہے، مگر اب سوال یہ ہے کہ ڈاڑھی کے اندر کیا مضرت ہے؟ اس سے دل ودماغ، یا روح وجسم کو کیا نقصان پہنچتا ہے؟ اور جب کہ کوئی نقصان نہیں، کسی قسم کا گزند نہیں پہنچتا، تو اے بندگان خدا! مجھے بتاؤ کہ پھر وہ کیوں لائقِ ستردنی وتختہ مشق تراشیدنی ہے، حالانکہ علاوہ کمال ہونے کے وہ اپنے اندر ان منافع کو بھی سمیٹے ہوئے ہے، جس کا بعض حصہ تم پڑھ چکے اور انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ پڑھو گے۔

یہ تو اس عبارت کا ایک ظاہر پہلو تھا، مگر زیادہ ڈوبنے سے اس کا ایک اور دقیق رخ، بھی روشن ہو سکتا ہے۔ غور کرو شاہ صاحب نے تو اسی قدر فرمایا کہ ''ڈاڑھی مردوں کی صورت کو کامل بناتی ہے''۔ اس پر کہا جا سکتا تھا، یہ مان لیا جاتا کہ وہ کامل بناتی ہے، لیکن اس کے منڈانے میں کیا نقصان ہے؟ اسی سوال کا ایک جواب تھا جسے میں نے اب تک بیان کیا، لیکن جب کہ شاہ صاحب ڈاڑھی کو جزء ہیئت جنس ذکور قرار دیتے ہیں، تو بالمحالہ معلوم

ہوتا ہے کہ عدم لحیہ (ڈاڑھی کا نہ ہونا) ان کی ہیئت کی جزء نہیں، پس اب اسی شیروانی کی تمثیل میں صرف اس قدر اور اضافہ کرو کہ ایک شخص اس کی ایک آستین کی جگہ پائجامہ کا ایک پائچہ لگاتا ہے، یا اپنی قمیض کی پشت پر ترکی ٹوپی کا ایک پھندنا جوڑ دیتا ہے، تو کیا مہذب مجلسوں، تعلیم یافتہ سوسائٹیوں میں فسانہ آزاد کے خوجی ہونے سے پہلے، یا لکھنؤ کی قدیم شاہی درباروں کے فریضہ تمسخر کو انجام دینے سے قبل وہ شریک ہوسکتا ہے؟ اور جب کہ نہیں ہوسکتا، تو آہ کہ تم اس قابل رحم شخص کو جس نے اپنے مردانہ صورت کی شاندار شیروانی سے ڈاڑھی کی آستین اڑا کر جنسِ اناث کی سادہ غداری کی باہیں جوڑ لی ہیں، کیوں نہیں کہتے کہ:

"چہ صورتی کہ بھیچ آدمی، نمی مانی"

جس شیروانی میں آستینوں کی جگہ پائچے لگے ہوئے ہیں، انصاف کرو کہ میں اسے شیروانی کس طرح کہہ دوں، حالانکہ میں نے کوشش کی کہ شیروانی ہی کہوں، لیکن طبیعت کی فطری واضطراری احکام کا کیا علاج ہے۔

میں جانتا ہوں کہ اس کی دوسری آستین، اسے کے کالر، اس کے بٹن اور اس کے تمام اجزاء وہی ہیں، جو عام شیروانیوں میں ہوا کرتے ہیں، لیکن پائچے کی اجنبی جزء کا ظلم دیکھو کہ وہ مجھے بجنسہ اسی طرح خندہ پردازی کے لیے مجبور کر رہا ہے، جیسا کہ ایک مرد جس کی مونچھیں بھی تھیں، اس کے اور تمام اعضاء جو، لتیہ بھی ہے، لیکن رخسار مصفے کے اجنبی رکن نے ایک مستہزانہ تبسم پر پھر ایک دفعہ مجھے مضطر کیا تھا۔

غرض یہ کہ مردانہ شکل وشباہت، فحولی ہیت اگر جنس ذکور کے لیے ایک واقع کسوت اور نفس الامری پیراہن ہے اور بلا شبہ ہے، تو یقیناً بقول شاہ صاحب قدس سرہ پیراہن کا ایک جزو ڈاڑھی بھی ہے اور جب کہ وہ جزء ہے، تو علاوہ تمثیلی بیان کے برہانی طور پر بھی وہ شیروانی سے آستین کٹانے کے مترادف ہے کہ جزو کا فقدان نقص حقیقت کو مستلزم ہے، بلکہ اگر تم منطق کے اصول پر جانچو گے، تو نظر آئے گا کہ یہاں ہیئت مردانہ ناقص ہی نہیں ہوتی، بلکہ سرے سے معدوم ہوگئی کہ منطق کا یہ ایک مشہور قانون ہے کہ ہر ایک حقیقت مرکبہ کے کچھ اجزاء ہوتے ہیں، جن کے وجود پر اس چیز کا مدار ہوتا ہے۔ جب تک وہ اجزاء موجود ہوں، شے موجود ہے اور جب ان پر نیستی طاری ہوئی، شے بھی معدوم ہو جاتی ہے۔

مثلاً: وہ درخت جو تمہارے سامنے کھڑا جھوم رہا ہے، اگر اس سے اس کی قوۃ ونشوونمائی اور اس کی شادابی، تروتازگی، اس کی طاقت غاذیہ کو الگ کرلیا جائے، تو پھر کیا وہ درخت باقی رہ سکتا ہے؟ اور اگر رہتا ہے، تو پھر جمادات اور نباتات میں کیا فرق رہ جاتا ہے؟ اسی طرح اگر اس سے طول کو بھی، عرض کو بھی، عمق کو بھی، یعنی: جسمیت کو علیحدہ فرض کرلیا جائے، تو پھر کہیں اس کی ہستی نظر آسکتی ہے؟ ان ہی چیزوں کو منطق میں ''ذاتیات'' کہتے ہیں، جو اشیاء کے قوام حقیقت میں گھل مل کر اس کے لیے باعث وجود بن جاتے ہیں۔

پس اسی اصول منطقی کو پیش نظر رکھتے ہوئے اگر میں یہ کہوں کہ ڈاڑھی کے معدوم ہوجانے سے مردانہ حقیقت نہیں، بلکہ مردوں کی ہیت کی حقیقت نیست ونابود ہوجاتی ہے؟ تو دنیا کا کوئی فیلسوف منطقی مجھے اس سے نہیں روک سکتا کہ آخر ڈاڑھی میں بھی تو فحولی ہیئت کی ایک جزو ہے، جیسا کہ درخت کو جسمیت سے معرا کرنے کے بعد اس کی ہستی ناپید ہوجاتی تھی۔ یہ الگ گفتگو ہے کہ منطق کا یہ نظریہ کہاں تک صحیح ہے، لیکن مجھے تو ایک الزام قائم کرنا تھا اور وہ مکمل ہے کہ اس وقت قدیم وجدید مناطقہ خصوصاً مغرب کے اصحاب کا بھی اس پر اتفاق ہے۔ کفالکم بهم قدوة۔

مجھے کسی کی دل شکنی منظور نہیں کہ طریق عمل یہ نہیں ہے، تاہم طرز گفتگو تو یہی ہے صلاح کی، جس کو ضرورت ہو، وہ خود اپنے انصاف عدل کے میخانہ جذبات میں ڈوب جائے کہ وہاں وہ سب کچھ نظر آجاتا ہے، جو یہاں کبھی نظر نہیں آتا۔

غفر الله الشاعر حيث قال:

درمیخانہ رابکشا کہ ہیچ از خالقہ نکشود
گرت باور بود، ورنہ سخن این بود ما گفتم

ڈاڑھی کے متعلق حضرت شاہ صاحبؒ اس کے بعد فرماتے ہیں:

"وهی جمال الفحول".

''اور وہ مردوں کی خوبصوری ہے''۔

میرے خیال میں یہ دراصل ایک سخت معارضہ کا جواب ہے، تفصیل اس کی یہ ہے کہ گذشتہ جس قدر باتیں بھی بیان کی جاچکی ہیں، وہ زیادہ تر دو باتوں پر مبنی ہیں۔: (۱) ڈاڑھی

منڈانے میں کوئی فائدہ نہیں (۲) اوراس کے رکھنے میں بہت سے منافع ہیں۔

پہلا مقدمہ اگرچہ عام مسلمانوں کے نزدیک بدیہی ہے،لیکن تاہم پھر بھی موجودہ زمانہ میں، بلکہ ہمیشہ سے ایک جماعت چلی آتی ہے، جس کو یہ تسلیم نہیں، بلکہ اس کے برخلاف منڈانے کے بہت سے فائدہ ان کی طرف سے بیان کئے جاتے ہیں، جن میں سب سے زیادہ اہم فائدہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ ڈاڑھی سے میناء حسن و جمال پر بال آجاتے ہیں۔کہا جاتا ہے کہ ثبوت کے لیے مشاہدہ سے زیادہ قوی چیز اور کیا ہوسکتی ہے؟عموماً یہ بحث ہراس مجلس میں پیش کی جاتی ہے، جہاں ڈاڑھی کے حامیوں کا اجتماع اس کے مخالفوں کے ساتھ ہوجاتا ہے، ظرائف و لطائف کی بھرمار دونوں جانب سے ہوتی ہے، حتیٰ کہ شعرو شاعری تک نوبت آجاتی ہے۔

عام طور سے جواس معارضہ کا جواب دیا گیا ہے، میں نے اکثر دیکھا ہے کہ اس میں زیادہ تراس پر زور دیا جاتا ہے کہ مردوں کوحسن و جمال کی کوئی ضرورت نہیں، یہ عورتوں کے لیے ہے،لیکن شاہ صاحب قدس سرہ نے ایسا نہیں کیا ہے،انہوں نے مردوں کے لیے جمال کی ضرورت تسلیم کی ہے؟ اگرایسا نہ کیا جائے ،تو شعار کے لیے جواصول مقرر کئے گئے ہیں، ان کی یہ صریح خلاف ورزی ہوگی۔یاد ہوگا کہ شاہ صاحب نے فرمایا تھا کہ شعار کے لیے جہاں اور باتوں کی ضرورت ہے، منجملہ اس کے یہ بھی ہے کہ عام میلان طبعی اس کی طرف ہو۔ظاہر ہے کہ حسن و جمال خواہ ظاہری، یاباطنی کون اس کا گرویدہ نہیں؟ کون چاہتا کہ اس کی صورت و معنی دونوں خوبصورت اوصاف کیساتھ موصوف نہ ہوں؟

قرآن مجید نے بطور توبیخ وزجر کے فرمایا:

﴿قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللّٰهِ الَّتِىٓ أَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ﴾

(الأعراف: ۳۲)

”خدانے اپنے بندوں کے لیے جو زینتیں پیدا کی ہیں، اس کو کس نے حرام کیا“۔

خود سرور کائنات ﷺ پر کبھی کبھی ہزار درہم کا کپڑا دیکھا گیا ہے۔اصحاب نبی کریم ﷺ تجمل سے کبھی پرہیز نہیں فرمایا کرتے تھے۔حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو جب

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے خارجیوں کی فہمایش کے لیے روانہ فرمایا ہے، تو کون نہیں جانتا کہ اس وقت وہ ایک نہایت نفیس گھوڑے پر عمدہ لباس، نہایت قیمتی عطر لگائے ہوئے تشریف لے جارہے تھے، حتیٰ کہ جب خارجیوں نے پوچھا: ''ابن عباس! تم تو بڑے نیک لوگوں میں شمار کیے جاتے ہو، یہ جباروں کے لباس میں آپ کو ہم لوگ کیا دیکھتے ہیں''۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس وقت یہی آیت پڑھی اور فرمایا کہ: ''اگرچہ یہ آیت ان لوگوں کی شان میں ہے، جو بیت اللہ کے طواف کے وقت ننگے ہو جاتے تھے، لیکن پھر بھی حکم عام ہے''۔

ائمہ میں امام مالک کے لباس فاخرہ زبان زدعام ہیں۔ خود حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ جو چادر اوڑھا کرتے تھے، اس کی قیمت چار سو اشرفیوں سے کم نہیں ہوتی تھی اور صرف یہی نہیں اپنے شاگردوں کو بھی اس کا حکم دیا کرتے تھے۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق تو اس قدر مشہور ہے کہ وہ اچھے لباس پہننے کے بعد فرمایا کرتے کہ میری بیویاں اور باندیاں زیادہ ہیں، میں اپنے کو مزین کرتا ہوں، تاکہ وہ دوسری طرف توجہ نہ کریں۔ حضرت زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ پچاس پچاس دینار میں کپڑے خریدتے اور ذرا سا بھی پرانا ہوتا، اسی وقت صدقہ کردیا کرتے۔

بہرکیف فقہاء کی تصریح موجود ہے کہ تجمل وتزین مستحب ہے، صحیح حدیث ہے:

قال النبی صلی اللہ علیه وسلم: (ان اللہ اذا انعم علی عبد احب ان یری اثر نعمة علیه).

نبی ﷺ نے فرمایا: ''خداوند تعالیٰ جس کسی بندہ پر انعام فرماتا ہے، تو چاہتا ہے کہ اپنی نعمتوں کا اثر دیکھے''۔

البتہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ان کی عباء اکثر پیوند دار ہوتی تھی، یہ اس لئے نہ تھی کہ آپ قصداً ایسا کرتے تھے، بلکہ آپ کی آمدنی جو کچھ مقرر تھی، اس میں اتنی گنجائش ہی نہیں پیدا ہوئی کہ آپ عمدہ کپڑے خرید سکتے۔ آپ رضی اللہ عنہ خلیفہ تھے، خلافت کے کام سے اتنی فرصت کہاں ملتی تھی کہ اوروں کی طرح مکاسب کی طرف متوجہ ہوتے۔ بہرکیف یہ تو میسر آنے پر ہے اور جس کو میسر نہ ہو وہ کیا کرسکتا ہے۔

الغرض جب کہ جمال، تزین سے شرع اسلامی مانع نہیں، بلکہ ایک حد تک اس کی معلّم ہے، تو پھر یہ کہنا کہ خوبصورتی، یا جمال کی مردوں کو کوئی ضرورت نہیں، ایک بے معنی کلام ہے، اس کے علاوہ سراسر رہبانیت اور جوگ کے مرادف ہے۔ آج دنیا کے اکثر مذاہب وملل کے مقتداؤں میں سب سے بڑا اور رسیدہ مقتداء وہی ہے، جو سب سے زیادہ کریہ المنظر اور گھناؤنا ہو۔ زیادہ تفتیش کی کیا ضرورت ہے، ہاتھ میں چونٹے لے کر جنگلوں میں پھرنے والے سادھوؤں، خاک آلود چہرے اور کمر میں رسی باندھ کر وعظ کہنے والے پادریوں کے بالوں میں ڈوبے ہوئے لب و دندان تم کو اس کا جواب بخوبی دے سکتے ہیں، پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ جو مذاہب اپنے پیرؤوں کو جنگل میں نہیں، شہروں میں رہنے کا حکم دیتا ہے، ترک علائق کا نہیں، بلکہ ان کے پیدا کرنے کی طرف برانگیختہ کرتا ہے، وہ تمدن کے خلاف کوئی ایسا حکم صادر کرے، جس پر آبادیوں میں رہ کر عمل ناممکن ہو، بلکہ غور کرنا چاہئے کہ واقعہ کیا ہے اور اصول اسلامیہ کے اعتبار سے اس کی صحیح توجیہ کیا ہوسکتی ہے؟ میں نے یہاں تک شاہ صاحب کے کلام کا جو مطلب سمجھا ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ یہاں تین صورتیں پیدا ہوتی ہیں:

(۱) ڈاڑھی بالکل منڈا دی جائے۔

(۲) اپنی اصلی حالت پر چھوڑ دیا جائے، جس حال میں رہے، رہنے دیا جائے۔

(۳) درمیانی صورت اختیار کی جائے کہ نہ بالکل منڈا دی جائے اور نہ چھوڑ دیا جائے، بلکہ وقتاً فوقتاً اس کو درست کیا جائے، تیل وغیرہ لگا کو کنگھیوں سے اس کی اصلاح کی جائے اور قدر معتد بہ سے بڑھ جائے، تو اسے تراش دیا جائے۔

ان تین صورتوں میں دوسری صورت یقیناً حسن و جمال کے منافی ہے اور اسی طرح پہلی صورت باعتبار عرف عام حسن و جمال کی مؤید ہے، البتہ تیسری صورت قابل غور ہے، اب اس کا سمجھنا عقل سلیم پر موقوف ہے کہ آیا تیسری صورت میں جمال وزینت میں مدد ملتی ہے، یا نہیں؟ وجدان کے علاوہ اس پر اور کیا چیز دلیل ہوسکتی ہے؟ تاہم فرض کرو کہ تمہارے سامنے دو آدمی آتے ہیں اور دونوں ڈاڑھی والے ہیں، دونوں آنکھ، ناک، کان، رنگ وعمر وغیرہ میں مساوی ہیں، مگر ایک کی ڈاڑھی الجھی ہوئی، بکھری ہوئی ناف تک پھیلی ہوئی ہے اور

دوسرے نے اسے ہر چار طرف سے برابر کرنے کے بعد اس میں کنگھی وغیرہ کر کے اسے درست کیا ہے، بتاؤ کہ آیا دونوں جمال میں برابر ہیں، یا کوئی ان میں زیادہ وجیہ وخوبصورت معلوم ہوگا؟ ظاہر ہے ثانی الذکر شخص سے پہلے کو کوئی نسبت نہیں، معمولی سی عقل رکھنے والا آدمی بھی پہلے کو دوسرے پر ترجیح نہیں دے سکتا۔ پس اسی سے معلوم ہوا کہ ڈاڑھی رکھنے کی صورت میں بھی انسان حسن و جمال حاصل کر سکتا ہے اور وہ اس کے لئے ہر حیثیت سے کبھی منافی نہیں۔

پس اگر تھوڑی دیر کے لیے تسلیم بھی کر لیا جائے، ڈاڑھی منڈانے سے خوبصورتی پیدا ہوتی ہے، لیکن یہ بے انصافی ہے کہ اس کے صرف ایک پہلو پر نظر ڈالی جائے، ضرورت ہے کہ اس کے مضرات نقصانات پر توجہ ہونی چاہئے، جس کے متعلق بعض باتیں میں کہہ چکا۔ علی الخصوص جب کہ رخسارہ کی صفائی عورتوں کی فطرتی زینت ہے، تو مردوں کا بھی اسی سے زینت حاصل کرنا ایسا ہے، جیسا کہ کوئی مرد اپنے کان میں بالیاں اور بجلیاں ڈال کر اپنے کو خوبصورت بنائے، یا ناک میں بلاق وغیرہ اسلئے پہنے کہ میں خوبصورت ہو جاؤں گا، حالانکہ کوئی مرد اس کو تجویز نہیں کر سکتا اور تو اور یورپ جس نے اپنے کو حیوانوں پر قیاس کر کے بہت فطرتی حدودِ انسانی کو توڑ دیا ہے، وہ بھی مردوں کے لئے میمون کا سایہ، یا ان کے لباس کو تجویز نہیں کر سکتا، تو بتاؤ کہ حیا پرور غیور ایشیائی شریف اپنے لئے یہ کس طرح تجویز کرے گا کہ جو زینت عورتوں کی ہے، ان سے چھن کر خود اس کو استعمال کرنے لگے....؟!

اور جب کہ صورت حال یہ ہے، تو اس کے لیے کہ خوبصورتی بھی باقی رہے اور عورتوں سے مشابہت بھی نہ ہو، انسان ان نقصانوں سے بچا بھی رہے، جو ڈاڑھی کے منڈانے میں ہے، اس کے علاوہ اور کیا صورت ہو سکتی ہے کہ ڈاڑھی رکھی جائے، لیکن ہمیشہ اس کی اصلاح و درستی کا خیال رہے، جیسا کہ شارع اسلام علیہ السلام والصلوات کا دستور تھا کہ: ”ھی جمال الفحول“۔ ”یہ ڈاڑھی اس وقت مردوں کے لیے خوبصورتی ہے“۔

روایات میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

(من كان له منكم شعر فليكرمه)

”جس کے بال ہوں، وہ ان کی عزت کرے“۔

صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا:

''ما کرامته؟'' ''بال کی عزت ہے''۔

آپ نے فرمایا:

(یدهنه ویمشطه کل یوم)

''اس میں تیل لگائے اور روزانہ کنگھی کرے''۔

امام ترمذی راوی ہیں:

عن عمرو بن شعیب عن ابیه عن جده: ان النبی صلی اللہ علیه وسلم: کان یاخذ من لحیته من عرضها و طولها (ترمذی)

یعنی: ''رسول ﷺ اپنی ڈاڑھی کے طول اور عرض سے کچھ حصہ لے کر ترشوا دیتے تھے''۔

اگرچہ عمر بن ہارون پر لوگوں نے جرح کی ہے اور ارادہ کیا ہے کہ اس روایت کو ضعیف قرار دیں، لیکن اگر روایتاً اس میں غربت ہے، تو درایتہً اس کی توثیق ہوتی ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کو اسوہ نبویہ سے جو شغف تھا، وہ ہر ایک شخص کو معلوم ہے، حتیٰ کہ سفر حج میں آنحضرت ﷺ نے جہاں پر پیشاب کیا، اتر کر وہاں یہ بیٹھ جاتے تھے۔

ان سے بخاری راوی ہیں:

(کان ابن عمر اذا حج و اعتمر، قبض علی لحیته، فما فضل اخذه)

یعنی: ابن عمر رضی اللہ عنہ جب حج، یا عمرہ کرتے، تو اپنی ڈاڑھی کو مٹھی میں لیتے، جو باہر رہ جاتی، اسے کٹوا دیتے''۔

اس سے اس روایت کی یقیناً تائید ہوتی ہے، علی الخصوص حنفیہ کے نزدیک تو ایک مشت سے زیادہ اگر بڑھ جائے، تو اس کا کٹانا بہتر ہے، جیسا کہ امام محمد نے کتاب الآثار میں نقل کیا ہے۔

الغرض ایک معتدل جمال، جس میں تمام پہلوؤں کا لحاظ و پاس ممکن ہے، وہ صرف

اسی صورت میں ہے، جیسا کہ اسلام نے مقرر کیا اور اس بناء پر "وھی جمال الفحول". "اور وہ مردوں کی خوبصورتی ہے" بالکل صحیح ہے۔

تین نمبروں میں ڈاڑھی کے متعلق لکھتے لکھتے میں الگ گھبرا گیا ہوں۔ ناظرین کا الگ دم الجھتا ہوگا، لیکن میں کیا کرسکتا ہوں...! ایک شارح اگر مصنف کی پورے کلام کی شرح نہیں کرتا ہے، تو وہ ایک اخلاقی مجرم وخائن ہے، چونکہ حضرت شاہ صاحب اس کا ذکر کسی طرح نہیں چھوڑتے، اس لئے میں مجبور ہوں۔ علاوہ اس کے عصر حال میں ڈاڑھی کی جو کچھ درگت بنائی جاتی ہے، اس کا بھی مقتضی یہی ہے کہ اس موضوع کو زیادہ پھیلا کر لکھا جائے، تعجب ہے کہ حضرت شاہ صاحب قدس سرہ، کو اس طوفان بدتمیزی کا قبل از وقت کیوں کر علم ہوا، اور نہ صرف اس میں بلکہ "حجۃ اللہ البالغہ" میں وہ جو کچھ بھی لکھتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس وقت لکھ رہے ہیں کہ جبکہ عادات میں اطوارِ فرنگ کا سیلاب ہندوستان پر محیط ہو چکا تھا۔

میں اس کے مضامین پڑھتا ہوں اور شاہ صاحب کے اس مکاشفہ اور خواب کی صداقت دل میں اترتی جاتی ہے، جو اس کتاب کے متعلق مقدمہ میں درج ہے۔

ایک موقعہ پر لکھتے ہیں کہ "میں عصر کی نماز کے بعد خدا کی طرف متوجہ ہوکر (گویا مراقبہ میں) بیٹھا ہوا تھا کہ یکایک سرور کائنات ﷺ کی روح اقدس صلوات اللہ علیہ وسلام متجلی ہوئی اور مجھے اوپر سے ڈھانک لیا، ایسا معلوم ہوا مجھ پر کوئی کپڑا ڈالا گیا ہے اور میرے دل میں یہ بات پیدا کی گئی کہ دین کے اسرار وحقائق کے اظہار وبیان کی طرف اشارہ ہے"۔ اس کے بعد ارقام فرماتے ہیں کہ "میں نے اس وقت اپنے سینے میں ایک روشنی محسوس کی، جو دم بدم پھیل رہی تھی"۔ پھر اپنا ایک اور الہام درج کرتے ہیں: "میرے پروردگار نے مجھے پھر الہام کیا کہ قلم تقدیر نے لکھ دیا ہے کہ میں اس روشن اور بڑے مہم کو انجام دینے کے لیے اٹھوں گا، خدا کے نور سے زمین منور ہو چکی ہے اور اس کی شعاعیں افق سے چمک اٹھی ہیں۔ شریعت مصطفویہ کی بجلیاں اس زمانہ میں تڑپ رہی ہیں کہ انہیں دلائل وبرہان کے پیراہنوں سے آراستہ کر کے دنیا کے سامنے پیش کیا جائے"۔ آگے چل کر ایک خواب کا ذکر کرتے ہیں: "میں مکہ معظّمہ میں تھا کہ خواب میں حضرت حسین وحسن رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو

دیکھتا ہوں کہ گویا دونوں بھائی مجھے ایک قلم عطا فرمارہے ہیں اور فرماتے ہیں یہ ہمارے نانا رسول ﷺ کا قلم مبارک ہے"۔

بلاشبہ یہی ہوا ہے کہ شاہ صاحب نے یہ باتیں لکھی نہیں، بلکہ لکھائی گئی ہیں، خود پیدا نہیں کیں، بلکہ پیدا کرائی گئی ہیں۔ (فصلے اللہ تعالی علی نبیه الذی هو رحمة للعالمین و بامته رؤف رحیم)

اسی لئے دیکھا جاتا ہے کہ جن چیزوں کی اس زمانہ میں زیادہ ضرورت ہے، شاہ صاحبؒ اس کی بہت زیادہ تفصیل فرماتے ہیں۔ بہرکیف ڈاڑھی کے متعلق لکھتے ہیں:

"وفیه تغیر خلق اللہ"۔

"ڈاڑھی کے منڈانے میں خداوند تعالیٰ کی پیدا کردہ چیزوں کو بدل دینا ہے"۔

مقصد گرامی کو سمجھنے کے لیے پہلے ایک مثال سمجھ لینی چاہیئے۔

فرض کیجئے کہ آپ کے سامنے امریکہ کے کسی مشہور کارخانے کا بنا ہوا ایک کلاک (گھڑی) رکھا ہوا ہے اور چل بھی رہا ہے، اب آپ خواہ مخواہ اٹھتے ہیں اور اسے اتار کر کھولتے ہیں اور اس کے بعض پرزوں کو فضول سمجھ کر (حالانکہ آپ کو گھڑی سازی کا کام بھی نہیں آتا) نکال دیتے ہیں، کیا آپ کی یہ حرکت عقل ودانش پر مبنی سمجھی جائے گی؟ اور اگر آپ کی گھڑی کے ساتھ میں حرکت کردوں، تو کیا آپ اس کی اجازت دے سکتے ہیں؟ نہیں کے علاوہ اس کا اور کیا جواب ہو سکتا ہے؟

پس شاہ صاحب قدس سرہ بھی یہی فرماتے ہیں کہ جب کہ تمام ادیان وملل کے ماننے والے خداوند قدیر کو حکیم وخبیر سمجھتے ہیں اور اس حاکم کو اس کی اعلی حکمتوں کا مظہر قرار دیتے ہیں، تو پھر کسی مخلوق نادان کو کیا حق پہنچتا ہے کہ خدا کی بنائی ہوئی مشین کے پرزوں کو بلاوجہ الگ کردے، ڈاڑھی کارخانہ انسانی کا پرزہ ہے اور جب کہ خداوند حکیم نے اسے چہروں پر پیدا کیا ہے، تو اس کے منڈا دینے کے کیا معنیٰ ہیں؟ امریکہ کے گھڑی ساز کی عقل پر تو اعتماد ہے کہ اس کے جمائے گئے پرزوں کو "رتی" کے برابر اپنی جگہ سے ہلانے کو ہم حرام سمجھتے ہیں، لیکن کس قدر حیرت کا مقام ہے کہ خداوند تعالیٰ کی چیزوں کو الگ کردینے میں ہم اس درجہ بے باک ہوں۔ ﴿ماقدروا اللہ حق قدرہ﴾ "خدا کی قدر اس کے حق کے موافق

انسانوں نے نہیں کی''۔

حضرت شاہ صاحبؒ کا مقصد تو یہی ہے، لیکن یہاں پھر ایک اعتراض واقع ہوتا ہے کہ ''مونچھوں کے منڈانے، ناخنوں کے کٹانے، یا ختنے وغیرہ میں کیا ''خلق اللہ'' کی تغیر و تبدیل نہیں؟ پھر شریعت نے اس کا کیوں حکم دیا؟ کیا خدا کی حکمت میں اس سے قدح نہیں عائد ہوتا؟ حالانکہ اس اعتراض کا جواب جملہ ''وھی کمال ھیتھم'' کی شرح میں دیا جا چکا ہے، لیکن آج اسے پھر مکرر کیا جاتا ہے کہ یہاں کچھ اور اضافہ کی ضرورت ہے، اصل یہ ہے کہ خداوند ذوالجلال کے ساتھ مخصوص نہیں، ہم بھی جب کوئی چیز بناتے ہیں، تو اس کی دو صورتیں ہوتی ہیں:

(۱) کبھی تو وہ چیز ہی مقصود ہوتی ہے، مثلاً: ہم مکان اسی لئے بناتے ہیں کہ اس کا بنانا مقصود ہے۔

(۲) اور کبھی وہ دوسری چیز کے لیے وسیلہ اور واسطہ ہوتی ہے۔، مثلاً: مکان بنانے سے پہلے معماروں کے لیے مچان، سیڑھیاں، ٹھٹھر وغیرہ نصب کئے جاتے ہیں کہ ان سے مکان کا بنانا مقصود ہے، نہ خود انکی ذات۔

ان دو قسموں کے احکام مختلف ہیں، پہلی صنف کی چیزوں کو بنا کر بلا وجہ برباد کر دینا سخت بد عقلی ہے، آخر جو مکان تیار کر کے بلاوجہ ڈھاتا رہے گا، اس کے جنون میں کیا شبہ ہے...؟!

اسی طرح دوسری صنف کے لیے بہت ضروری ہے کہ جب مقصد پورا ہو گیا، تو اسے فوراً تباہ کر دیا جائے کہ اس سے پھر اذیت اور تکلیف پہنچتی ہے، مثلاً: جب مکان بن کر تیار ہوگا، تو اب معماروں کی مچانوں اور ٹھٹھروں کو اکھڑوا دینا چاہیئے کہ ان سے رہنے سہنے، اترنے چڑھنے میں اذیت ہوگی، یہی حال خداوند تعالیٰ کی مخلوقات کا ہے، ہم گیہوں بوتے ہیں، مقصود صرف دانہ ہے اور پتے بھس وغیرہ محض دانے کی حفاظت کے لیے پیدا ہوتے ہیں، جب خوشہ پک جاتا ہے، تو ہم دانے چن لیتے ہیں اور بھس وغیرہ کو جانوروں کے حوالہ کرتے ہیں، یا مثلاً ہم روٹی کھاتے ہیں، اس سے خون بھی پیدا ہوتا ہے اور فضلات بھی بضرورت پیدا ہوتے ہیں، خون جسم میں جذب ہو جاتا ہے، گوشت بن جاتا ہے اور فضلات

پسینے، سنک، بول و براز کی صورت میں باہر نکل آتے ہیں۔

پھر جب کہ کائنات میں خداوند حکیم کی اس عادت جاریہ کی کھلی کھلی مثالیں موجود ہیں، تو میں اگر اسی اصول کی بنا پر یہ کہوں کہ ڈاڑھی جسم کے اجزاء مقصودہ میں سے ہے اور مونچھیں، بغل کے بال، ناخن وغیرہ وغیرہ مقصود نہیں، تو مجھے کون روک سکتا ہے، علی الخصوص جب کہ طبیب روحانی صلوات اللہ علیہ وسلامہ نے خود اس کی تصریح فرمائی تو اب کسی مسلمان میں شک وشبہ کی گنجائش رہنے کے کوئی معنی نہیں ہو سکتے؟ لیکن نہیں! میں صرف اسی پر قناعت نہیں کروں گا کہ اسلام صرف سطوت و جبروت سے کام لینا نہیں چاہتا، وہ ایک نیر درخشاں ہے، جس کی کرنیں صرف چمکنے کے لیے اور چمکانے کے لیے ہیں، عقل ودانش کی سرزمینوں کا وہ دن ہے، جس میں ہر چیز نمایاں طور پر صداقت وحقانیت کے پیکر مجسم نظر آتے ہیں۔ تم نے اگر طب کی بعض ابتدائی مسائل کا مطالعہ کیا ہوگا، تو پڑھا ہوگا کہ بالوں کی پیدائش کی علت کیا ہے اور جسم میں یہ کیوں پیدا ہوتے ہیں؟ اور اگر خود نہیں پڑھا، تو مجھ سے سنو، اطباء کہتے ہیں کہ ''انسان کی زندگی کا مدار بدل، یا تحلل پر ہے (یعنی: خون، یا گوشت) جو فنا ہوتا رہتا ہے، ضرورت ہے کہ ہر وقت اس کے مقابلہ میں خون وغیرہ پیدا ہو جائیں اور اسی لئے اس میں بھوک پیدا کی گئی، تاکہ رغبت کے ساتھ غذا کو اندر داخل کرے اور یہی غذا خون وغیرہ بن کر بدل بنتی رہتی ہے، لیکن غذا کا خون بننا قوت ہاضمہ کے علاوہ حرارت پر موقوف ہے کہ وہ اسے پکا کر روٹی سے کیموس وکیلوس، حتیٰ کہ خون اور خون سے گوشت بنا دیتی ہے''۔

بہر کیف حرارت، غذا کو جب پکاتی ہے، تو اس وقت اس سے کچھ ابخرات اٹھتے ہیں، جو انسان کو اکثر بعد کھانے کے محسوس بھی ہوتے ہیں، ان ہی ابخرات (بھاپ) میں جب زیادہ حرارت پہنچ جاتی ہے، تو وہ ابخرات جل جاتے ہیں، جس سے ایک قسم کا دھواں پیدا ہو جاتا ہے اور یہی دھواں بالوں کا مادہ ہے، صورت پیدائش کی یہ بیان کی جاتی ہے کہ ان اوخنوں (دھوؤں) کے بعض اجزاء تو بہت لطیف ہوتے ہیں اور غایت حرارت کی وجہ سے وہ جسم سے اڑ کر باہر ہو جاتے ہیں اور بعض کثیف وغلیظ ہوتے ہیں، وہ جسم ہی کے اندر گھستے رہتے ہیں، حتیٰ کہ طبیعت کو ان سے اذیت پہنچنے لگتی ہے اور امراض وآلام کا احتمال پیدا ہوتا

ہے، اس وقت اضطراراً طبیعت ان کو براہ مسامات باہر پھینکتی ہے، چونکہ کثیف ہوتے ہیں اور ساتھ ہی ابتداء میں ان کی مقدار تھوڑی ہوتی ہے، اس لئے مسامات ہی میں اٹک کر رہ جاتے ہیں، پسینے اور حرارت پھر دیر پائی کی بدولت اس میں ایک خاص قسم کی صلابت اور سختی پیدا ہو جاتی ہے اور یہی بال کہلاتا ہے، لیکن ابھی تک یہ جلد (چمڑے) کے اندر ہی چھپے رہتے ہیں، پھر اسی قسم کے دوسرے اوخنوں کو طبیعت باہر پھینکتی ہے، وہ اپنی جگہ نکالنے کے لیے اس چھپے ہوئے جرم شعری (بال) کو باہر پھینک دیتے ہیں، اسی طرح پے در پے طبیعت وخانوں کو روانہ کرتی رہتی ہے اور یہ آگے کو بڑھنا شروع ہوتے ہیں، حتیٰ کہ وہ سب آپس میں متصل ہو کر ایک دن لمبے اور بالوں کو دراز صورت میں ہمارے سامنے ظاہر ہوتے ہیں۔

۱)......بال اس حرارت کا نتیجہ ہے، جس سے انسان کی غذاء پک کر اس کی زندگی کو برقرار رکھتی ہے۔

۲)......خداوند تعالیٰ نے محض طبیعت کو مضرات سے بچانے کے لیے اوخنہ کو بال کی صورت میں نکال کر انسان کو بہت سی بیماریوں سے محفوظ فرمایا۔

۳)......بال انسان کے اعضاء اصلیہ میں سے نہیں ہے، بلکہ یہ بمنزلہ فضلات، بول و براز، سنک، پسینہ وغیرہ کے ہے، جن کی پیدائش کے بعد حتیٰ الوسع انہیں الگ ہی کر دینا مناسب ہے، علی الخصوص جب کہ اسے کوئی نقصان پہنچنے کا احتمال ہو۔

چونکہ آخری نتیجہ کا یہ بدیہی فیصلہ ہونا چاہئے کہ انسان (خواہ مرد ہو، یا عورت) اپنے سر، ابرو پلک، مونچھ، ڈاڑھی اور اس کے بعد تمام جسم کے بالوں کو منڈا دے، اس لئے علی بن عباس رضی اللہ عنہما نے بالوں کی تقسیم کر کے سمجھانا چاہا ہے کہ کن بالوں کو منڈانا چاہئے اور کن کو نہیں؟ لکھتے ہیں کہ اگر بالوں کا فائدہ صرف اسقدر ہوتا کہ طبیعت (ان کے مادہ، یعنی: دھواں) کی اذیتوں سے بچ جائے، تو اس وقت البتہ یہی کرنا چاہئے کہ تمام بالوں کو جسم سے الگ کر دیا جائے، جیسا کہ بول و براز کے ساتھ معاملہ کیا جاتا ہے، لیکن یہ سراسر غلطی ہے، بلکہ بالوں کی دو قسمیں ہیں:

(۱) ایک تو وہ ہیں جن سے علاوہ فائدہ کے اور بھی منافع ہیں، مثلاً: سر کے بال زینت اور حفاظت دماغ و سر کے لیے ہیں، یا پلک اور ابرووں کے بال علاوہ زیب و زینت کے

آنکھوں کی حفاظت کرتے ہیں۔

(۲) دوسرے وہ ہیں جو محض بالغرض پیدا ہوتے ہیں اور بجز گذشتہ فائدہ کے ان سے اور کوئی مقصد نہیں، جیسے: بغل اور زیر ناف، سینہ، مونچھ اور تمام جسم کے بال۔

علامہ نے ڈاڑھی کو پہلی قسم میں شمار کیا ہے، لیکن اس کا فائدہ صرف حسن اور رعب بتاتے ہیں، مگر تحقیقات کا دائرہ اور روز بروز وسیع ہو رہا ہے۔ میں نے خود تو نہیں دیکھا ہے، لیکن ہمارے ایک فاضل عزیز سید معین الدین (گیلانی) جو انگریزی کے انتہائی مدارج تک پہنچ چکے ہیں، مجھ سے بیان کرتے تھے کہ حال میں ایک یورپین ڈاکٹر نے ثابت کیا ہے کہ بال مجوف (یعنی: خولدار) ہوتے ہیں، وہ اپنی نالیوں کے ذریعہ سے جسم کے بعض زہرلے جراثیم اور مادوں کو کھینچ کھینچ کر دانتوں اور جبڑوں کو آفات سے محفوظ رکھتے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ اگر اس ڈاکٹر کا یہ قول صحیح ہے، تو شاید ڈاڑھی کے بال ان خراب مادوں کو کھینچنے میں جو عورتوں سے بذریعہ ایام (خون حیض) نکلتا ہے اور اسی لئے قدرت نے عورتوں میں ڈاڑھی نہیں پیدا کی کہ ان کو اس کی ضرورت ہی نہیں۔

بہر نوع اگر ڈاڑھی میں یہ فائدہ نہ بھی ہو، جب بھی میرے متذکرہ بالا منافع جنہیں میں چند نمبروں میں بیان کر آیا ہوں، اس کی اہمیت کے لیے کب ناکافی ہیں، بخلاف مونچھوں کے، یا ناخن وغیرہ کے کہ ان سے کوئی فائدہ متصور نہیں، بلکہ نقصان ہوتا ہے، جسے میں مفصلاً بیان کر آیا ہوں، یا آئندہ کروں گا اور اس بنا پر یہ دعوی مدلل ہو جاتا ہے کہ ڈاڑھی مخلوقات الہیہ کے اس صنفِ مقصود میں داخل ہے، جس میں دراندازی کرنے کا حق کسی کو حاصل نہیں اور یہی مراد ہے حضرت شاہ صاحب کی: "وفیہ تغییر خلق اللہ"۔ "اور ڈاڑھی منڈانے میں خدا کی مخلوقات (جو مقصود ہیں) ان کی تغییر لازم آتی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

(ماہنامہ القاسم، دیوبند)

یہودیوں کی ایک زبردست سازش اسلام میں

اسی طرح یہودیوں پر ذلت و مسکنت کی مہر قرآن میں ہو چکی تھی، اس لیے مسلمانوں میں روایت مشہور کی، جس سے زیادہ ذلت آفریں واقعہ ممکن نہیں اور نہ صرف ایک

روایت، بلکہ سینکڑوں باتیں جن سے مسلمانوں کی تو بجائے خود سرورکائنات صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اہل بیت کی سخت اہانت ہوتی ہے۔ میں نمونہً ایک واقعہ ''ناسخ التواریخ'' سے لے کر درج کرتا ہوں، لکھتا ہے: ''جب ابوبکر خلیفہ ہوئے، تو رات کے وقت حضرت علی، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو ایک گھوڑے پر سوار کر کے حضرت حسن وحسین کے ہاتھ پکڑ کے مہاجرین وانصار کے گھر گھر گھومنے لگے، ہر ایک گھر پر کھڑے ہو کر فرماتے کہ میری مدد کرو، چنانچہ چوالیس شخصوں نے مدد کا وعدہ کیا''۔

آپ نے فرمایا: ''صبح سر منڈوا کر مسلح ہو کر ہمارے پاس آؤ اور موت پر بیعت کرو'' مگر خوف کے مارے کوئی نہ آیا، پھر دوسری رات بھی آپ اسی طرح گھر گھر تشریف لے گئے اور لوگوں کو قسمیں دے کر آمادہ کیا، مگر کوئی آمادہ نہ ہوا، آخر آپ قرآن جمع کرنے کے لیے مکان کا دروازہ بند کر کے بیٹھ گئے، عمر رضی اللہ عنہ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہا، اگر علی رضی اللہ عنہ بیعت نہ کریں گے، تو خلافت کو استحکام نہ ہوگا، ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بلوا بھیجا اور بیعت کی درخواست کی، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ: ''کیا اس قدر جلد رسول اللہ صلی علیہ وسلم پر افترا کیا گیا''۔

ابوبکر رضی اللہ عنہ اور ان کے تمام حاشیہ نشین لوگ جانتے ہیں کہ خدا اور رسول خدا نے مجھے خلیفہ مقرر کیا ہے، الغرض دونوں میں اسی طرح مکالمہ ہوتا رہا، دوسرے روز حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ علی رضی اللہ عنہ اور ان کے علاوہ چند لوگ ہیں، جنہوں نے اب تک بیعت نہیں کی، جس طرح ممکن ہو، بلوایا جائے، ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اس کام کے لیے کون مناسب ہوگا؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ قنفذ سے بڑھ کر کوئی نہیں ہوسکتا کہ وہ ایک سخت اور بے مروت آدمی ہے، چنانچہ ایک جماعت بسر کردگی قنفذ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے درِ دولت کی طرف روانہ ہوئی، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قنفذ کو دروازہ ہی پر ٹوکا اور اجازت اندر آنے کی نہ دی، وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچا، عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اجازت کی کیا ضرورت ہے؟ زبردستی گھس جاؤ اور جس طرح بن پڑے، پکڑ لاؤ، مگر قنفذ اس بار بھی کامیاب نہ ہوا، اس نے کہلا بھیجا کہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میں گھر گھسنے نہ دوں گی، عمرؓ کو غصہ آگیا اور کہا کہ عورتوں کو ان معاملات میں دخل دینے کی کیا ضرورت

ہے؟ چند آدمیوں کو لے کر خود مکان پر آئے، لوگوں کو اندر بھیج دیا اور آپ باہر کھڑے رہے اور پکارا: ''اے علی (رضی اللہ عنہ) باہر نکلو! اور خلیفہ رسول اللہ کے ہاتھ پر بیعت کرو، ورنہ اس دروازے کو جلا دوں گا''۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اندر سے نکلیں اور کہا: اے عمر! تمہیں ہم سے کیا تعلق؟''۔ حضرت عمر نے کہا کہ: ''دروازہ کھولو، ورنہ جلا دوں گا''۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ: ''تم خدا سے نہیں ڈرتے، جو بلا اجازت میرے گھر میں آتے ہو''۔ آخر عمر رضی اللہ عنہ مجبور ہو گئے اور لکڑیاں منگوا کر گھر میں آگ لگا دی، جب جل گیا، تو دروازہ کو توڑ کر اندر داخل ہو گئے، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا چیختی چلاتیں باہر نکل آئیں اور اے ابا جان! میری مدد کیجئے کہتے ہوئے رونے لگیں، اس وقت عمر رضی اللہ عنہ نے تلوار کو جو کاٹھی میں تھی، ان کی کمر پر ماری۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ عمر نے کوڑا مارا، فاطمہ رضی اللہ عنہا نے فریاد کی کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ وعمر رضی اللہ عنہ نے خدا کو چھوڑا، دین سے پھر گئے۔

اس وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ کو غصہ آیا اور عمر رضی اللہ عنہ کو پکڑ کر زمین پر دے مارا، ناک وگردن کو ایسا دبایا کہ دم نکل جائے اور کہا حکم قضا اور رسولِ خدا کا عہد میرے ذمہ نہ ہوتا تو، تو میرے دروازہ پر نہ آسکتا تھا، عمر رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ شکار کی طرح شیر کے پنجہ میں قید ہے، فریاد کر کے باہر کے لوگوں سے مدد چاہی۔ قنفذ نے دوڑ کر ابو بکر رضی اللہ عنہ سے ماجرا بیان کیا، ان کو اندیشہ ہوا کہ مبادا کہیں علی رضی اللہ عنہ تلوار کھینچ کر باہر نہ نکل آئیں اور کچھ لوگ اس کے ساتھ ہو کر فتنہ وفساد برپا کریں، پھر پہنچ کر فوراً قنفذ کو واپس لوٹایا اور کہا کہ اس کا انتظام رکھ کہ وہ باہر نہ نکل آئیں، اگر یہ ممکن نہ ہو، تو گھر میں آگ لگا دے، قنفذ دوڑا اور لوگوں کو لے کر گھر میں گھس گیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے تلوار چھین لی، گرفتار کر کے گلے میں رسی باندھی اور اس طرح کھینچتا ہوا مسجد کی طرف لے جانے لگا، فاطمہ رضی اللہ عنہا لوگوں کو دروازہ پر روکتی تھیں، حضرت سے لپٹ گئیں کہ لوگ اُن کو چھوڑ دیں، لیکن قنفذ نے ایک کوڑا زور سے ان کے ہاتھ پر دے مارا، جس کا اثر نمایاں ہو گیا اور وفات تک باقی رہا۔

پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دروازہ کے پٹ کو اس زور سے دابا کہ فاطمہ رضی اللہ

عنہا کی پسلی کی ہڈیاں ٹوٹ گئیں اور حمل ساقط ہوگیا، اسی صاحبزادہ کا نام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے محسن قرار دیا تھا۔

ایک روایت میں ہے کہ اس میں علاوہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ بھی پٹ کے دبانے میں شریک تھے۔حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے بیتاب ہوکر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ہاتھ چھوڑ دیا، قنفذ اسی رسی کو جو حضرت علی کی گردن میں پڑی ہوئی تھی، کھینچتے ہوئے مسجد میں لے آیا۔خالد بن ولید و دیگر انصار وہاں موجود تھے، ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی بیٹھے ہوئے تھے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اگر ہمارے ہاتھ میں تلوار ہوتی، تو اس طرح ہمیں نہیں لا سکتے تھے، واللہ اگر چالیس آدمی میری رفاقت کرتے، تو تمہاری تمام جماعت کو پراگندہ کردیتا، خدا ان لوگوں پر لعنت کرے، جنہوں نے میری بیعت نہ کی۔

حضرت باقر سے روایت ہے کہ اس وقت بجز مقداد رضی اللہ عنہ، سلمان رضی اللہ عنہ، ابوذر رضی اللہ عنہ کے سب مرتد ہوگئے تھے، غرض اس ذلت سے حضرت علی رضی اللہ عنہ، ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش ہوئے، جب حضرت علی رضی اللہ عنہ اس ذلیل حال کے ساتھ مسجد میں پہنچے، تو فاطمہ رضی اللہ عنہا نہایت خستہ و پریشان حال گھر سے نکلیں، بنی ہاشم کی تمام عورتیں ساتھ تھیں، آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر اقدس پر حاضر ہوئیں اور کہا کہ میرے چچا کے لڑکے علی رضی اللہ عنہ کو چھوڑ دو، ورنہ میں اپنے بال بکھیر دوں گی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قمیض اپنے سر پر رکھوں گی اور خدا کی طرف رجوع کرکے چیخوں گی، کیا صالح علیہ السلام کی اونٹنی کی شرافت مجھ سے زیادہ تھی؟ یا اس کا بچہ میرے بچوں سے افضل تھا؟ علی رضی اللہ عنہ نے سلمان رضی اللہ عنہ سے کہا: ”دیکھو، محمد کی لڑکی کے پاس جاؤ، میں دیکھ رہا ہوں کہ مدینہ دو طرف سے زیر وزبر ہو رہا ہے“۔

سلمان نے جا کر کہا کہ اے پیغمبر خدا کی صاحبزادی! خدا نے تمہارے والد کو رحمۃ للعالمین بنایا تھا، اس خیال سے باز آؤ، فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے کہا اے سلمان! کیا تم نہیں دیکھتے کہ یہ لوگ علی (رضی اللہ عنہ) کے قتل کا سامان کر رہے ہیں اور جب وہ قتل ہوں گے، تو مجھ سے صبر ناممکن ہوگا، مجھے چھوڑ دو کہ میں خدا سے فریاد کرو، داد چاہوں۔سلمان نے

کہا خوف ہے کہ مدینہ کہیں دھنس نہ جائے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مجھ کو آپ کے پاس اس لیے بھیجا ہے کہ آپ گھر چلی جائیں، چنانچہ اس فرمان کو سن کر وہ اٹھیں اور گھر روانہ ہو گئیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اسی صورت وہیت کے ساتھ کہ گلے میں رسی بندھی ہے اور قنفذ اس کو پکڑے ہوئے ہے، ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سامنے بیٹھے رہے۔

ابوبکر کہہ رہے ہیں کہ اگر تم بیعت نہ کرو گے، تو ہزار ذلت وخواری سے ہم تمہیں قتل کر دیں گے، حتی کہ جواب وسوال کے ایک طویل سلسلہ کے بعد حضرت ابوبکر نے (العیاذ باللہ) کہا کہ: ''اے علی! دیکھو، اگر تم بیعت نہیں کرتے ہو، تو میں تمہارا سر اڑا دیتا ہوں''۔ یہ سن کر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آنکھ آسمان کی طرف اٹھائی اور کہا کہ الٰہی! تو گواہ رہ اور یہ کہہ کر بیعت کرلی۔

اس واقعہ کی صحت کے متعلق خود یہ واقعہ گواہ ہے پسلی ٹوٹی ہوئی ہڈیوں والی عورت، جس کا حمل بھی ساقط ہوگیا، اس کا دوڑنا اور پھرنا، ہلچل مچانا کیا سمجھ میں آنے کی بات ہے؟ حضرت علی کرم اللہ وجہہ جیسے بہادر جس نے اکیلے اپنے ہاتھ سے در خیبر کو اکھاڑ کر پھینک دیا ہو، اس سے قنفذ جیسے آدمی کا تلوار چھیننا یعنی چہ؟ اسی طرح جن متضاد باتوں سے یہ روایت بھرپور ہے، ہم اس کی تفصیل کرنا نہیں چاہتے۔

اصل یہ ہے کہ یہی وہ روایت ہے، جس میں یہودیوں نے تمام غصول اور کینوں کا اظہار کیا ہے، عبداللہ بن سبا نے اپنے نقیبوں کے ذریعہ سے اسے پھیلا دیا اور جو کچھ رسوائیاں یہودیوں کے ذمہ تھیں اس کا انتقام پورا ہوگیا۔

۱۔ فاتح خیبر کی ذلت ورسوائی قیامت تک اسی روایت کے ذریعہ سے مشہور ہوئی۔

۲۔ یہودیوں کو جس نے خیبر سے جلاوطن کیا، اس کی توہین وتکفیر کے لیے اس میں کافی سامان موجود ہے۔

۳۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے بت پرستی اگر ان کے پیچھے کی، تو ابوبکر جیسے مسلمان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ اقدس کے سامنے مرتد ہوئے۔ (فلعنہ اللہ علی الکاذبین)

۴۔ یہودیوں نے نبیوں کو قتل کیا تھا، اس روایت نے بتا دیا کہ مسلمانوں نے بھی نبی

کی اولاد کو مارا، ان کی پسلی توڑی اور اسی میں ان کا انتقال ہوا۔

الغرض خیبر سے بھاگنے والے یہودیوں کی سازش نہایت کامیاب سازش ثابت ہوئی، عبداللہ ابن سبا ایک بڑا شخص ہوا، جس نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اسلام کے سفید دامن کو ان ذلیل دھبوں سے سیاہ کر دیا۔

دوسرے موقعہ پر:

﴿سماعون للكذب اكالون للسحت﴾

''جھوٹی باتوں کے سننے والے حرام خور ہیں''۔

اور اخیر میں غضب الٰہی ان پر اس قدر شدید ہوا کہ ان کو ملعونیت و منحوسیت کی خبریں وحی میں نازل فرمادیں:

﴿لعن الذين كفروا من بنى اسرائيل علىٰ لسان داؤد وعيسى بن مريم ذٰلك بما عصوا و كانوا يعتدون﴾

''ملعون کیے گئے وہ لوگ جنہوں نے بنی اسرائیل سے کفر کیا، داؤد (علیہ السلام) کی زبان پر اور عیسی ابن مریم (علیہ السلام) کی زبان پر، یہ اس لیے کہ نافرمانی کرتے تھے اور وہ حد سے بڑھ جاتے تھے''۔

ایک دوسرے موقع پر جتلا دیا گیا کہ تم ملعون ہو چکے، اپنی ان حرکتوں کی بدولت جو آئے دن مدینہ میں کرتے رہتے ہو، خدا نے تمہیں ہمیشہ کے لیے مردود کر دیا اور ہر جگہ پٹو گے۔

﴿لئن لم ينته المنافقون والذين فى قلوبهم مرض والمرجفون فى المدينة لنغرينك بهم ثم لا يجاورونك فيها الا قليلا ملعونين﴾

''منافقین (جو اکثر یہود تھے) اور وہ لوگ جن کے دل میں بیماری ہے اور جو مدینہ میں بری بری خبریں اڑاتے رہتے ہیں، اگر اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے، تو ہم تم کو ان کے ساتھ جنگ پر آمادہ کریں گے، پھر یہ تمہارے اردگرد بہت کم رہیں گے''۔

﴿أينما ثقفوا اخذوا وقتلوا تقتيلا﴾

''یہ ملعون ہیں جہاں کہیں بھی رہیں گے، پکڑے جائیں گے اور خوب اچھی طرح قتل کئے جائیں گے''۔

اور نہ صرف اس قدر، بلکہ آسمانی آوازوں میں اعلان کر دیا گیا ہے کہ ان کی ملعونیت اب کسی خاص زمانہ تک محدود نہیں ہے، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خدا کی مار ان پر پڑی اور ذلت و بیچارگی ان پر ماردی گئی۔

﴿ضربت علیهم الذلة والمسکنه وباء وابغضب من الله﴾

''ذلت اور محتاجی ان پر ماردی گئی اور اللہ کے غضب کے ساتھ لوٹے''۔

اور ایک مقام میں نہیں، مختلف مقامات میں اس واقعہ آئندہ سے خبر دی گئی اور صرف انہیں آیتوں میں کیا......! تم قرآن پڑھو، ایک حصہ ہے، جس میں یہودیوں کی شرارت، بے ہودگیوں، سرکشیوں کو اللہ تعالیٰ نے نہایت لفظوں میں ذکر کیا ہے۔

یہود ہر ایک مسلمان کی زبان سے اپنے ان حالات و شفاعات کو سنتے تھے اور مسلمانوں کی جانب ان کی آنکھوں میں خون اتر آتا تھا، جو کچھ ان سے ہو سکا کر گزرے، لیکن وعدہ الٰہی کو پورا ہونا تھا، یہ تباہ ہوئے اور اچھی طرح تباہ ہوئے، حتی کہ ان کا اصلی مقام خیبر بھی حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے دست مبارک سے فتح ہوا اور یہ پہلا واقعہ تھا جس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عداوت کو خصوصیت کے ساتھ ان کے دلوں میں راسخ کرا دیا۔

یہود جب مفتوح ہوئے، تو انہوں نے مسلمانوں سے امن کی درخواست کی، رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی عرض داشت قبول کی۔قول وقرار کے بعد آپ خیبر میں داخل ہوئے کہ اسی عرصہ میں ان لوگوں نے ایک گہری سازش کی، یعنی: سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت کے بہانے سے زہر کھلا دیا، جس کا قصہ عام طور سے مشہور ہے کہ خیبر میں آپ کے سامنے بھنی ہوئی بکری ایک یہودیہ عورت نے پیش کی تھی، جس میں زہر ملا ہوا تھا۔آپ نے جس وقت اس کا لقمہ منہ میں ڈالا، گوشت نے اطلاع دی کہ مجھ میں زہر ہے، آپ نے فوراً ہاتھ اٹھا لیا، ایک صحابی کھا چکے تھے، ان کا تو اسی وقت انتقال ہو گیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس کے اثر سے محفوظ نہ رہے کہ بعض روایتوں میں آپ کی وفات خیبر کے زہر سے ہوئی، جو ایک زمانہ کے بعد پھر ابھرا اور جان ہی لے کر ٹلا۔

بہر کیف یہودیوں کی انہی شرارتوں کے بدولت آپ نے ارادہ کرلیا تھا کہ خیبر سے ان کونکال ہی دیا جائے، مگران مکاروں نے پھر گریہ زاری کی، آخر آپ اس پر راضی ہو گئے کہ تم لوگ ابھی خیبر میں رہو، لیکن ہمیں اختیار رہے گا کہ جب چاہیں، تم لوگوں کو یہاں سے نکال دیں۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے عہد مبارک، بلکہ صدیقی تک وہ اس رعایت کی بدولت خیبر ہی میں رہے، لیکن آئے دن فتنے اٹھاتے رہتے تھے، روز بروز نئی ترکیبوں کے ساتھ مسلمانوں کونقصان پہنچاتے رہے، بالآخر حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسی اختیار کی بنا پر جس کا ذکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قول میں کر چکا ہوں، ان کو خیبر سے جلا وطن ہی کر دیا اور ہمیشہ کے لیے ان مفسدوں سے زمین عرب پاک ہوگئی۔

یہود خیبر سے نکلنے کو تو نکلے، لیکن مسلمانوں کے بغض کا کانٹا ان کے دل سے نہ نکلا اور کیونکر نکلتا، روز بروز واقعات وحالات تو اس کو اور بھی زیادہ گہرا کر کے ان کے دلوں میں پیوست کر رہے تھے۔

الغرض انہی باتوں کا آخری نتیجہ وہ تھا جو اسلام کے لیے ایک فتنہ عظیمہ کی صورت میں ظاہر ہوا اور اس طرح ظاہر ہوا کہ پھر کبھی دب نہ سکا۔

یہودیوں کی دولت برباد ہوئی، ان کا اقتدار مٹا، مسلمانوں کے منہ سے ہر وقت لعن طعن کی بوچھاڑیں ان پر برسیں، ان کا ملک ہاتھ سے گیا، اخیر میں یہ کہ فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کو ملک سے بدر کیا، گھر سے بے گھر ہوئے۔ ظاہر ہے کہ ان سخت سی سخت علتوں سے جو سازش پیدا ہوسکتی تھی، وہ کتنی عمیق اور کس قدر مخفی ہوتی، پتہ تک نہیں چلتا کہ کیونکر اسلام اس سازش کا شکار ہوگیا، تاہم تاریخی واقعات بکھری ہوئی صورتوں میں اس وقت بھی موجود ہیں، ان سے ایک عقلمند صاحب بصیرت آدمی اصل حال تک پہنچ سکتا ہے، تاریخ ''کامل بن اثیر'' میں جو سنیوں کی ایک مستند کتاب ہے، اسی طرح ''ناسخ التواریخ'' میں جو شیعوں کی ایک معتبر اور جلیل القدر تاریخ ہے، ایک واقعہ نقل کیا ہے، جس سے یہودیوں کی اس سازش کا راز واضح ہوتا ہے۔

کامل صفحہ: ۹۸ اور ناسخ التواریخ: ۴۲۵ کا خلاصہ یہ ہے کہ:

جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے وفات پائی اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ

خلیفہ مقرر ہوئے، تو یہودیوں میں سے ایک شخص نے جس کا نام عبداللہ بن سبا تھا، اپنے کو مسلمان ظاہر کیا، اس طرح وہ مسلمانوں میں آ کر شامل ہو گیا، اس کے بعد کچھ معلوم نہیں کہ کس غرض سے وہ مسلمانوں کے مرکزی شہروں میں گھومتا رہا، حجاز آیا، بصرہ گیا، کوفہ پہنچا، شام کے شہروں میں چکر لگاتا رہا، آخر میں وہ مصر پہنچا، وہاں کے مسلمانوں سے اس نے بہت ربط وضبط پیدا کیا، چونکہ اس کی تقریر نہایت شستہ اور بیان عمدہ تھا، لوگ عموماً اس کی باتیں سننے کے لیے اس کے پاس آئے۔

ایک دن بر سبیل تذکرہ اس نے کہا کہ میں اب تک اس مسئلہ کے سمجھنے سے عاجز ہوں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لوٹنے کی خبر پر ہم لوگ یقین کرتے ہیں، لیکن اپنے نامدار سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی موت ابدی کے قائل ہو گئے، حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی کیا حقیقت ہے.....!

اگر حضرت عیسیٰ دوبارہ اس دنیا میں آئیں گے، تو کوئی وجہ نہیں آپ سے جو افضل واعلیٰ ہیں، وہ واپس نہ ہوں، مسلمانوں نے جس وقت اس کی یہ تقریر سنی، تو بہت سے لوگ اس کے حامی ہو گئے اور اکثر مصری مہمان قائل ہو گئے کہ بیشک ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی واپس تشریف لائیں گے اور یہ پہلی بات تھی کہ ایک خاص عقیدہ میں وہ بعض مسلمانوں کا پیشوا ہو گیا، چند دنوں تک تو اس پر زور آزمائی کرتا رہا اور رجعت پسند فرقے کو اس نے عام مسلمانوں سے الگ کر لیا۔

اس کے بعد اس نے پھر ایک دن کہا کہ اگر موسیٰ علیہ السلام کے لیے ایک وزیر ووصی ہارون تھا، تو کیا اس کی فضیلت سے ہمارے رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم محروم تھے..؟ مسلمانو! کیا بات سمجھ میں آسکتی ہے؟ بادشاہ بغیر وزیر کے نہیں ہوتا، نبی بغیر وصی کے نہیں ہوتا، پھر اگر آپ نبی تھے، تو ضرور ہے کہ آپ کا کوئی وصی بھی ہو، امت کی تمام مشکلات کو حل کرنے والا نبی کے بعد وصی ہی ہوتا ہے، پھر مسلمانو حالانکہ وہ موجود ہے، لیکن تمہاری اندھی آنکھوں نے اس کو نہیں پہنچانا، یا پہچانتے ہو، تو پھر تم کو تنبیہ نہیں ہوتی کہ وہ بیچارا کس حال میں گرفتار ہے۔

قاعدہ ہے کہ جب ایک شخص کسی فرقہ کا ایک مسئلہ میں پیشوا ہو جاتا ہے، تو عموماً اور

مسائل میں بھی لوگ اسی کی تقلید کرتے ہیں، مثلاً: ہندوستا میں علم غیب کا ایک مسئلہ ہے، جس کی بدولت مولوی احمد رضا خان صاحب ایک خاص فرقے کے پیشوا ہیں، مگر کیا یہ ممکن ہے کہ ان کے پیروکار اس مسئلہ کے علاوہ کسی اور مسئلہ میں ان کی مخالفت کر سکیں اور یہی حال ہر فرقہ کا ہے، پیشوائی کے لیے صرف ایک مسئلہ کافی ہے۔

جو فرقہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رجعت کا قائل ہو گیا تھا، وہ بیتاب ہوا کہ آخر آپ ہی بتائیے کہ وہ وصی کون ہے، کیونکہ بلاشبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصی کی ضرور ضرورت ہے۔ آخر آپ موسیٰ علیہ السلام سے تو کسی طرح کم نہیں تھے۔ عبداللہ بن سبا کی پہلی کامیابی تھی کہ اس نے مسلمانوں کو وصی کا منتظر بنا دیا اور جب ان کی تمنا حد سے زیادہ ہوئی، تو اس نے اعلان کر دیا کہ وہ وصی حضرت علی کرم اللہ وجہہ داماد اور برادر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، لیکن آہ عثمان نے اپنی زبردستی سے اس کی خلافت پر قبضہ کر لیا، جس طرح ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ نے محض خودغرضی سے ان کو منصب سے الگ کر دیا، مسلمانو! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لانے والے ہیں کیا یہی اسلام وایمان ہے کہ ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصی تو یوں دربدر مارے پھریں اور ظالم و غاصب لوگ ان کی جگہ لیں، ہم اپنے پیغمبر کو کیا منہ دکھائیں گے؟

مصر کے بدقسمت مسلمان اس کو مسئلہ رجعت سے پیشوا مان چکے تھے، چلائے کہ آخر وصی کے حقوق کیونکر واپس ہو سکتے ہیں عثمان کو قوت مسلّم ہے اور تمام فوج ان کے ہاتھ میں ہے، ہم کس طرح حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو خلافت دلا کر اپنے خدا اور رسول کی خوشنودی حاصل کر سکتے ہیں؟

عبداللہ بن سبا اس کی تدبیر پہلے کر چکا تھا، جس مقصد سے اس نے پہلے اسلامی شہروں کا دورہ کیا تھا، اس کے کارآمد ہونے کا وقت آ گیا، اس نے کہا کہ اس کی تدبیر تو آسان ہے، تم میں کچھ لوگ تیار ہو جائیں، وہ اسلام کے مرکزی شہروں میں پھیل جائیں اور عثمان کے مقرر کردہ حکام و قاضیوں کی شکایت سے ہر ایک جگہ بددلی پھیلا دیں، تم جانتے ہو کہ قضاۃ ایک ایسا عہدہ ہوتا ہے کہ جس میں دو فریق کے درمیان محاکمہ کیا جاتا ہے، فیصلہ میں ہمیشہ ایک شخص محروم اور دوسرا کامیاب ہوتا ہے، محرومیوں کو قاضی سے اسی لئے عداوت ہوتی

ہے، تم جس وقت ان کی شکایت کرو گے، ایسے لوگ بکثرت ملیں گے، جو تمہارے ہم نوا ہو جائیں گے، بلکہ اس وقت مسلمانوں میں دولت کی کثرت ہے، عموماً لوگ عیش پسند ہو گئے ہیں، اونچے اونچے مکانات، اچھے کپڑے پہنتے ہیں، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ سلم کے زمانہ میں موجود نہ تھے۔ تم ایسے حکام پر اعتراضات کی بوچھاریں برسانی شروع کردو اور عبرت دلاؤ کہ یہ تمام امور بدعت ہیں اور مسلمان وہ مسلمان نہیں رہے، جو عہد نبوی میں تھے، خواہ مخواہ لوگوں کو تمہاری طرف میلان ہوگا اور ایک بڑی جماعت تمہارے ساتھ ہو جائے گی، اس کے بعد سلطنت میں انقلاب کا پیدا کر دینا آسان ہے۔

الغرض اس کے نقباء ملک میں پھیل گئے، عبداللہ بن سبا ان سے پہلے ہی ہر شہر میں اپنے ہم خیال لوگوں کو چھوڑ کر آیا تھا، جن میں اکثر وہ لوگ تھے، جو یہودی مذہب چھوڑ کر مسلمان ہو گئے تھے۔ جہاں جہاں اس کے نقیب پہنچے، اندرونی طور پر انہوں نے کاروائی شروع کردی، سازش چونکہ مستحکم تھی، بہت جلد مثمر ہوگئی اور شہر میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حکام کی جانب سے دلوں میں عداوت ومخالفت پیدا ہوگئی، عبداللہ بن سبا کے اشارے سے یہ لوگ ایک کمیٹی کی صورت میں مجتمع ہونے لگے، جس کی صدر کمیٹی مصر میں قرار پائی۔

عبداللہ بن سبا نے ایک اور تدبیر بھی بتائی تھی، یعنی: اس نے اپنے نقیبوں سے بتاکید یہ حکم کیا تھا کہ تم ہر شہر کے حاکم کی شکایت دوسرے شہر کے لوگوں کو لکھو، تاکہ عموماً دوسرے شہر کے لوگ اس حاکم سے بدظن ہو جائیں۔

الغرض اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر ایک شہر میں ایک جماعت پیدا ہوگئی، جو اپنے حاکموں سے ناراض تھی اور ایک دوسرے شہر کے رعایا اپنے حاکم کے علاوہ اور دوسروں سے بہت زیادہ برسر پرخاش ہوگئی تھی، حتی کہ رفتہ رفتہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تک بھی یہ خبریں پہنچیں، آپ نے فوراً لوگوں کو بھیجا، انہوں نے جب خفیہ طور پر خود حاکموں کا معائنہ کیا، تو رپورٹ دی کہ شکایات محض بے اصل ہیں، آپ سن کر خاموش ہو گئے، آپ تو خاموش تھے، لیکن عبداللہ کی کاروائیاں وسیع ہو رہی تھیں، حتی کہ جب شورش پسندوں کی ایک کافی جمعیت پیدا ہوگئی، تو متفق ہو کر انہوں نے خلافتِ عثمانیہ سے اعلان بغاوت کر دیا، مصر سے بقول ''ناسخ التواریخ'' دو ہزار آدمی مسلح اور اسی قدر بصرہ، کوفہ سے مدینہ منورہ پایا گاہ خلافت کی طرف

روانہ ہو گئے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہودیوں کی اس سازش کی خبر پہلے دے چکے تھے، آپ نے فرمایا تھا کہ: ''لعنت ہے ذی مروہ، اعوض، ذی انحشب میں اترنے والی فوجوں پر'' اور یہ لوگ انہیں تینوں مقاموں میں اترے، کہا جاتا ہے کہ مصر کا لشکر ذی المروہ اور لشکر کوفہ اعوض اور لشکر بصرہ ذی انحشب میں آ کر اترا تھا۔ بہر حال انہوں نے مدینہ منورہ پر حملہ کر دیا اور اسی جنگ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے اور آہ کہ یہودیوں کا قدیم کینہ آج اس صورت میں ظاہر ہو گیا۔

تاریخ کامل میں ہے کہ ابن سبا کی اس جماعت نے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی لاش کو بے گور وکفن تین دن تک یوں ہی ڈال دیا، حتی کہ آپ کے پائے مبارک کو کتے کھا گئے تھے، اس کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی کوشش بلیغ سے باغیوں نے دفن کرنے دیا اور اسی کے بعد ان تمام فتنوں کا دروازہ کھل گیا، جس کا علم ہر ایک مسلمان کو ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو مصیبتوں میں مبتلا ہونا پڑا، عبداللہ بن سبا نے اپنی اس سازش کا سارا الزام فاتح خیبر کے سر ڈال دیا، مسلمان حضرت علی کرم اللہ وجہہ پر ٹوٹ پڑے اور یوں اسلام کے شیرازہ میں ابتری پیدا ہو گئی، عبداللہ بن سبا نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو وصی مشہور کیا، حضرت ابو بکر، حضرت عمر، حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو غاصب قرار دیا، حتی کہ اخیر میں اس نے اعلان کر دیا کہ ابوذر رضی اللہ عنہ مقداد، سلمان رضی اللہ عنہ کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تمام صحابہ (العیاذ باللہ) ملحد و بے دین ہو گئے تھے، حتی کہ شیعوں میں وہ حدیث جو عبداللہ بن سبا کی اوڑائی ہوئی ہے، اب تک مشہور ہے۔

''ناسخ التواریخ'' جلد دوئم میں ہے:

''از ابی جعفر حدیث کنند قال: ''کان الناس اھل ردۃ بعد النبی صلی اللہ علیہ وسلم الا ثلاثۃ''. پرسش کروند یا ابن رسول اللہ آن سہ تن کیسند''۔

قال: مقداد بن اسود، ابوذر الغفاری و سلمان الفارسی''. فقط

یہ جواب تھا یہودیوں کی طرف سے مسلمانوں کو کہ مسلمان کہتے تھے کہ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد جب کہ تورات لینے گئے، بت پرستی شروع کردی، یہودیوں نے مسلمانوں میں یہ عقیدہ پھیلا دیا کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تمام صحابہ اس وقت مرتد ہو گئے۔

الغرض یہودیوں کا جو کچھ عقیدہ تھا، ان کی جو کچھ رسوائی نصیب ہوئی تھی، ایک ایک کر کے مسلمانوں میں خفیہ طور پر پھیلائی، مثلاً: یہودیوں کا عقیدہ تھا جس کا پتہ "الملل والنحل" سے ملتا ہے، ممکن ہے کہ اب نہ ہو:

> "یہودیوں کا عقیدہ ہے کہ حضرت ہارون علیہ السلام یا تو غائب ہو گئے ہیں اور پھر آئیں گے اور بعضوں کا عقیدہ ہے کہ نہیں، حضرت موسی علیہ السلام نے ان کو قتل کر دیا اور پھر دوبارہ زندہ ہوں گے"۔

مسلمان اس عقیدہ میں مضحکہ اڑاتے تھے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اس نے بھی یہ بات ایک خاص فرقہ تک پھیلا دی، حتیٰ کہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ایک جماعت اب بھی امام العصر کے سرداب سے نکلنے کی منتظر ہے، اسی "الملل والنحل" سے معلوم ہوتا ہے کہ: "یہودیوں کا عقیدہ تھا کہ نبوت حضرت موسیٰ، ہارون علیہما السلام کے اندر مشترک تھی اور حضرت ہارون علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام کے وصی بھی تھے، لیکن جب ہارون علیہ السلام کا انتقال موسی علیہ السلام ہی کے زمانہ میں ہو گیا، تو یہ وصیت یوشع بن نون کے پاس ودیعت کر دی گئی اور موسی علیہ السلام نے سمجھا دیا کہ تورات کے اسرار والواح کے اصلی وصی ہارون کے بیٹے شبیر وشبر ہیں، جب وہ بڑے ہوں، ان کو پہنچا دینا"۔

چونکہ یہ محض بے اصل باتیں تھیں، مسلمانوں نے اس پر لعن طعن کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ عبداللہ بن سبا، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو وصی قرار دے کر شبیر وشبر، حسن وحسین رضی اللہ عنھم کو بنایا، حتیٰ کہ آج آپ دونوں کے نام بھی شبر وشبیر مشہور ہیں۔

(علماء دیوبند کی یادگار تحریریں)

(بحوالہ ماہنامہ القاسم، دیوبند)

الجنۃ والنار

تمہارا عقیدہ ہے کہ سنکھیا زہریلا ہے، اس کے عناصر کی ترکیب امتزاجی نے وہ آتشیں مزاج بہم پہنچایا ہے، جس کی ایک ہلکی سی چنگاری نہر حیوۃ کی چلتی ہوئی کیاریوں کے دھوئیں اڑا دیتی ہے۔ تم یقین کرتے ہو کہ اس کا ایک ہلکا سا ریزہ، بڑے سے بڑے تناور جثوں، فیل پیکہ ہیکلوں کے استوار و محکم نظام کو چند انوں میں درہم و برہم کر دے سکتا ہے اور آہ! کہ تمہیں اپنے اس عقیدہ پر اس درجہ اصرار ہے کہ خود وہ تو وہ، اس کی صورتِ متخیلہ بھی تمہاری نگاہوں میں بھیانک معلوم ہوتی ہے، کھانا تو کجا، اس کے چھونے تک پر تم آمادہ نہیں، مزعفر، کی قعبوں، قورموں کے پیالوں (دو روزہ فاقہ کی شدید گرسنگی کے ساتھ بھی) تم لات مارنے سے اس وقت نہیں جھجکتے، جبکہ خدانخواستہ اس میں ایک رتی سنکھیا ہونے کا یقین نہیں، بلکہ صرف شک ہو جائے۔

یہ سب کچھ ہے اور ہمیں بھی اس کی سمیت جان گسل میں کوئی شبہ نہیں، لیکن کیا تم نے اپنے یقین پرور دل سے کبھی یہ بھی پوچھا کہ آخر اس تصدیق راسخ، اس اعتقاد مستحکم کو تم میں کس نے پیدا کیا؟ کس قطعی وسیلے سے یہ نہ مٹنے والی تسلیم اندرونہ قلب میں اتر آئی۔

کیا اس کی سمیت قاتلہ کو آنکھوں نے دیکھا؟ حالانکہ نہیں دیکھا کہ وہ دیکھنے کی چیز نہیں، تو پھر کیا اس کے زہر کو ناکوں سے سونگھا؟ حالانکہ نہیں سونگھا کہ وہ سونگھنے کی چیز نہیں، پھر کیا اس کے ہل ہل پاش اثرات کو کانوں نے سنا؟ حالانکہ نہیں سنا کہ وہ سننے کی چیز نہیں اور جب یہ سب کچھ نہیں، تو کیا ہاتھوں نے اسے چھو کر ہمیں خبر دی کہ وہ اپنے اندر مرگ پرداز خاصیت کو سمیٹے ہوئے ہے؟ حالانکہ نہیں چھوا کہ وہ چھونے کی چیز نہیں، پھر آہ! جب کہ وہ ان تمام احساسی وسائل کی ادراکی سرحدوں سے باہر ہے، تو کیا میں نے اسے کھا کر سمجھا، چکھ کر جانا؟ حالانکہ یہ بھی نہیں ہوا کہ جس نے اسے کھایا ہے، اس نے پھر کچھ نہیں کھایا، جس نے اسے چکھا، پھر اس نے کچھ نہیں چکھا۔

تم نے دیکھا کہ ایک یقین ہے، تمہارے دل و دماغ میں رچا ہوا ہے، اور اس پر تمہیں

ہر طرح کا اطمینان و بھروسہ ہے، پس اب جبکہ تم کو اپنے حواسوں سے صاف جواب مل چکا ہے، پوچھو ان سے جو اپنے یقینیات کو صرف حواس کی تحصیلوں پر منحصر کر رہے ہیں، ان سے دریافت کرو کہ ع یہ یقین دل میں میرے غیر سبب کیا معنی؟ یقین، واعتقاد، تو حادث ہے، ممکن ہے، پھر علۃ سے غناء تو ممکن نہیں، حواسوں پر علۃ کا شبہ تھا، وہ بھی صاف ہو گیا۔ تم جانتے ہو کہ وہ اس کا جواب اب کچھ نہیں دے سکتے کہ ان کے الات یقینیہ بیکار ہو چکے اور جب وہ نہیں دے سکے، تو اب میں تم سے کہتا ہوں کہ ان حواس پرستوں پر سمجھ کے دروازے بند ہو چکے، ان کے سینے تنگ اور دل تاریک ہو کر برباد ہو چکے اور یہ کوئی عجب نہیں کہ ان کی قسمت میں یہی مقدر ہو چکا ہے۔

﴿ومن یرد ان یضله یجعل صدره ضیقا حرجا کانما یصعد فی السماء کذا لك یجعل الله الرجس علی الذین لا یؤمنون﴾ (الانعام: ۴۱)

''اور جس کے متعلق خدا ارادہ کرتا ہے کہ وہ سیدھی راہ نہ پائے، تو اس کے دل تنگ کر دیتا ہے، حق کے سمجھنے میں وہ ایسا خیال کرتا ہے کہ آسمان کی طرف چڑھ رہا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے بے ایمانوں پر ناپاکیوں کا چھاپا لگا دیا ہے''۔

جھٹلانے والے دماغوں، ٹھٹھے کرنے والے دلوں کا یہی حال ہے کہ فہم وفراست کی بارشیں ان پر روک دی جاتی ہیں، پھر وہ سب کچھ دیکھتے ہیں، مگر سمجھتے نہیں، سب کچھ سنتے ہیں، پر بوجھتے نہیں۔

تم ان کی کوتاہ عقلوں، تنگ سمجھوں پر نوحہ ماتم کرتے ہوئے، فطرت کے مسلمہ قواعد، نظام ہستی کے غیر مکذوبہ اسباب کے اندر ڈھونڈو، ان احمقوں سے الگ ہو کر خود وقفِ جستجو ہو جاؤ۔ کوئی مشکل راز نہیں، چنداں الجھا ہوا عقدہ نہیں کہ سلجھ نہ سکے۔

﴿فمن یرد ان یهدیه یشرح صدره للاسلام﴾

''جن کو خدا سیدھے راستے پر چلانا چاہتا ہے، ان کے سینے اسلامی امور کے سمجھنے کے لیے کھول دیتا ہے''۔

تم غور کرو گے تو واضح ہو گا کہ اصل وجہ اس حدوث یقین کی کچھ نہیں ہے، بجز اس کے جب سے تم نے ہوش وحواس سنبھالے، فہم وادراک کی تم میں طاقت آئی، دنیا کو تم نے اس پر متفق پایا، جس سے سنا، جب سنا، یہی سنا کہ سنکھیا قاتل ہے۔ ہلاہل ہے، زہر ہے، قوموں میں پھرے، کتابوں کا مطالعہ کیا، ہر ایک سمت سے یہی آواز آتی رہی کہ سنکھیا جانسوز ہے، پیغام اجل ہے، سم ہے، یقین کرو کہ یہی متفقہ صدا، یہی اجماع امم، دراصل علت ہے اس نہ ٹلنے والی کیفیت اعتقادیہ کی، جس کے بیان علۃ میں دلدادگان حواس۔

﴿کالذی استهوته الشیٰطین فی الارض حیران﴾

"مثال ان کی جنہیں شیطانوں نے جنگل میں بھٹکا دیا اور وہ سرگرداں ہو رہے ہیں"۔

کے پورے مصداق بن چکے تھے۔

اور بلاشبہ یہ وہ اصل عظیم ہے کہ جس پر ہمارے ہزارہا نظریات، صدہا تصدیقات کی بناء قائم ہے، یہ وہ زبردست آلۂ تصدیق ہے، جس کے مقابلہ میں ممکن ہے کہ غلطی ہو اور ہوتی ہے، بڑی چیز چھوٹی، اور چھوٹی بڑی نظر آتی ہے، رسی کو سانپ کی صورت میں کبھی دیکھتے ہیں اور کبھی سانپ کو چکنی لاٹھی سمجھ کر ہاتھوں سے دھر لیتے ہیں اور یہ صرف میں ہی نہیں کہتا، خود اسی مغرور جماعت کو بسا اوقات اپنی غلطی ماننی پڑتی ہے، بلکہ انتہائی بوالعجبی یہ ہے کہ کبھی جب اپنے مزعومات فاسدہ کے ثبوت میں انک کو دقتیں حائل ہوتی ہیں، اپنے بافہدہ عقائد کو دلائل کے اسلحہ سے خالی دیکھتے ہیں، تو پھر یہ بھی اسی کے سائے میں پناہ لیتے ہیں، تم نے سنا ہوگا کہ کچھ دنوں سے فیثا غورس کی ایک ہونے انہیں دیوانہ بنا دیا ہے، اس نے کہا تھا کہ: "دن رات کے پیدا ہونے کی علت، تبدیل موسم کا سبب، حرکت زمین ہے"۔ جب اس نے یہ کہا تھا اس وقت اس کے منہ پر اس نظریہ کو مار بھی دیا گیا تھا، لیکن یہ "جبارین فی الارض"، جن کی عادت ہے کہ عام مسلمات کے خلاف کسی پارینہ عقیدہ کی احیا کرکے، عصر موجود، اور قرون سابقہ کی عقلوں کا مضحکہ اڑائیں، فیثا غورس کے اس اشارے کو پاتے ہی چلا اُٹھے، ناسمجھی نے ان کی نکیل تھامی اور یہ اس کے پیچھے روانہ ہوگئے، ان سے پوچھنا ہے کہ حرکت تو آنکھوں سے دکھائی دیتی ہے، زمین اگر متحرک ہوتی، تو بجائے اس کی

احساس کے آفتاب کیوں چکر کاٹتا نظر آتا ہے۔ ہمیں اس سے ابھی بحث نہیں کہ یہ اعتراض ان پر کس حد تک صحیح ہے، صرف سنانا یہ ہے کہ اس کے جواب میں انہوں نے بھی اپنے قابل وثوق حاسوں کو بدنام کیا، اون یقینیات کے دیوتاؤں پر، غلط فہمی کا الزام تھوپا، انہوں نے کہا کہ آنکھ کو اگر زمین کی حرکت محسوس نہیں ہوتی، تو اس کی غلطی ہے، آفتاب گھومتا ہوا، اس کو نظر آتا ہے، تو یہ دھوکہ ہے، زمین پر ہاتھ رکھنے سے اگر اس کا چکر آنا معلوم نہیں ہوتا، تو حرکت کا قصور نہیں، قوۃ لامسہ کا گناہ ہے، اگر ہوا میں کوئی چھوٹا سا جسم گھمایا جاتا ہے اور اس کی ہنہناہٹ کان سنتے ہیں اور زمین جو کرّہ ہوا میں اس قدر سرعت سے گھوم رہی ہے، اس کی آواز ان میں نہیں پہنچتی، تو زمین کا کیا جرم، کان ہی بھرے ہیں۔

﴿انظر کیف کذبوا علی انفسهم وضل عنهم ماکانوا یفترون﴾

''تو دیکھو، کس طرح خود اپنے اوپر جھوٹ بولے اور کھوئی گئی ان سے وہ باتیں جو بنایا کرتے تھے''۔

غرض یہی وہ لوگ ہیں، جو کہتے تھے کہ ''جن کو ہمارے حواس نہیں دیں گے، ہمیں ان کے نفی واثبات سے کوئی بحث نہیں''۔ آج دیکھو حواس سے بھی بھروسہ اٹھالیا گیا اور کچھ دور نہیں کہ یونان کے سوفسطائیوں کی طرح دیوانے ہو کر یہ بھی ہلاکت وبربادی کے جنگلوں میں گم ہو جائیں۔

خیر ابھی اس سے کیا بحث، ان مسکینوں کی مردہ عقلوں پر نالہ وشیون کرنے کے لیے ہمارے پاس انشاء اللہ تعالیٰ اس سے کہیں زیادہ سامان موجود ہیں۔ اگر زندگی نے وفا کی، تو اسے بھی کبھی سن لینا، ہمارے ساتھ استہزاء وتحریہ کرتے ہیں، مگر ہمیں ان کی نادان عقلوں پر رونا آتا ہے، رحم آتا ہے۔

﴿مالهولاء القوم لایکادون یفقهون حدیثاً﴾

''آخر اس قوم کا کیا ہو گیا ہے کہ بات سمجھنے کے گرد بھی نہیں بھٹکتے''۔

اس لئے ہمدردی اور سوز جگر سے مجبور ہو کر کبھی کوئی جملے نکل آتے ہیں، ورنہ وقت اس کا نہ تھا، بلکہ گفتگو اس میں تھی کہ مندرجہ بالا اصل سے کسی ثابت شدہ نظریہ کی کیا ہم تکذیب

کر سکتے ہیں؟ تم نے سنکھیا کی مثال میں سمجھ لیا ہو گا کہ یقیناً یہ وہ اصل ہے، جو ہمارے تمام معاشرتی، تمدنی، منزلی امور میں بہ نسبت اورالاتِ ادراک کے بہت زیادہ کارآمد ہے، ہمیں حاسوں کی ادراک کا انکار نہیں، ان کے فوائد سے میں اعراض نہیں کرتا، لیکن کہنا صرف اس قدر ہے کہ جہاں ان پر تصدیقات کی بناء قائم کی جاتی ہے، ان کو نہایت مہتم پیرایوں میں اکتسابِ نظریات کے مواقع میں پیش کیا جاتا ہے، کوئی وجہ نہیں کہ اس کے مقابلے میں توافقِ امم، تواطاء اقوام کے قانون کو حقارت و ناتوجہی کی ٹھوکروں سے ٹھکرایا جائے، کیونکہ تم جانتے ہو کہ جس نے اس کی پروانہ کی اور تمام عالم سے الگ ہو کر غرور و اجتہاد میں مست ہوتا ہوا جدت پرستی کی شراب میں مخمور ہو کر ان عقائد کی زنجیروں کو جن میں تمام عالم، ہر ایک متنفس کی قوی دماغی، جکڑے ہوئے ہیں، توڑ کر مثلاً: سنکھیا کی تاثیرات کو خرافات العجائز کہہ کر آزمائش ہی کے لیے کھا گیا، تو پھر اس کا نتیجہ کس خطرناک صورت میں رونما ہوگا، میں اس کا جواب اس دیوانہ کو کچھ نہیں دینا چاہتا کہ وہ وقت دور نہیں، جبکہ اسی سنکھیا کے لب و دنداں سے وہ جواب اس وقت سن لے گا، جس کے بعد سننا بیکار ہو جاتا ہے اور عبرت و رجوع کا خیال لاسود ثابت ہوا ہے۔ وہ محسوس کرے گا کہ اس کے جسم میں دوڑنے والے خون کھول کر کھول کر خشک ہو رہے ہیں، رگیں اینٹھ رہی ہیں۔ اس کے منہ پر جھاگ جھاگ پر آئیں گے، پیاس کی شدت سے اپنے تمام جسم میں چنگاریاں اڑتی ہوئی نظر آئی گی، وہ چلائے گا، دوائیں مانگے گا، لیکن آہ! کس قدر حسرت کا وقت ہوگا، جبکہ جسم کے ہر ہر عضو سے:

﴿لا عاصم لكم اليوم من امر الله﴾

''آج کوئی خدا کے حکم سے بچانے والا نہیں''۔

سنے گا اور بصد کرب و تکلیف اس کی سانس اُکھڑنے لگے گی۔ آہ! کہ ایک طرف اس کے بیجا غرور، وتشدّد کی دیواریں پست ہو جائیں گی اور دوسری جانب ہمیشہ کے لیے اس آزمائش وابتلاء کے گھر کو، جسے اس نے کھیل، کود، ہنسی، تفریح کا کاشانہ سمجھ رکھا تھا، یکا یک تڑپتے ہوئے چھوڑ دینے پر مجبور ہونا پڑے گا، پھر اس کے بعد جو کچھ ہے، وہ خود جان لے گا۔

﴿وسيعلم اللذين ظلمو اای منقلب ينقلبون﴾

''عنقریب ظلم کرنے والے جان لیں گے کہ کس پھلو قرار لیتے ہیں''۔

آہ! کہ بگڑی ہوئی طبیعتوں کے بوسیدہ عقلوں پر روئیے، واحسرتا! کہ وہ کس قدر ابتر ہو رہی ہے، کم فہمی، بے سمجھی کی کتنی سیاہ وکوہ پیکر موجوں میں وہ ہاتھ پاؤں مار رہا ہے، نجات وفوز کی کشتی سامنے ہے، لیکن وہ مغرور کس درجہ سراب پرست ہو گیا ہے کہ اپنی ناچیز، بے مقدار، قریبِ پرواز ادراکی قویٰ کو پہاڑوں کی چوٹیاں سمجھ کر کشتی پر بلانے والوں کی مشفقانہ آوازوں کو "لعلی ساوی الی جبل" (میں کسی پہاڑ پر پناہ لے لوں گا) کی متجرانہ ڈانٹ کے نیچے دبانا چاہتا ہے۔ اس کی عقل نے سمجھایا کہ پانی کا اس قدر چڑھ آنا جو ہمالیہ کی چوٹیوں کو بھی ڈھانک لے عادت اور نیچر کے خلاف ہے، لیکن اسے کیا معلوم کہ "فطرت" اور "نیچر" کی کہاں تک حد ہے، جس نے موجودات کو طبیعت کا پابند بنایا ہے، اسی نے ان میں کس حد تک طاقت رکھی ہے، اسے کس نے سمجھایا کہ ہر وقت ہر زمانہ ہر گھڑی، ہر مکان کے لئے، طبیعتوں میں کیا کچھ باتیں محفوظ کی گئی ہیں۔ اگر ماضی کا پتہ تاریخ نے بتایا، حال کا اندازہ اس نے خود لگایا، تو مستقبل کی اسے کیا خبر؟ پس یہ غلط ہے کہ "وہ سنۃ اللہ" کا پابند ہے، نہیں، بلکہ اپنے محدود واقفیتوں کا وہ ایک ہی پجاری ہے، وہ اپنی سطحی معلومات کے بت کا اکیلا پرستار ہے، "اف لکم ولما تعبدون" (تف ہے تم پر اور جس چیز کو تم پوجتے ہو) اور پھر اس پر بھی تو قرار نہیں، اس کے معارف ومدارک بھی عجوبہ پردازیوں کی نہایت ہی مضحکہ خیز نمونے ہیں۔ تم خود غور کرو، وہ کس درجہ عجب النظریات ہستی ہے، آہ! کہ یہ وجود، جس کو آنکھوں نے دیکھا اور بارہا دیکھا، چند آنی جانی والی گھڑیوں کے بعد، مشت استخواں سے زیادہ اس کی کوئی وقعت نہیں رہتی، کانوں نے سنا کہ تشدد، استکبار سے لبریز کھوپڑیاں کتنی ہیں، جو آج گدھوں کے کھروں کے نیچے بصد ہزار کس مپرسی پامال ہو رہی ہیں۔ الغرض باوجود اس قطعی تیقن کے کہ ماحصل اس برف اساحیوۃ کا گداخت وزوال کے علاوہ کچھ نہیں اور یقیناً کچھ نہیں، مگر وہ نادان وجھول، صرف صرف اس کے بچانے کے لیے (حالانکہ کب تک بچا سکے گا) کس مستعدی کے ساتھ اضطراری طور پر اس کی حراستہ وحفاظت میں سرگرم کار ہے۔

غصہ کی انتہا دیکھو کہ ایسے موقعوں پر اگر اسے خوف کا کھٹکا بھی ہوتا ہے، کسی چیز کا شک

بھی ہوتا ہے، تو مدہوش ہو کر تمام قوانین عقلیہ سے الگ ہو کر، اسے یقین کی صورت میں بدل لیتا ہے۔ اس وقت وہ شک کا بھی اس درجہ پابند ہو جاتا ہے کہ شاید یقین کا کبھی نہ ہوا ہوگا، اس کا صحیح انداز تم اس وقت کر سکتے ہو، جب وہ اپنی کسی ضرورت سے، آبادیوں کو چھوڑتا ہوا دور نکل جاتا ہے اور یکا یک ہیبت ناک پہاڑوں کے سلسلوں میں اونچے اونچے گھنے درختوں کا خوفناک منظر اس کے سامنے آجاتا ہے، تو اس وقت باوجودیکہ تمام عالم کی متفقہ آواز نہیں، کرۂ امکان کے تمام مشاہیر واکابر کی خبر نہیں اور آہ! کہ ایک لاکھ بیس ہزار آسمانی نشانیوں والوں کی پرزور باجلال تبلیغیں نہیں، کچھ نہیں، صرف شیراز کے بوڑھے آدمی کی ایک ہلکی سی بھنک ع شاید کہ پلنگ خفتہ باشد، سے اس کی ہر رگ وپے کی حرکت طبعی پر ایک زبردست دھچکہ پڑتا ہے، اس کے عضلات واعصاب نفسِ ناطقہ کی پابندی کا جوا اتار کر پھنک دیتے ہیں، بدن پر رعشہ پڑ جاتا ہے، روح حیوانی تمام جسم سے سمٹ کر دل کے کسی کونے میں دبک جاتی ہے، اس کا چہرہ زرد ہو جاتا ہے اور پھر کسی معمولی سی آہٹ (خواہ وہ ہوا کی اٹھکھیلیاں ہی کیوں نہ ہوں) پاکر، یا تو اپنے تمام ہوش حواس سے مفلس ہو کر وہیں کہیں گر کر ایڑیاں رگڑنے لگتا ہے اور اگر کچھ اوسان قائم رکھ سکا، تو وہ حرکت فرار اس کی عجیب ہوتی ہے کہ ابھی ابھی شہر میں تھا، یقینیات کو جھٹلانے میں، متواتر خبروں کی تکذیب میں اسے کوئی باک نہ تھا اور یہاں وہ تمام کلیات بھول کر صرف شک کی بناء پر، بے تحاشا، نامہذب سے نامہذب بھاگ میں پناہ کی راہیں ڈھونڈھتا ہے اور انتہائی سراسیمگی کے ساتھ اپنے اس فانی جسم کو کسی ماموں مکان میں ڈال دیتا ہے۔

تم نے دیکھا! کہ زندگی مستعار کے لیے شک نے اس کے دل میں کس قوی یقین کی صورت حاصل کی اور وہ اس کا کس درجہ فرمانبردار غلام بن کر اس کے اوامر کی بجا آوری میں مشغول ہوا، لیکن تعجب کرو، بلکہ ہنسو! یا افسوس وحسرت کیساتھ غور کرو! اس کی بیمار فکر، مریض نظریں کہ اسی کو جب کرۂ زمین کی اکثر آبادیاں آدم کی تقریباً ہر نسل کی گویا تمام امتیں، متفق ہو کر خبر دیتی ہیں کہ "انسان کی زندگی کا پھیلاؤ صرف دنیا ہی تک نہیں، بلکہ یہ تو راستہ ہے، جہاں کبھی آرام ہے اور کبھی مصیبت ہے، کبھی چین ہے، کبھی بے چینی ہے، ہاں اس کے بعد

پھر ایک دور موت کے بعد آتا ہے، جس میں یا صرف عیش وطرب کے لذائذ ہمیشہ کے لیے ہیں، یا صرف دکھ، درد، رنج ومصیبت کے سامان ہیں جس سے کبھی نجات نہیں"۔

یہ وہ صداقت مشحون آواز ہے، جو صرف بطحاء[1] وحجاز کے کوہستانوں میں نہیں گونجی، سینا[2] ہی کے پہاڑوں سے ٹکرا کر، اسرائیلوں کے لیے باعث نجات نہ بنی، صرف شام[3] و کنعان کے باغوں اور بکریوں کے چوپانوں ہی کے اندر سے نہیں اوٹھی، وہ سعیر[4] ہی کی ان گاؤں اور شہروں میں غلغلہ پرواز نہیں ہوئی، جہاں اسرائیل کی گم شدہ بھیڑوں کی تلاش میں خدا کا بھیجا ہوا آیا تھا۔

بلکہ آپ کو یقین کرنا چاہئے کہ جس طرح ان پاک وبرگزیدہ مقاموں میں اس کی

---

[1]:......یعنی: صرف مسلمانوں کا عقیدہ نہیں، جو آج ایشیاء افریقہ کے ہر شہر اور تقریباً ہر گاؤں میں چالیس کروڑ نفوس کی صورت میں پھیلے ہوئے ہیں، حتیٰ کہ ان کی آبادی کا ایک بڑا حصہ مشرقی یورپ اور امریکہ وجزائر امریکہ میں بھی موجود ہے، الغرض یوں سمجھنا چاہئے کہ موجودہ اقوام میں دنیا کی ایک بڑی قوم، اس اعتقاد کا اقرار اور بہت سی قوموں کیساتھ کر رہی ہے۔

[2]:......سنیا یا سیناء اس کوہستانی سلسلہ کا نام ہے، جس کا ذکر خدا نے "وطور سینین" کے لفظ میں کیا۔ یہاں پر موسیٰ علیہ السلام پر تجلی ہوئی اور تورات ملی۔ نہر سوئس اس کو مصر سے الگ کرتی ہے، اور خلیج عقبہ عرب سے میری مراد قوم یہود ہے، جن کی تعداد بھی دنیا میں لاکھوں سے زیادہ ہے، وہ بھی اس کے مصدقین میں ہے۔۱۲

[3]:......یعنی: ابراہیم علیہ السلام اور یعقوب، اسحٰق، یوسف، ایوب علیہ السلام کے دین میں بھی یہ عقیدہ موجود تھا۔۱۲

[4]:......سعیر اس پہاڑ کا بھی نام ہے، جو عرب کے مردہ دریا سے شروع ہو کر خلیج اٹلانٹک تک پھیل گیا ہے اور ایک دوسری پہاڑی ہے، جس کا ذکر کتاب پیدائش میں ہے، حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب "ہدایۃ الحیاری" میں لکھتے ہیں کہ: "اس کے نیچے "سعیرہ" نامی ایک گاؤں اب تک موجود ہے"۔ ممکن ہے کہ جسے آج کل "ساریس" کہا جاتا ہے وہی ہو۔ اس کے علاوہ وادی حرارہ کے جنوبی طرف ایک گاؤں سعیرہ ہے، لیکن جبل سعیرہ سے وہ بہت دور ہے، بہر کیف اختلاف قرون، وتمادی اعصار سے ممکن ہے کہ وہ جگہ جہاں عیسیٰ علیہ السلام پر تجلی ہوئی ہو، وہ بدل ہو گیا۔ میری مراد اس سے عیسیٰ علیہ السلام ہیں اور آج دنیا کے بہت بڑے حصے میں ان کی امت پھیلی ہوئی ہے، جسکی تعداد بھی ۵۰ کروڑ نفوس سے کم نہیں بتائی جاتی۔ انجیل کے ماننے والے اسی عقیدہ پر اپنی نجات اور آسائش آخروی کے منتظر ہیں۔ الغرض تورات، انجیل اور دوسرے انبیاء کے جو صحف موجود ہیں۔ جنہوں نے اس کے مطالعے میں اپنا وقت صرف کیا ہے، وہ جانتے ہیں کہ یہ تمام کتابیں اخروی عذاب وثواب کی تبلیغیں کھلے کھلے لفظوں میں کر رہی ہیں۔۱۲

صیت جلال ورحمت اٹھ کر کرۂ زمین کے اکثر خطوں تک پھیل گئی، بجنسہ اسی طرح وہ کبھی [1] ہمالہ کے دامنوں میں موجود تھی، تبت [2] وبرہما، جاپان کے سنگستانی علاقوں، جزیروں، میں بھی اس کا اعلان بہت دن تک رہا، فارس [3] کی چمنستانوں میں اس کے راگ الاپے گئے۔

---

[1]...... یعنی ہندوؤں کی قدیم کتابوں میں اسک کا ذکر بالتفصیل موجود ہے، لیکن بنظر اختصار ہم صرف انسائیکلوپیڈیا (دائرہ المعارف عربی) کے قول کو یہاں پر نقل کردینا کافی سمجھتے ہیں:

"رہابراہمہ (یعنی ہنود) توان کے جہنم کا نام "نرکھ" ہے، اور جنت کو ان کی زبان میں سرگ (بیکنٹھ) کہتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ دنیا کی بربادی کے وقت وشنو ظاہر ہوگا، اس کی صورت سپید گھوڑے کی مانند ہوگی، جس وقت وہ زمین پر پاؤں رکھے گا، تو دنیا کے پرزے اڑ جائیں گے۔، پھر نیک لوگوں کو سرگ میں روانہ کریگا اور شریروں کو "نرکھ" میں پھینک دیگا، بیکنٹھ میں ہر طرح کے لذائذ وہ مانتے ہیں اور جہنم میں ہر قسم کے عذاب" ۱۲ (دائرۃ المعارف، صف: ۴۰۰، ج: ۶)

البتہ بعد میں اگر یہ تناسخ، یعنی: اواگون کے قائل ہوئے، میں اس مسئلے پر تاریخی حیثیت سے اس مضمون کے آخر میں بحث کرونگا اور بتاؤں گا کہ یہ عقیدہ ہندوؤں میں کب آیا اور کیوں آیا، اصلی منشاء اس کا کیا تھا۔

[2]...... یعنی بودھ مت کے متبعین بھی اس عقیدہ کو بہت دن تک مانتے آئے، ان مکانوں کی خصوصیت اس لئے کی گئی کہ اب زیادہ تر بودھا کے ماننے والے ان مقامات میں آباد ہیں، اس کی شہادت بھی اسی کتاب سے نقل کی جاتی ہے:

"لیکن بودھین، توان کے نزدیک جہنم کے طبقات ایسے ہیں جو ہمیشہ آگ سے بھڑکتے رہتے ہیں، اور آٹھ طبقات محض منجمد ہیں، ان میں سخت سے سخت سردی پائی جاتی ہے، پوری مسافت جہنم کی ان کے یہاں ۳۴۴ ہزار میل ہے اور اسی طرح جنت کی بھی تفسیریں کرتے ہیں"۔ (دائرۃ المعارف، صف: ۴۰۰، ج: ۶)

اس کا پتہ اس کی تعلیم میں ضرور موجود ہے، لیکن افسوس کہ بعد کو بودھ فرقہ مختلف عقائد، وخرافات کا پابند ہوا۔ اگر ناظرین نے دلچسپی کا اظہار کیا، تو کبھی ان خرافاتوں کو نقل کر کے اسلام کی پاک اور سیدھی تعلیم کے مقابلے میں پیش کیا جائیگا، تاکہ جاننے والے سمجھیں کہ اسلام میں کتنی رحمتیں ہیں۔

[3]...... یعنی پارسی قوموں کا یہی عقیدہ تھا اور ایک حد تک بادنی اختلاف مجوس اس کو ابتک بھی مان رہے ہیں۔ دائرۃ المعارف میں ہے:

"اور پارسی توان کے یاں جہنم کو "درندہ" کہتے ہیں (شاید یہ دوزخ کے ہم معنی لفظ زندی کا ہے) اس کا مالک "اہرمن" ہے، ان کا عقیدہ ہے کہ اورمزد ہر سال اس کے دروازے کھول دیتا ہے اور ۵ دن تک وہ کھلے رہتے ہیں، پھر جو روحیں کہ نجات کی مستحق ہوجاتی ہیں وہ باہر ہوتی رہتی ہیں، عالم کی آخری گھڑیوں میں پہاڑ پگھل جائیں گے اور زمین بدل جائے گی، مردے زندہ ہو کر پھر اٹھیں گے، پھر اہرمن اور مزد (یزداں) کی شریعت کو قبول کرے گا، اور نیکوں کے ساتھ بہشت میں سعادت اور ابدیہ حاصل کرے گا"۔ (صف: ۴۰۰، ج: ۶، خلاصہ) اس سے بھی جو نتیجہ نکلتا ہے، وہ ظاہر ہے بہشت ودوزخ فارسی الفاظ ہیں۔ یہی دلیل ہیں کہ ان کے یہاں بھی یہ کوئی چیزیں ہیں، رہا درمیان کی باتیں کہ اور مزد جہنم کو کھولتا ہے، وہ تھوڑے تغیر کے بعد بالکل اسلام کے موافق ہیں اور دراصل اسلام اسی لئے آیا ہے کہ نظاول ایام سے لوگوں نے مغیبات میں بہت کچھ اپنی جانب سے جو اضافہ کردیا ہے، اسے صاف کردے، لیکن آہ! کہ ہمارے علماء واعظین نے بھی جھوٹی روایتوں کو ـــ راس سے زیادہ طوماروں کے انبار لگا دیئے ہیں! خدا ان پر رحم فرمائے۔

نیل کی[1] وادیوں، افریقہ کی ریگزاروں میں بھی اس کا چرچہ رہا، ایڈریاتک کے اس مغرور ساحل (یونان[2]) سے بھی مدتوں اس کی موجیں ٹکرائیں، وہاں کی عقل کے پجاریوں میں مدت تک اس کا شہرہ رہا۔

یورپ[3] کے ابر آلودہ مطلعوں پر اس کی تصدیق کا آفتاب ہمیشہ چمکتا رہا اور آج تک

---

[1]...... یعنی: قدیم مصری قومیں بھی اس کی تصدیق کرتی تھیں، دائرۃ المعارف میں ہے: ''مصریوں کا عقیدہ ہے کہ مرنے کے بعد آدمی دنیا کے یا قطر اعلیٰ کی طرف جاتا ہے، اسے ''مسکن سعداء'' کہتے ہیں، جو بعینہ ''جنت'' کے معنیٰ کو ادا کرتا ہے، یا قطر اسفل کی طرف، اسے ''مسکن شررہ'' اور ''امنطی'' کہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جہنم کے داروغے ۴۲ ہیں، اس کے دروازے پر تین سر کا ایک کتا بیٹھا رہتا ہے، آدمی کے اعمال تولے جاتے ہیں، تولنے والے فرشتے کا نام ''ہوروس'' اور ''انولیس'' ہے، عمل لکھے بھی جاتے ہیں، لکھنے والے کا نام ''طوث'' ہے، جہنم میں جب آدمی جاتا ہے، تو اس کے جسم کی ہیئت کبھی تو باز کی ہوتی ہے، چہرہ آدمی کا، کبھی وہ کرکی کے شکل پر ہوتا ہے، وہاں کے فرشتے ننگی ننگی تلواریں کھینچے ہر وقت روحوں پر مسلط رہتے ہیں، جہنم کے بعض محافظوں کی شکل سر کٹے بھوتوں کی جیسی ہے، بعض کا دل سینے سے باہر ہے۔ الی غیر ذٰلک۔ (صفہ: ۴۱۰، ج: ۶) مصریوں کی عام عادت ہے، وہ اکثر ان صفات کو جو حیوانوں کے ساتھ خاص ہیں، اپنی تعبیروں میں انہیں کی صورت فرض کر لیتے ہیں اور اسی بناء پر ایسی ایسی تشریحیں کرتے ہیں۔ اسی مقام سے عجائب المخلوقات میں فرشتوں کی صورتیں مختلف طرز کی بنائیں گئیں ہیں، حالانکہ ان کی کوئی اصل نہیں، بعد کو مصری قوم، آواگون کی قائل ہوئی، جہاں تناسخ کی بحث ہوگی وہاں اس کا بھی راز واضح ہو جائیگا۔ فانتظر ۱۲

[2] یونانیوں نے قبل عیسائیت کے بھی اس عقیدہ کی تصدیق کی اور جب تک ارسطاطالیس نے حدوث روح کا دعویٰ نہ کیا تھا، ان کا عقیدہ یہی رہا، بعد کو بعض ارسطو کے معتقدین معاد جسمانی کے منکر، سرور روحانی، و تعذیب روحانی کے قائل ہوئے، تناسخ کے بعد اس مسئلے کی بھی اصل حقیقت سے نقاب انشاء اللہ تعالیٰ اٹھایا جائیگا۔ یونانیوں کے یہاں جہنم کو ''ترتاروس'' کہتے ہیں اور جنت کو ''الیسیوم''۔ دائرۃ المعارف کا مصنف ان کی جہنم کی کچھ تشریح بھی کرتا ہے، لیکن زیادہ تر ان میں وہی واعظوں کے بیہودہ، اور عامیانہ خرافات ہیں، جس سے قدیم مذاہب تو خیر، آج اسلام جس کی تعلیم قرآن وحدیث، فقہ، اسماء الرجال، کی صورت میں جکڑی ہوئی ہے، علماء حق کی کمی نہیں، پھر بھی غلو، اغراق کا اندازہ، بنگال، و گجرات کے شہروں اور قصبوں میں لگاؤ کہ کتنے اعجوبہ پرواز قالبوں میں جنت اور جہنم کے نقشے ڈھلتے ہیں۔ افسوس ہے کہ اسلام حالانکہ تمام دنیا کے مذاہب کی اصلاح کے لئے آیا تھا، اسی لئے اس نے تمام انبیاء کی تقدیس، واسر م کی تعلیم دی، لیکن لوگوں نے اسے ''ماد'' ''سمجھ کر مخالفت پر آمادگی ظاہر کی۔ اسلام کا دعویٰ تھا اور ہے: (کان الناس امۃ واحدۃ) پھر یہ اختلاف عجیب ہے۔

[3] یورپ کی عام قدیم اقوام میں یہ عقید، نہایت صریح لفظوں میں پایا جاتا ہے۔ سلانی اور توتونی (ٹیٹن) نسلوں میں قبل مسیح علیہ السلام کے موجود تھا، ناروے، ڈنمارک وغیرہ کی پرانی آبادیاں اس پر شاہد عدل ہیں، سکندیا کے باشندے (سکنڈنیاویوں) جو گویا اکثر یورپین قوموں، کی اصل اصول ہیں، ان کی زبان میں جہنم کو ''نفلیہم'' کہتے ہیں اور جنت کا نام ''جملۃ'' ہے، ان کا عقیدہ تھا کہ جہنم سات طبقوں پر منقسم ہے، پھر ہر کی تشریح عام مذہبی عقائد سے بہت ہی ملتی جلتی ہے۔ تسبیکن جرمن گالیہ وغیرہ قوموں کے اندر بھی یہ عقیدہ موجود تھا۔ الغرض یورپ کی تقریباً ہر پرانی قوم اس کی مصدق رہی ہے۔ (دیکھو دائرۃ المعارف، صفہ: ۳۹۷، ج: ۶)

وہاں کی آبادیوں میں سوائے چند دہریوں کے ہر ایک شخص اس کا معتقد ہے۔

رومیوں[1] نے اپنی زبردست تمدن کے نشہ میں بھی اس کو فراموش نہیں کیا، کلدانیوں[2] اور بابلیوں نینوا والوں پر بھی اس کی حکومت رہی، سامی[3] نسلوں مین ایسی کوئی نسل موجود نہیں، جس نے انکار کیا، چین[4] کی دیوار کے نیچے بھی آدم علیہ السلام کی اولاد نے یقیناً تمام عالم کی ہمنوائی کی ہے اور اپنے باپ کے اصلی مقام کی پھر خواہش کی ہے اور اخیر میں یہ کہ زمین کے اس پشت آباد پر جو انسانی تجسس سے، مدتوں بے لگاؤ رہ چکی ہے، جس کا تعلق پرانی دنیا سے اس وقت الگ ہوا ہے، جس کی تاریخ کا آج باوجود انتہائی کوششوں کے پتہ نہیں چلتا، کس قدر عجیب ہے کہ وہاں کے نحاسی اجسام والے وحشی بھی جہنم کے خوف سے تھرائے اور بہشت کی غیر مکذوبہ مسرتوں کو یاد کر کے اپنے معبود کے آگے جھک پڑے ہیں

---

[1]:......رومیوں کا عقیدہ اس باب میں یونانیوں سے بالکل متحد ہے، حتی بام بھی وہی ہیجو یونانیوں کے نزدیک تھا۔ دائرۃ المعارف، صفحہ: ۳۹۷

[2]:......دائرۃ المعارف، صفحہ: ۳۹۸

[3]:......دیکھو دائرۃ المعارف، صفحہ: ۳۹۷، عبرانی زبان میں جہنم کو ''شاوٗل'' اور سریانی میں ''شیول'' کہتے ہیں۔ تشریحات ان کی اسلام سے بہت زیادہ اقرب ہیں۔ فردوس کے قریب الماخذ لفظ میں جنت کی تعبیر ان زبانوں میں پائی جاتی ہے۔

[4]:......چین کے متعلق متھولوجی (علم عقائد الاقوام والامم) کے محققوں کا خیال اگرچہ زیادہ تر اسی طرف ہے کہ وہ کسی خاص طرز کا عقیدہ ان چیزوں کے متعلق نہیں رکھتے تھے اور دائرۃ کا مؤلف بھی اسی خیال کے مرجحین میں ہے، مگر جبکہ تاتاری نسلوں میں اس عقیدہ کا رسوخ پایا جاتا ہے، حتی کہ جب وہ جبل ارل اور ممالک تائی وغیرہ سے پھیلتے ہوئے (ٹرین ۱۲) یورپ کے شمالی حصوں میں آباد ہوئے، تو اس عقیدہ کو بھی ساتھ لائے، اس کے بعد پھر اس کا سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ چینیوں میں یہ عقیدہ کیوں نہیں تھا۔ ''شی کنگ'' مجموعہ کلیات، جس میں کنفوشس کی تعلیم جمع کی گئی ہے، تو اس میں صراحۃً اس کا ذکر نہیں ملتا، لیکن جب دیکھا جاتا ہے کہ وہ اپنی دعاؤں اور مناجاتوں میں، ایک ہستی قدیر و جبار کو ''اکاش'' کے نام سے پکارتے ہیں، اس سے نجات کی درخواست کرتا ہے، اس کے خوف سے اس کا جسم لرزتا ہے، تو ہم کو اس امر کے یقین کرنے میں کوئی شبہ نہیں باقی رہتا کہ وہ ضرور مستقر الثواب، ودار العذاب کا قائل تھا، ورنہ نجات اور ہراس کے معنی لغو ہو جائیں گے، خصوصاً جبکہ ارد گرد کی قوموں میں یہ عقیدہ پورے طور پر پایا گیا ہے۔ بہر کیف کنفوشس اور تاؤ کی اشاروں میں علماء متھولوجیا کو اس کے دلائل ملے ہیں۔ ہاں بودہ مت کے پھیل جانے کے بعد تناسخ کا خیال پیدا ہوا اور یہی وجہ ہے کہ وہ عقیدہ مٹ گیا، حتی کہ دھوکہ ہونے لگا، ان میں موجود بھی تھا، یا نہیں۔

اور آج بھی ان ستائی ہوئی نہتی جانوں سے پہاڑ کی کھوہوں اور امریکہ کے صحراؤں میں جا کر دریافت کرو گے، تو اسی اعتقاد پر مرنا اپنے لئے مبارک خیال کریں گے[1] اور اسی[2] قدر نہیں، اکثر جزائر کے برابرہ اور صحرائی اقوام اوشینسا وغیرہ کے رہنے والوں میں بھی یہ پایا گیا۔

ستتبعها رادفها

للسید ابی الضیاء مناظر احسن (گیلانی) مدوّن القاسم والرشید

عفی اللہ عنہ عن والدیہ عن رباہ

(ماہنامہ القاسم دیوبند)

---

[1]:.....امریکہ کے اصلی باشندے جن سے کولمبس کی پہلی دفعہ ملاقات ہوئی اور بوجہ اپنے سرخ جسموں کے وہ نحاسی (تانبہ نما) آدمی، ڈانڈ بن کہے جاتے ہیں، تحقیق کے بعد بخوبی ثابت ہو چکا ہے کہ وہ اس کے قائل تھے اور جو ابھی تک عیسائی نہیں ہوئے ہیں، اسی عقیدہ کو مضبوط طرح تھامے ہوئے ہیں اور عیسائی ہونے کے بعد بھی اس عقیدہ سے کب چارہ کہ وہ دنیا میں اس دعوے کا سب سے بڑا حامی ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھو انسائیکلو پیڈیا عربک ۱۲ (دائرۃ المعارف)

[2]:.....دیکھو! دائرۃ المعارف، صفحہ: ۳۹۹۔ مثیولوجی کے مفتشین نے اپنی تمام تحقیقات کو اس پر ختم کر دیا ہے کہ بادنیٰ اختلاف آخرت کا خیال ہر نفس، ہر روح انسانی کے اندر موجود ہے، جن کی بعض مباحث عنقریب انشاء اللہ تعالیٰ آتے ہیں ۱۲

اسلامی رواداری اور مساوات وبے نفسی کا ایک دل آویز موقع

وہ ایک طرف بیٹھے زاروقطار رورہے تھے

تذکرۂ رحمانیہ، ص:۲۶۱

یہ زاروقطار رونے والے صاحب اردو زبان کی سب سے بڑی انقلابی نظم (مسدّس حالی) کے مصنف مولانا الطاف حسین حالی تھے، ان کے استاذ وشیخ حضرت مولانا قاری عبدالرحمٰن صاحب پانی پتی'' کا انتقال ہورہا تھا، نزع کا عالم طاری تھا، سعادت مند شاگرد اس حال کو دیکھ کر بے قابو ہوگیا اور ڈھاڑھیں مار کر رونے لگا۔ اسی زمانہ میں اخبار میں مضمون بھی لکھا تھا۔ ان الفاظ کے بعد کہ:

''نہایت افسوس ہے کہ پانی پت ایک ایسے بزرگ سے خالی ہوگیا ہے، جو نہ صرف پانی پت کے لیے، بلکہ تمام مسلمانوں کے لیے باعث فخر تھا''۔

مولانا حالی کے ذمہ دار قلم کی اس شہادت کی قدر وقیمت کا اندزہ کیجئے، لکھا ہے کہ:

''جن کا مثل آئندہ زمانہ میں پیدا ہونا محالاتِ عادیہ میں معلوم ہوتا ہے''۔

آخر عربی کے اس مشہور مثالی شعر کو مولانا نے اس موقع پر درج کیا ہے کہ

وما كان قيس هلكه هلك واحد
ولكن بنيان قوم تهدما

خود ہی ترجمہ بھی اس شعر کا اردو میں بایں الفاظ فرمایا ہے:

''قیس کا مرنا ایک آدمی کا مرنا نہ سمجھو، بلکہ وہ قوم کی بنیاد تھی جو گرگئی''۔

(تذکرۂ رحمانیہ، ص:۲۶۷)

قاری صاحب کیا تھے، کن کن کمالات وصفات سے سرفراز تھے، جاننے والوں کے لئے شاید اس سلسلہ میں اتنا لکھنا کافی ہوسکتا ہے کہ سیدنا شاہ عبدالعزیز کے نواسے حضرت

مولانا شاہ اسحاق صاحب کے ارشد تلامذہ میں ایک غیر معمولی ممتاز ہستی اپنے زمانہ میں قاری صاحب کی بھی شمار ہوتی تھی، جیسا کہ معلوم ہے نسبی طور پر خانوادۂ ولی اللّٰہی کی علمی و عملی خصوصیتوں کے آخری چشم و چراغ شاہ اسحاق رحمۃ اللہ علیہ ہی تھے۔ غدر سے پہلے ہندوستان اپنی زبوں حالیوں میں جس حد تک پہنچ چکا تھا، شاہ صاحبؒ ان کے دیکھنے کی تاب نہ لا سکے، انتہائی بے سروسامانی کی حالت میں وطن (سرزمین ہند) کو سلام کر کے ہجرت کی نیت سے حجاز پہنچے اور خاک پاک حجاز ہی میں آسودہ ہوئے، مکہ معظّمہ کے مشہور مقبرہ ''جنت معلیٰ''میں محوِ خواب ہیں۔

قاری صاحب کی علمی جلالتِ شان کا اندازہ اسی سے ہوتا ہے کہ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی، حکیم الامت حضرت مرشد تھانوی جیسے بزرگوں نے تبرکاً قاری صاحب سے حدیث کی اجازت حاصل کی تھی۔ ان ہی اجازت حاصل کرنے والوں میں ایک طرف نواب صدر یار جنگ، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مغفور بھی نظر آتے ہیں اور دوسری طرف قاری صاحب کے حلقہ افادہ میں شمس العلماء مولانا الطاف حسین حالی کو بھی ہم پاتے ہیں۔ لکھا ہے کہ:

''مولانا (حالی) نے حضرت (قاری صاحب) سے صحاح ستہ کی کتابیں پڑھی تھیں''۔ (تذکرۂ رحمانیہ، ص:۲۷)

جس کے معنی یہی ہیں کہ ہم وطنی کے علاوہ مولانا حالی نے قاری صاحب کو بہت قریب سے دیکھا تھا اور اپنے ان ہی ذاتی مشاہدات و تجربات کی بنیاد پر کم از کم ان کا ذاتی احساس کہیے، یا خیال یہی تھا کہ اب دنیا ان نمونوں کو شاید کبھی نہ دیکھ پائے گی، جن کی نمائندگی قاری صاحب نور اللہ ضریحہ کا وجود کر رہا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ قاری صاحب کے زمانہ میں جدید تعلیم کے اسکولوں اور مدرسوں سے ملک روشناس ہو چکا تھا، لیکن قاری صاحب ان نئے اسکولوں کو کس نظر سے دیکھتے تھے؟ اس کے لئے یہی کافی ہے کہ بجائے ''تعلیم گاہوں'' کے ہمیشہ ان اسکولوں کو وہ ''مچھلے'' کے نام سے موسوم کرتے رہے۔

(دیکھئے ان کی سوانح عمری)

بہر حال ان کی تربیت و تعلیم اول سے آخر تک پرانے نظام ہی کے تحت ہوئی تھی، ان

ہی پرانے خیال والے مسلمانوں میں وہ پیدا بھی ہوئے۔ ان ہی کے حلقائے درس و تدریس میں لکھاپڑھااور ساری زندگی اسی ماحول میں گزاردی، لیکن باوجوداس کے کرکر کے جو کچھ وہ دکھاتے رہے، اس کا اندازہ آپ کو ان چند خاص نمونوں سے ہوگا۔ قاری صاحب کے صاحبزادے مولانا عبدالسلام راوی ہیں کہ ریل کے سفر میں وہ اپنے والد ماجد کے ساتھ تھے، ڈبہ جس میں قاری صاحب سوار ہوئے بھرا ہوا تھا، زیادہ تعداد ہندو مسافروں کی تھی، قاری صاحب کی خاص شکل وصورت کو دیکھ کر خود بخود مسافروں نے خواہش کی کہ آپ، تنگ ہوکر نہ بیٹھیں، ہماری طرف پاؤں پھیلا لیجئے، جواب میں اپنے مذہب (اسلام) کا حوالہ دیتے ہوئے وقت کا ایک محدّث ان ہی ہندو ہم سفروں سے یہ کہہ رہا تھا:

''میرا مذہب اجازت نہیں دیتا کہ کسی انسان کے چہرے کی بے ادبی کروں، ہم ہر شخص کے چہرے کا احترام کریں گے''۔ (تذکرۂ رحمانیہ، ص:۲۰۷)

اس لیے باوجود اجازت، بلکہ اگر حضرت والا پاؤں پھیلا دیتے، تو شاید ان کے ہم سفروں کو مسرت ہی ہوتی، لیکن ''انسانیت'' کے احترام کی تعلیم مذہب کی طرف سے اس کو جو ملی تھی، اسی پر اصرار کرتے ہوئے سفر کو پورا فرمایا۔ لکھا ہے کہ سفر کے ان رفیقوں سے حضرت نے یہ بھی ارشاد فرمایا:

''تمہیں اختیار ہے جس طرح چاہو بیٹھو، مگر میں اپنے اصول کے خلاف نہیں کروں گا''۔

سفر میں جس کا یہ حال تھا، حضر میں اس کے ہم وطنوں کو اس رنگ میں اگر پایا گیا تھا، تو اس پر تعجب کیوں کیجئے، لکھا ہے کہ جس گلی یا بازار سے گزرتے اور کوئی ہندو حقہ پیتا ہوتا، تو حضرت کو دور سے آتا دیکھ کر حقہ اُٹھا دیتا، یا ادھر اُدھر ہو جاتا''۔

دوامی عادت پانی پت کے ان ہی عام باشندوں کی یہ تھی:

''جب آپ (قاری صاحب) بازار میں سے گزرتے، تو ہندو آپ کو جھک جھک کر سلام کیا کرتے تھے''۔

جس دن حضرت والا کا انتقال ہوا، تو لکھا ہے کہ:

''ہندوؤں نے اپنی دوکانیں اور کاروبار بند کردیئے اور بہت رنج وغم کا اظہار کیا''۔

صبح وشام دیکھنے والے جس پانی پت میں انہی جان افروز، روح پرور نظاروں کا تماشا کررہے تھے، اس وقت مسلمانوں کا پانی پت سے سیاسی اقتدار کا دباؤ اُٹھ چکا تھا، مسلمان اور ہندو دونوں تیسری بیرونی طاقت کے نیچے دبے ہوئے تھے، مگر اس وقت تک ''انسانیت'' کے احترام کا جو درس اسلام نے دیا تھا، ابھی یہ سبق ان کو یاد تھا، حافظہ سے اس قسم کی قرآنی آیتوں کا اثر مٹا نہیں تھا، مثلاً: ارشاد ہوا ہے:

﴿وَقُل لِّعِبَادِي يَقُولُوا الَّتِي هِيَ أَحْسَنُ إِنَّ الشَّيْطَانَ يَنزَغُ بَيْنَهُمْ﴾ (سورۂ بنی اسرائیل،۵۳)

''اور کہہ دو میرے بندوں سے بولا کریں ایسی باتیں جو اچھی ہوں، الشیطان چھیڑ خانی کرتا رہتا ہے، باہم ان میں''۔

جس کی تفسیر میں قاضی بیضاوی لکھتے ہیں:

''یقولوا التی ھی احسن الکلمۃ، التی ھی احسن ولا یخاشنوا المشرکین''۔

''بولا کریں ایسی باتیں جو اچھی ہوں'' اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایسی بات زبان سے نکالیں، جو اچھی ہو اور مشرکین کے ساتھ سخت کلامی سے کام نہ لیں''۔

مگر بجائے ''الانسان'' کے احترام کے یورپ سے قوم پرستی کی بلا نازل ہوئی، پھر وہی پانی پت تھا، اس کا وہی آسمان تھا اور اس کی وہی زمین تھی، دیکھنے والوں نے جو کچھ وہاں دیکھا تھا اور اس وقت تک دیکھ رہے ہیں، وہ بھی سب کے سامنے ہی ہے[1] اور ہندو تو خیر محکومیت میں مسلمانوں کے ہر وقت ساتھی تھے۔ آپ کو سن کر حیرت ہوگی کہ انگریز جو حکومت سے محروم کرکے مسلمانوں کے سینوں پر چڑھے ہوئے تھے، سروں سے وہ خونیں سیلاب بھی گزر چکا تھا، جس کا نام عہد شکن حکومت نے غدر رکھ چھوڑا تھا، جو آسمان پر تھے، وہ زمین پر ٹپکے جا رہے تھے۔ دِلّی میں بیٹھ کر جس وقت یہ الفاظ غالب کا قلم شاید خون کے حرفوں میں لکھ

---

[1]:...... تاہم اس گئے گزرے زمانہ میں بھی اللہ کا ایک بندہ اس وقت تک ایمان واستقامت کا عملی درس اسی پانی پت میں دے رہا ہو۔ یہ ہمارے کرم فرما مولانا لقاء اللہ صوفی ہیں۔

رہا تھا:

بسکہ فعال ما یرید ہے آج — ہر سخور انگلستاں کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے — زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے — گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہر دہلی کا ذرہ ذرہ خاک — تشنۂ خون ہے مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آسکے یاں تک — آدمی واں ہ جاسکے یاں کا
میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا — وہ ہی رونائن ودل و جاں کا
گاہ جل کر کیا کئے شکوائے — شوزش داغہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کئے باہم — ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا

خطوط میں ایک خط غالب ہی کا ہے، جس میں لکھا ہے:

''معزول بادشاہ کے ذکور، جو بقیہ السیف ہیں، وہ پانچ پانچ روپیہ مہینہ پاتے ہیں، اناث میں جو پیرزن ہیں، وہ کٹنیاں اور۔۔۔۔۔!

امرائے اسلام میں اموات گنوا!

پھر طویل فہرست ان کی درج کر کے آخر میں لکھا ہے:

''قصہ کوتاہ قلعہ اور جھجھر اور بہادر گڈھ، بلب گڈھ، اور فرخ نگر کم وبیش بیس لاکھ کی ریاستیں مٹ گئیں، شہر کی عمارتیں خاک میں مل گئیں، ہنر مند آدمی کیوں پایا جائے''۔ (اردوئے معلیٰ، ص:۳۲۲)

لیکن جن انگریزوں نے مسلمانوں کو پایہ تخت دلی سے نکالا تھا اور اس طریقہ سے نکالا تھا کہ بقول غالب:

''یہاں (دلّی میں) باہر سے اندر کوئی بغیر ٹکٹ کے آنے جانے نہیں پاتا''۔

اور آخر اس خطرہ پر تحریر ختم کی ہے کہ دِلّی میں ابھی دیکھنا چاہئے مسلمانوں کی آبادی کا حکم ہوتا ہے، یا نہیں''۔ (ص:٦٦)

اسی دلی سے کچھ فاصلہ پر ''باندا'' کی ریاست جہاں اس زمانہ میں؛ حضرت قاری صاحب مبرور کا ایک مدرسہ تھا، بیان کیا گیا ہے کہ:

''جب بغاوت زوروں پر تھی، تو پچھتّر انگریز مرد وزن تلاش امن میں حضرت (قاری صاحب) کے پاس آئے''۔

جس قوم کی حکومت نے مسلمانوں کو ان کے گھروں سے باہر نکالا تھا، اسی ظالم قوم کے افراد امن لینے کے لیے اسلامی اخلاق کے ایک قدیم نمونے کے سامنے آتے ہیں، مذہبی جنون (فنٹی ازم) کا بہتان مسلمانوں کے جن غریب ملاؤں کے سر تھوپا گیا ہے اور آج تک تھوپا جا رہا ہے، آنکھیں کھول کر دیکھئے، وہی ملا کھڑا ہوتا ہے، لکھا ہے:

''ان سب (انگریزوں کو) اپنا مدرسہ (قاری صاحب نے) دے دیا''۔

صرف یہی نہیں کیا، یہ انگریز مدرسہ میں اتارے جا رہے تھے اور طلبہ وعلماء جن کا مدرسہ سے تعلق تھا، ان کو خطاب کر کے قاری صاحب فرماتے جا رہے تھے:

''ان مظلوم اور بے کس انگریزوں کی مدد وحفاظت اور خاطر مدارات لوجہ اللہ بموجب حکم خدا ورسول کرو''۔

پناہ مانگنے والوں نے پناہ مانگی ہے، ان کو اپنی ذاتی رائے کی بنیاد پر نہیں، اللہ اور رسول علیہ السلام کے منشاء کے مطابق پناہ دی جاتی ہے۔ یہ اسلامی کردار تھا، جس کا نمونہ نازک ترین گھڑیوں میں اسلام اور اسلام کے ایک فینٹک ملا کی طرف سے پیش ہوا تھا اور اس کے مقابلہ میں ''سلف رسپکٹ'' یا خودداری پر فخر کرنے والے انگریزوں کو اسی مدرسہ میں دیکھا گیا تھا کہ:

''ڈنکن نامی ایک انگریز اپنی میم اور نا کتخدا لڑکی سمیت چھ ماہ مدرسہ میں پناہ گزین رہا وہ (یعنی: مسٹر ڈنکن) اور اس کی بیوی اور اسکی لڑکی، تینوں مسلمان ہو گئے تھے''۔

لیکن جب امن وامان قائم ہو گیا، تو بیان کیا گیا ہے کہ چھ مہینے تک مسلمان ہونے کا اعلان کرنے والا یہی انگریز دو تین سال بعد قاری صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، معلوم ہوا کہ اپنے آبائی دین کی طرف واپس ہو گیا۔ قاری صاحب نے دریافت فرمایا کہ:

''پھر اس وقت تم نے مسلمان ہونے کا اعلان کیوں کیا تھا؟''

جواب میں اسی خوددار انگریز نے اقرار کیا تھا کہ

''حضور! جان کا خوف تھا، اس لیے مسلمان ہو گیا تھا''۔

حالانکہ ڈنکن کے سوا آپ دیکھ چکے کہ انگریزوں کی کافی تعداد باوجود عیسائی رہنے کے قاری صاحب ہی کے مدرسے میں پناہ لئے ہوئے زندہ رہی، سب کو خورش وپوشش کا جہاں تک امکان میں تھا، نظم کیا گیا۔ سوانح نگار نے لکھا ہے اور صحیح لکھا ہے کہ:

''یہ اس کی (ڈنکن) کی غلطی تھی، مسلمان ہو جانے کے لیے حضرت نے کسی پر کوئی جبر نہیں کیا تھا اور نہ مسلمان ہو جانے والوں کے ساتھ بہ نسبت دوسرے انگریزوں کے کوئی خاص رعایت وسلوک آپ کرتے تھے''۔ (ص:۶۳)

یہ ڈنکن کی اخلاقی کمزوری تھی کہ بغیر ضرورت کے نفاق کے اس طریقہ کو اس نے اختیار کر لیا تھا، جو اسلامی نقطۂ نظر سے کفر سے بھی زیادہ بدتر ہے، بالجبر مسلمان بنانے کا الزام مسلمانوں پر لگانے والے یہ شاید بھول جاتے ہیں کہ جبراً اسلام قبول کرنے والا، یعنی: دل سے تو اسلام کا منکر ہو اور زبان سے اس کی صداقت کا اقرار کر لے، ایسا آدمی کافر ہی نہیں، منافق بن جاتا ہے، سمجھ میں نہیں آتا کہ بجائے کافر کے کسی کو منافق بنا لینا، یہ مسلمانوں کے نزدیک دین کا نیک کام کسی حیثیت سے بھی ہوسکتا ہے، لیکن ابلہ یہی کہتے چلے جاتے ہیں، اسی کو جو دیوانے ہیں، باور بھی کر لیتے ہیں۔

حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان انگریزوں کو اللہ اور اس کے رسول علیہ السلام کے منشاء کے مطابق اپنے مدرسہ میں پناہ دی تھی، یہ دعوی صرف زبان ہی سے نہیں کیا گیا تھا، بلکہ اس کے سوا اور کسی قسم کی پوشیدہ غرض اور مصلحت آپ کے سامنے نہ تھی، قدرت کی طرف سے اس کے امتحان کا بھی ایک دلچسپ نظم ہو گیا۔ اسی کتاب میں لکھا ہے کہ قیام امن کے بعد انگریزی حکومت تک جب خبر کسی طرح پہنچی کہ ''باندا'' میں انگریزوں کی کافی تعداد مسلمانوں کے ایک ملا کی بدولت قتل ہونے سے محفوظ ہوگئی، تو علاقہ کے کمشنر صاحب کے نام حکومت کا پروانہ پہنچا، جس کی نقل کمشنر نے حضرت قاری صاحب کی خدمت میں ''باندہ'' بھجوائی۔ اس میں کمشنر صاحب نے لکھا تھا:

''ایک لاکھ روپے سالانہ کی جائداد کے آپ مستحق سمجھے گئے ہیں''۔

حکم دیا گیا تھا کہ اس انعام کے حاصل کرنے کی درخواست دیجیے، مولانا حالی صاحبؒ نے چودھویں صدی اخبار (راولپنڈی) میں جو مضمون قاری صاحب کی وفات پر

لکھا تھا، اس میں اس انعام کا تذکرہ کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ:

''حضرت نے کمشنر کے پاس جانا، یا جائداد کا لینا دونوں باتیں نامنظور فرمادیں''۔

ایک انگریز جو پناہ گزینوں میں تھا اور اسی کی کوشش سے یہ صورت پیش آئی تھی، وہ خود حاضر ہوا، لیکن اس کے شدید اصرار پر بھی بس اسی قدر فرماتے ہوئے خاموش ہو گئے:

﴿لا نرید منکم جزاءً ولا شکوراً﴾

یعنی: ''نہ بدلہ ہی کے لیے میں نے یہ کیا تھا اور نہ اس کے لیے کہ تم اس کا گن گاؤ گے''۔

ہم نے تمہاری خدمت کسی دنیوی طمع اور لالچ سے نہیں کی تھی، بلکہ ہمارے نزدیک اس وقت تمہاری امداد اور اعانت مذہباً و اخلاقاً لازمی و ضروری تھی اور انسانی ہمدردی کا تقاضا تھا کہ مصیبت زدوں کو حتی الوسع ہم بچاتے، مجھے حکومت سے کسی صلہ کی ضرورت نہیں اور تمہاری ذاتِ خاص سے بھی کچھ نہیں چاہتا، مجھے معاف رکھو''۔

مولانا حالی مرحومؒ نے لکھا ہے کہ اس تقریر کو سن کر انگریز کے لیے کوئی چارۂ کار اس کے سوا نہ تھا کہ:

''نہایت ادب کے ساتھ سلام کر کے رخصت ہو گیا''۔

یہ یاد رکھنا چاہئے کہ یہ اس زمانہ کا قصہ ہے، جب مسلمانوں کی تمام تباہیوں میں سب سے زیادہ اہم معاشی تباہیوں کے قصے تھے اور یہ کہ ایک لاکھ جاگیر اس زمانہ کے کچھ ہی دن بعد دس پندرہ لاکھ کی آمدنی والی جائداد بن جاتی تھی، لیکن اللہ کے کچھ بندے اس زمانہ میں بھی تھے، جو یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ مسلمانوں پر معاش کے دروازے ایک ایک کر کے بند ہوتے چلے جاتے ہیں، مگر ان ہی حالات میں لاکھوں روپے کی جائداد کی بھی کوئی قدر و قیمت ان کی نظر میں نہ تھی، ان کی نگاہ صرف ''الرزاق ذو القوۃ المتین'' کے مواعید: ﴿نحن نرزقك والعاقبة للتقوى﴾ ''ہم تجھے روزی پہنچائیں گے اور آخری انجام تو بس تقویٰ ہی کا ہے'' پر تھی۔ غدر کے اس ہنگامہ کے بعد اسی دنیا میں حضرت قاری صاحب کو اپنی ناسوتی زندگی کم و بیش تقریباً چالیس سال گزارنے پڑے، یکے بعد دیگرے دو دو شادیاں آپ کی ہوئی، بکثرت بال بچے ہوئے، پانی پت کے خوشحال گھرانوں میں آپ کا

شمار ہوتا تھا، اچھا کھاتے، اچھا پیتے، اچھا پہنتے رہے اور خدا کا وعدہ "نحن نرزقك" پورا ہوتا رہتا تھا۔ یہی نہیں، بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ رزق میں اتنی کافی کشائش کی گئی تھی کہ دس پانچ کے سوا کبھی کبھی لوگوں کو لکھے پڑھے بغیر قاری صاحب نے ہزار ہزار روپے تک بطور قرض دیئے۔ لطافت اور نفاست پسندی آپ کے جبلی اقتضاؤں کے لازمی اجزا تھے۔ ٹیڑھی بچھی ہوئی چارپائی کو دیکھ نہیں سکتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ ذہنی نظام مختل ہو جاتا ہے، اگر کوئی چیز بے ترتیب نظر آتی ہے۔ ایک طرف طبعی لطافت پسندی کا حال یہ تھا کہ لوٹے کی ٹونٹی سے پانی پینے والوں کو آپ ٹوک دیا کرتے تھے، فرماتے کہ پیالہ میں پانی نکال کر پینا زیادہ مناسب اور بہتر ہے، لیکن ان ہی قاری صاحب کا قصہ بھی لوگ نقل کرتے ہیں ایک مسلمان بھنگی عبداللہ نامی پانی پت میں تھا، نماز کے لیے مسجد بھی آتا تھا، مسلمان اس کو روک تو نہیں سکتے تھے، لیکن مسجد کے لوٹوں کو چھپا دیا کرتے، تاکہ عبداللہ ان میں وضو نہ کرنے پائے، اس حال کا احساس قاری صاحب کو بھی ہوا، بیان کیا ہے کہ ایک دن مسجد میں جب لوگ بھرے ہوئے تھے، آپ نے آواز دی:

"میاں عبداللہ! کوئیں سے تازہ پانی کا ایک لوٹا بھر کر لاؤ"۔

عبداللہ نے حکم کی تعمیل کی، اسی کے لائے ہوئے پانی سے قاری صاحب نے وضو کیا، پھر ایک دن یہ کر کے بھی دکھایا کہ عبداللہ بھنگی کو پکار کر بلا رہے ہیں اور فرما رہے ہیں کہ بھئی! ذرا پانی تو پلاؤ۔ عبداللہ نے بھی غضب ہی کر دیا، انگلیاں ڈبوتا ہوا ایک پیالہ بھر لایا، قاری صاحب نے فرمایا کہ بھائی! یہ پانی تو زیادہ ہے، کچھ تم پہلے پی لو، چند گھونٹ جب عبداللہ پی چکا، تو اسی کے جھوٹے پانی کو جو پیالہ میں رہ گیا تھا، مسجد کے مسلمانوں کے سامنے قاری صاحب کو دیکھا گیا کہ بخندہ پیشانی نوش فرما رہے ہیں۔

آج چھوت چھات کے خلاف کوششوں کا ایک سلسلہ ہے، جو ملک کے طول و عرض میں جاری ہے، لیکن درد کی یہ داستان کسے سنائی جائے کہ بنی نوع انسانی کے آخری پیغمبر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وفادار غلام اسی ملک میں کیسے کیسے نمونے کر کر کے لوگوں کو دکھا رہے تھے، دھتکاری ہوئی انسانیت کو جو گلوں سے لگا رہے تھے، جو گرائے گئے تھے، ان ہی کو وہ اٹھا رہے تھے، اف ان ہی پر الزام لگایا جا رہا ہے کہ دوسروں کو اپنے نیچے دبائے ہوئے

تھے۔

الغرض ہندو مسلمان انگریز اونچوں نیچوں کے متعلق یہ اور اسی قسم کے مثالی نمونوں کا ایک دراز سلسلہ تھا، جسے تقریباً (۸۶) سال کی عمر تک حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ اسی ہندوستان میں پیش فرماتے رہے، مولانا حالی جوان کے خاص عقیدت مند تلامذہ میں ہیں، ارقام فرماتے ہیں کہ ہر جمعہ کو بڑوالی مسجد میں وعظ کہنے کا دستور تھا، قاعدہ تھا کہ وعظ کرتے ہوئے فرماتے:

"باقی انشاء اللہ آئندہ ہوگا"۔

لیکن آخری جمعہ جس کے بعد دنیا نے پھر آپ کا وعظ نہ سنا، ختم وعظ کے بعد خلاف دستور یہ فقرہ سنا گیا:

"باقی بشرطِ زندگی"۔

مسجد سے گھر آئے، پیچش کا دورہ پڑا، شہر میں ہنگامہ برپا ہوگیا، مقامی اطباء کے سوا دیکھا گیا کہ سرہانے پر حضرت والا کے مہاراجہ پٹیالہ کے معالج ڈاکٹر کریم اللہ بیٹھے ہوئے ہیں، آنکھیں قاری صاحب نے کھول دیں، ڈاکٹر صاحب کو دیکھ کر فرمانے لگے:

"کیوں نہ ہو، آخر محبت ہی تو ہے"

دِلّی سے بھی دوا آئی، یونانی اور ڈاکٹری مشورے کے تحت علاج میں زور جتنا ممکن تھا، لگایا گیا، دوشنبہ کا دن تھا، عصر سے کچھ پہلے پیر بقاء اللہ صاحب کا بیان ہے کہ مولانا حالی تو زار وقطار رو رہے تھے اور میں نے دیکھا کہ قاری صاحب کا رشتہ ناسوتی ہیکل سے ٹوٹ گیا۔

"میں نے فوراً حضرت کے دونوں قدم چوم لئے"۔ (ص:۲۹۱)

یوں اللہ کا یہ بندہ ۱۳ ستمبر ۱۸۹۶ء کو جہاں سے آیا تھا، چلا گیا۔ اب مسلمان ان ہی پرانے مدرسوں کے ان نمونوں کو ان لوگوں میں تلاش کر رہے ہیں، جن میں کہ بجائے انسانیت کے اپنی قوم، اپنے وطن، اپنی زبان، الغرض اپنی خودی کے عشق کی آگ بھڑکا دی گئی ہے۔ "کلچر" کے لفظ کا ایک خوش نما لفافہ ہر قوم کے ہاتھ میں تھما دیا گیا ہے، حق و ناحق، راستی و ناراستی، بھلائی اور برائی کے سارے معیار ختم کر دیئے گئے ہیں۔ "کلچر" کے اس لفافہ میں جو کچھ بند ہے، چونکہ ہمارا ہے، اسی لئے اس پر اصرار بھی ہمارا قدرتی حق

ہے۔آج افریقہ کے صحرائی مردم خور باشندے بھی ''کلچر'' کے اسی لفافے میں بند کر کے اپنے آباؤاجداد کی ساری ناکردنیوں کو کردنی قرار دینے پر اصرار کررہے ہیں۔ مسلمانوں میں بھی کلچری مسلمانوں کا ایک طبقہ پیدا ہوگیا ہے،خوش خیالوں کا ایک گروہ ان کو دیکھ دیکھ کر شاید وقتی خوش فہمیوں کا شکار ہورہا ہے،سمجھا جاتا ہے کہ ''اسلامیات'' یا ''مسلمیات'' پر خدا کا شکر ہے،اب ہمارے اندر بھی فخر کرنے والے پیدا ہوگئے ہیں،لیکن کلچریت کی وجہ سے اسلام کی صداقت پر اصرار سوچنا چاہئے واقعی اسلام کی صداقت پر اصرار ہے۔ **اللھم انی اعوذبك من الفتن ماظھر منھا وما بطن.**

(ماہنامہ الرشید، دیوبند)

فیصلۂ آسمانی

در باب

مسیح قادیانی

عین اسی شب میں جبکہ مسلمانوں کی قسمت کا آفتاب گہنا رہا تھا، یعنی: "بالمومنین رؤوف رحیم صلوات اللہ علیہ و سلامہ" پر مرض الموت کی تکلیف کی ابتدا ہو چکی ہے، تقریباً نصف رات گذرے آپ "ابومویہبہ" اپنے خاص غلام کو جگاتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اٹھو! قبرستان "بقیع غرقد" کی طرف چلیں کہ مجھے ان کے لیے استغفار کا حکم دیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ آپ مع ابومویہبہ اس سنسان بھیانک رات میں مقبرہ کے اندر داخل ہوئے اور قبروں کے قریب ہو کر ایک درناک لہجہ میں زمین کے نیچے سونے والوں کو ان لفظوں کے ساتھ مخاطب فرمایا:

"بہت مبارک تھے وہ دن جن میں تم نے زندگی گذاری، بخلاف ان دنوں کے جسمیں دنیا آج داخل ہوتی ہے، رات کی سیاہ تاریک ٹکڑوں کی طرح فتنے سامنے آرہے ہیں، ایک فتنہ دوسرے فتنہ کے پیچھے لگا ہوا ہے اور ہر پچھلا پہلے سے زیادہ ابتر ہے"۔

عزیز علیہ عنتم صلوات اللہ علیہ وسلامہ، تو آخر چند ہی دنوں کے بعد رفیق اعلیٰ سے جا ملے، پر وہ نکبت انگیز قرون ہماری قسمت میں تھے کہ فتنوں کا تار بندھا ہوا ہے، ایک نہ ختم ہونے والا تانتا ہے، جو کسی طرح نہیں ٹوٹتا اور ایک ہی باب نہیں، بلکہ شرارتوں کے سیکڑوں دروازے کھل پڑے ہیں، اسلامی معاملات کے ہر شعبہ، ہر سلسلہ میں مفاسد کے سمندر ہیں، جو اُمڈے چلے آتے ہیں اور بلاشبہ اہل بصیرۃ کے نزدیک اس سمندر کے ہر موج اخیر، اول سے زہرناک، خطر آفرین ہے۔

اوروں کو، رہنے دو، تم تھوڑی دیر کے لئے اس دجالی لائن پر ایک آدھ نظر ڈالو، جس پر

مسیلمہ سجاج اسود عنسی وغیرہ کے علاوہ تمہارے سامنے مصر کا مہدی، جونپور کا مہدی، اصفہان کا نبی اسحٰق، جوزستان کا مہدی (بانی فرقہ باطنہ، یا اقرامطہ) نیشاپور کا فرندین، فروزین، مدعی نبوت، جبل سوس کا مہدی، محمد بن تومرت، دولت عثمانیہ کا مشہور عیسی، جو دراصل یہودی تھا اور عیسی ہونے کا مدعی ہوا، اخیر میں خلیفۃ المسلمین سلطان محمد کی تہدید کے بعد تائب ہو کر مسلمان ہوا، اسی کے ساتھ ایک مسلمان نے مہدیت کا بھی دعوی کیا، مغیرہ بن سعید اسلام کا دوسرا عیسی، فارس بن یحیٰ مصری تیسرا عیسیٰ، نیا بن بن سمعان مدعی نبوت، ''مقنع'' مدعی الوہیت اور پھر آدمیت، عیسائیت، موسویت، ادریسیت، ابراہیمیت، محمدیت، تہدیت، مجددیت، محدثیت، امامیت وغیرہ دعادی کو ایک صندوق میں بند کر کے اپنے سر پر تن تنہا اُٹھنے والا، عربی اور فارسی کا مشہور انشاء پرداز احمد کیال، جو کہا کرتا تھا کہ ان تمام صفتوں کو خدا نے گھول کر ایک ہی گھونٹ میں سب ہمارے اندر پیوست کر دیا ہے۔ ایران کا بہاء اللہ نبوت کا مدعی وغیرہ ذلك من المهدئين، والمجانين، والمتنين، العيسائين کی ایک غول نظر آئے گی، جو یقیناً تاریک راتوں کے سیاہ ٹکڑوں سے کسی طرح کم نہیں۔

اسلام کی بہت کم صدیاں ایسی ہیں، جن میں اس قسم کی شرارتوں کا سیلاب اسلامیوں میں تہلکہ انگیز نہ ہوا، ہر قرن میں ان ابلیسی غیاہب وظلمات نے مسلمانوں کے دل و دماغ میں روحانی تاریکیاں پیدا کی ہیں، لیکن الحمد اللہ کہ جہاں ان صورتوں کے ساتھ شیطان اپنے سوار و پیادوں کے جلو میں ظاہر ہوتا رہا ہے، وہیں قہار قدوس کی جبروتی طاقتوں نے اسے روشن و تیز شعاعوں والے آفتاب بھی پیدا کئے، جن کی تاباں اور گرم گرم کرنوں نے ان ناپاک چشموں کو خشک کر دیا، جو اس قسم کے نجس دلوں سے پھوٹ پھوٹ کر روحانی آبادیوں میں اکھٹے ہوئے تھے، حتیٰ کہ تم دیکھتے ہو کہ آج نہ مہدیوں کا پتہ ہے، نہ ان جعلی عیسوں کو کائی ذکر، نہ ان متبعیوں کا کوئی نام لیوا، بلکہ نہ اس نبوت بوقلمونی کے مدعی احمد کیال کا، جو اپنے کو عیسیٰ بھی کہتا تھا اور موسیٰ بھی، مہدی بھی، محدث بھی، لیکن آج ان تمام دعووں سے کسی ایک کی بھنک نہیں سنی جاتی اور اگر کہیں ہیں بھی، تو اس کی وقعت کسی تاریک کوچہ کی ان پرنالوں سے زیادہ نہیں، جن پر آفتاب کی روشنی پہنچ سکتی، یا پہنچتی ہے، تو مٹی کی موٹی تہیں اس کی شعاعوں کو

وہاں تک نافذ ہونے نہیں دیتی اور ایسا ہونا ضروری ہے کہ وہ باطل تھا، جس کی قسمت میں زہوق، فرسودگی کے علاوہ اور کچھ نہیں اور یہ حق وصداقت تھا، جس کی پیشانیوں پر ہمیشہ بلندی کے تاروں کو چمکتا ہوا دیکھا گیا ہے اور جبکہ ایسا ہے، تو پھر تم قادیاں کے اس فتنہ مظلمہ سے کیوں خوف کرتے ہو، جو اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، اس زنجیر کی اور کڑیاں، جہاں ناپید ہوئیں، آخر کیا وجہ ہے کہ اس کا حشر بھی وہی نہ ہوگا۔ ولن تجد لسنة الله تبديلا

اور رب قدیر تو یہ کر بھی چکا، جس کی بعض وجوہات کا علم، لاہور و قادیان دونوں پر نظر ڈالنے کے بعد ہو سکتا ہے اور سب سے مستحکم، متین تدبیر الٰہی وہ ہے، جو مونگیر (صوبہ بہار) خانقاہ رحمانی کی مسلسل مجاہدات، ومتعدد رسائل منشورات کی صورت میں ظاہر ہوئی ہے۔

حضرت مولانا محمد علی صاحب قبلہ مدظلہ العالی کو خدا جزاء خیر دے کہ بلا خوف ''لومۃ لائم'' آپ ادھر متوجہ ہوئے اور چند ہی دنوں میں آپ کی مرکزی جماعت علمیہ نے اس فتنہ کے سد باب میں علی الخصوص صوبہ بہار میں نہایت شاندار کامیابی حاصل کی، حتیٰ کہ مقدمہ کی بھی نوبت آئی، مناظرے بھی ہوئے، لیکن جیسا کہ سنت اللہ جاری ہے کہ اس نے ہمیشہ جھوٹ کے سر کو سچائی کے چٹانوں سے کچل دیا ہے، ان موقعوں میں بھی یہی ہوا۔ والقصه بطولها۔

اس وقت ہمارے سامنے اسی مجاہدہ دینیہ، وسعی ملی کے شاداب نتائج کا ایک خوبصورت پھول ''فیصلۂ آسمانی'' کے نام سے مضمون ہو کر رکھا ہوا ہے۔

میں اس رسالہ کو دیکھ رہا تھا، جب کتاب ختم ہوئی، تو یکا یک میرے ذہن میں معلومات کا ایک سلسلہ مرتب ہو گیا، جو گویا رسالہ کا ایک عکس تھا، میں نے اسی وقت ارادہ کیا کہ اس سے قلم بند کرلوں، تاکہ ناظرین ''الرشید'' (جن میں اکثروں کو قادیانوں کے ساتھ معاملہ پڑتا ہوگا) بھی اس سے مستفید ہو سکیں، ذیل کے خیالات اسی آسمانی فیصلہ سے ماخوذ ہیں۔ گرچہ مولانائے ممدوح نے اس سے بہت زیادہ ارقام فرمایا ہے، وہیں بطور تقریظ کے اس کے جستہ جستہ مضامین کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ درج کروں گا۔

''اس رسالہ میں نہایت شدومد سے ثابت کیا گیا ہے کہ مرزا غلام احمد، سکنہ قادیان، علاقہ پنجاب میں ہرگز اس کی صلاحیت نہ تھی کہ کوئی مسلمان اس کی اتباع کرے اور نہ صرف یہ، بلکہ اس کی پیروی براہ راست انسان کو گرم مقام تک پہنچا دیتی ہے''۔

اس دعوے کو جس خوبی سے مدلل کیا گیا ہے، درحقیقت اتنی ملامت پسندی، اور متانت کی نظیر تردیداتِ قادیانی کی کسی اور کتاب میں مل نہیں سکتی۔ فرماتے ہیں، جس کا ماحصل یہ ہے کہ امت اسلامیہ اس وقت تین طائفوں میں منقسم ہے:

ا۔ صوفیاءِ کرام جنہیں خداوند عزیز نے نور باطن، صفاء قلب، روشنی، بصیرت، فراستِ ایمانیہ سے نوازا ہے، جس کے ذریعہ سے وہ حق وباطل کو الگ الگ کر کے دیکھ لیتے ہیں۔

۲۔ علماءِ عظام جن کے ہاتھ میں قرآن وحدیث، آثار وسنن موجود ہیں، جس میں مہدی، عیسی علیہما السلام کی علامات واضح طور پر بیان کی گئیں ہیں۔

۳۔ مسلمانوں کا وہ طائفہ جو نہ نورِ باطن رکھتا ہے اور نہ علمِ ظاہر سے کوئی بہرہ۔

اب ظاہر ہے کہ اربابِ باطن میں سے کسی نے مرزا کی تصدیق نہ کی، حالانکہ اگر وہ واقع مہدی ہوتا، تو سب سے پہلے اس کے قدموں میں سر ڈالنے والا گروہ ہوتا۔ اسی طرح علماء میں بجز چند عبد الدراہم والطاغوت کے اور سبھوں نے انکار کیا کہ مہدی، یا مسیح کی کوئی علامت اس میں نہیں، ہم اسے مکرر کرتے، لیکن چونکہ وہ طریقہ علماء کے دریافت کرنے کا ہے اور وہ اسے جانتے ہیں، اس لیے ضرورت نہیں۔

البتہ عوام بیچاروں کے ہاتھ میں کچھ نہیں ہے، وہ دل کی بینائی سے محروم ہیں اور ان کے ہاتھ میں حدیث وآثار کی شمع بھی نہیں، بیشک ان کے لیے سخت وقت ہے۔ خصوصاً اس وقت جبکہ آزادی کا زمانہ ہے، مشکلات اور بھی پیچیدہ ہوگئے، کیونکہ آسان طریقہ تو ان کے لیے یہی تھا کہ صوفیہ وعلماء کی تقلید کرتے، مگر کچھ علماءِ شرار وصوفیاء بداطوار اور کچھ اثر زمانہ نے ان کی تقلید کے بازار کو سرد کر دیا ہے، اس لیے میں نے ان لوگوں کے لیے کسی عالم کا نہیں، کسی صوفی کا نہیں، کسی مناظر کا نہیں، کسی فقیہ کا نہیں، حتی کہ کسی نبی کا بھی نہیں، بلکہ حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ کا ایک آسمانی فیصلہ جو آسان بھی ہے اور مختصر بھی ہے، مسلمانوں کے ہاتھ میں دیتا ہوں، انشاء اللہ ان پر خود حق واضح ہو جائے گا اور معلوم ہوگا۔ زمین پر تو خیر، آسمانوں پر مرزا کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہوگا، اور خدائے برتر کی نگاہوں میں اس کی سیاہ حقیقت کیا رتبہ رکھتی تھی، اس کے بعد تیرہ بختی ہے کہ انسان اپنے مالک یگانہ کے فیصلہ سے بھی منہ موڑے، اگر انسانوں کی آراء قابل سماعت نہیں، تو نہ ہو، لیکن کیا خدا بھی اس قابل نہیں کہ

اس کی آواز نہ سنی جائے اوراس کے فیصلہ کے آگے گردن نہ ڈالدی جائے ،یقیناً اتباع ہوئی ہے،اگران کے بعدلوگ خدا کی طرف خلوص دل کے ساتھ نہ بھاگے اور مرزا کی اتباع میں جو کچھ ناسزاباتیں ان سے سرزد ہوئیں ،اس سے تائب نہ ہوئے۔

﴿ففروا الی اللہ انی لکم منہ نذیر﴾

''پس بھاگوطرف خدا کی ،میں اس سے کھلا ڈرانے والا ہوں''۔

پوری تفصیل کاعلم بغیر رسالہ کے دیکھنے کے ممکن نہیں ،لیکن اختصار جوممکن ہے مطلب کے ادا کرنے میں شاید کافی ہو،یہ ہے:

وہ آسمانی فیصلہ ہم تک بذریعہ خاتم النبیین ،السید العربی الامی صلی اللہ علیہ وسلم نسلاً بعد نسل تواتر کے ساتھ منتقل ہوتا رہا ہے،یہ ہے:

۱. ﴿فلا تحسبن اللہ مخلف وعدہ﴾

''ہرگز ہرگز خدا کو گمان نہ کرو کہ وہ اپنے رسولوں سے وعدہ خلافی کرے گا''۔ (سورۂ ابراہیم ،رکوع نمبر:۷)

یہ ایک صریح وناطق فیصلہ ہے،اس میں بتایا گیا ہے کہ رسولوں کی علامت یہ ہے کہ خدا ان سے وعدہ خلافی نہیں کرتا۔

۲. ﴿لن یخلف اللہ وعدہ﴾

''ہرگز نہیں خداوعدہ کا خلاف کرتا ہے''۔

۳. ﴿ ان اللہ لا یخلف المیعاد﴾

''یقیناً خدااپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرتا''۔

٤. ﴿ لا یخلف اللہ وعدہ ولکن اکثرالناس لا یعلمون﴾

''نہیں خلاف کرتا ہے خداا۔پنے وعدوں کا،لیکن آدمی نہیں جانتے''۔

۵. ﴿مایبدل القول لدی﴾

''ہمارے نزدیک (ہمارے اقوال میں)تغیر نہیں''

٦. ﴿لا تبدیل لکلمات اللہ﴾

''اللہ کی باتوں میں تبدیل وتغیر نہیں''۔

ان سب کا حاصل یہ ہے کہ خدا عموماً کسی سے وعدہ خلافی نہیں کراتا اور خصوصاً رسولوں

سے، جیسا کہ ہر ایک شخص ان فیصلوں کے بعد سمجھ سکتا ہے، بس اب تمام دنیا کے علما اور صوفیہ سے قطع نظر کر کے محض ان فیصلوں کو ہاتھ میں لو اور مرزا غلام احمد ولد مرزا غلام مرتضٰی، پسر مرزا عطا محمد، سکنہ قصبہ قادیان (احاطہ پنجاب) پر اسے جاری کر کے دیکھو کہ وہ نبی ہے، یا نہیں، اگر نہیں ہے، تو پھر بیچارہ مسلمان بھی تھا، یا نہیں، اگر مسلمان نہیں ہے، تو صرف گمراہ ہے، یا گمراہ ہونے کے ساتھ مغضوب اور دوسروں کو گمراہ کرنے والا تھا۔ انشاء اللہ اسی کے ذریعہ سے تمام سوالوں کا جواب مل سکتا ہے۔

چاہیے کہ تمہارا دماغ اس وقت جبکہ تم انصاف، وعدالت کی کرسی پر بیٹھ کر آسمانی فیصلہ کے ماتحت ہو کر رائے قائم کرنے والے ہو، کسی مولوی، یا ملا، یا صوفی کے خیالات سے متاثر نہ ہو، محض آزاد و مخلّی بالطبع ہو کر سوچو، پس سنو:

اگر مرزا نبی ہوتا، تو آسمانی فیصلہ کے اعتبار سے ضرور تھا کہ خدا اس سے خلافِ وعدگی نہ کرتا، لیکن معمولی معمولی پیشگوئیاں تو خیر سب سے عظیم الشان، منیع القدر پیشگوئی (یعنی: دختر احمد بیگ سے نکاح کی پیشگوئی) جس کے متعلق مرزا صاحب کو ہر ایک قسم کا بھروسہ تھا اور جس کی صداقت پر اعتماد کر کے آپ کی پنجابی اردو نما الاپ یہ تھی: ؎

پیشگوئی کا جب انجام ہویدا ہوگا	قدرتِ حق کا عجب ایک تماشا ہوگا
جھوٹ اور حق میں جو ہے فرق وہ پیدا ہوگا	کوئی[1] پائے گا عزت کوئی رسوا ہوگا

اور جس کے متعلق مرزا سترہ برس انتظار کرتا رہا، دھوم مچائی شور کیا، لیکن تمام عالم کو معلوم ہے اور اس وقت کم از کم ہزاروں، بلکہ لاکھوں آدمی گواہ ہیں کہ اس پیشگوئی کے متعلق مرزا صاحب کا لفظ، لفظ، حرف حرف غلط ہوا۔ بتاؤ کہ آسمانی فیصلہ:

﴿فلا تحسبن الله مخلف وعده رسله﴾

''ہرگز ہرگز خدا کو گمان نہ کرو کہ وہ اپنے رسولوں سے وعدہ خلافی کریگا''۔

---

[1]...... اس فصاحت وبلاغت کی بھی کوئی انتہا ہے ''پاجائے گا'' میں ''جائے گا'' کی ترکیب کتنی صحیح ترکیب ہے۔ سجاح کو مخاطب کرتے ہوئے مسیلمہ نے جو کچھ کہا تھا، اس سے مرزا نے باوجود مقصد مشترک ہونے کے، یعنی: دونوں نکاح وہمبستری کی خوشخبری دے رہے ہیں، مرزا صاحب کا بیان ذرا مہذب ہے، مسیلمہ نے بھی جب سجاح (ایک عورت تھی) پہلے ایک وحی پڑھی، جواز حد فحش ہے، لیکن اس کے بعد کچھ اشعار پڑھے:

کا کیا اقتضاء یہ نہیں کہ مرزا نبی نہ تھا؟ بلاشبہ ایسا ہی ہے، ورنہ لازم آتا ہے کہ خداوند تعالیٰ کا قول غلط ہو اور جبکہ نبی نہ تھا، تو کیا مسلمان تھا، اس کے لیے بھی تمہارے سامنے ایک آسمانی فیصلہ پیش کرتا ہوں:

﴿ومن اظلم ممن افتری علی الله کذبا﴾

''اس سے بڑھ کر کون ظالم ہے، جس نے خدا پر جھوٹ باندھا''۔

اس فیصلہ کا حاصل یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ پر جھوٹ باندھنے والے سے زیادہ ظالم نہ کافر ہے، نہ مشرک ہے، نہ بدعتی، نہ فاسق، خدا پر جھوٹ باندھنا سب سے بدترین کفر ہے، جیسا کہ اسی فیصلہ کی شرح میں دوسرے مقام میں وارد ہے:

﴿قل ان الذین یفترون علی الله الکذب لایفلحون متاع فی الدنیا ثم الینا مرجعهم ثم نذیقهم العذاب الشدید بما کانو ایکفرون﴾

الا قومی الی النیك فقد هئی لك المضجع
فان شئت ففی البیت وان شئت ففی المخدع
وان شئت سنلقاك وان شئت علی اربع
وان شئت بثلثیه وان شئت به اجمع

سجاح پہلی صورت سے راضی ہوگئی، چونکہ اشعار فحش ہیں، اس لیے ترجمہ سے معذور سمجھا جائے۔

''سو کہو (اے محمد) جو لوگ خدا پر جھوٹ باندھتے ہیں، کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے، دنیا کی ایک ذلیل پونجی (کے علاوہ اور ان کے افتراء سے کوئی فائدہ نہیں) پھر ہماری طرف ان کی بازگشت ہے، ہم پھر انہیں دکھہ چکھائیں گے انکے کفر کی وجہ سے''۔

اس سے صاف معلوم ہوا کہ ''افتراء علی اللہ'' کفر ہے، اب ظاہر ہے کہ جب آسمانی فیصلہ آسمانی کے حکم سے مرزا صاحب کی نبوت باطل ہوگئی اور ثابت ہوا کہ وہ نبی نہ تھے، تو پھر اب مرزا صاحب کا یہ دعویٰ کرنا:

''میں نبی ہوں، میرا انکار مستوجب سزا ہے''۔ (توضیح مرام:11)

یا کہنا:

''سچا خدا وہی ہے، جس نے قادیان میں اپنا رسول بھیجا''۔

''خداوند تعالیٰ نے اس امت میں سے مسیح موعود بھیجا، جو اس پہلے مسیح سے اپنی تمام شان میں بڑھ کر ہے اور اس نے اس دوسرے مسیح کا نام غلام احمد رکھا'' یہ سب خدا پر افتراء نہیں تو اور کیا ہے اور جو شخص خدا پر جھوٹ باندھا کرتا تھا، کیا اب وہ

﴿ثم نذیقهم العذاب الشدید بما کانو یکفرون﴾

''ہم پھر انہیں دکھہ چکھائیں گے ان کے کفر کی وجہ سے''

کے عواقب میں مبتلا نہ ہوگا اور کیا اس کے پیروکاروں کو بھی اس آسمانی تخویف سے کانپنا نہیں چاہئے..........؟

مندرجہ بالا بحثوں سے بخوبی ثابت ہو گیا کہ مرزا غلام احمد پسر غلام مرتضیٰ، سکنہ قادیان نہ نبی تھا اور نہ ولی، اور نہ مسلمان، بلکہ ایک مفتری، اظلم، کاذب، کافر شخص تھا اور جو ایسا ہو، اس کی پیروی کرنے والا اپنا ٹھکانہ اگر ہاویہ کی خندقوں میں نہیں بنا رہے ہیں، تو کہاں بنا رہے ہیں؟ خدا ان کو اپنے غضب سے بچائے کہ شیطان نے اپنی کامیابیوں کا انہیں اچھا آلہ بنا رکھا ہے اور اپنی پرانی تمنا:

﴿لا قعدن لهم صراطك المستقيم ثم لاتينهم من بين ايديهم ومن خلفهم وعن ايمانهم وعن شمائلهم ولاتجد اكثرهم شاكرين﴾

''یقیناً ضرور بیٹھوں گا تیرے سیدھے راستہ پر ان کے لیے، پھر ان کے سامنے سے بائیں دائیں جانب سے آؤں گا، تو (اے خدا) ان میں اکثروں کو شکر کرنے والا نہیں پائے گا''۔

اس زمانہ میں ان سوختہ عقلوں کے ذریعہ سے نکال رہا ہے، کتنے ہیں جن کے دلوں پر مہر اور آنکھوں پر پردے اور کانوں میں ڈاٹ ڈال دیئے گئے، جو اب سیدھا راستہ نہیں پا سکتے۔

فقیر سید مناظر احسن عفی عنہ (گیلانی)

مسئلہ جذب وکشش
پر
ایک تنقیدی نظر

حدیث ازمطرب ومیگودراز دہر کمتر جو — کہ کس نکشود نکشاید بحکمت ایں معمارا

کہا جاتا ہے کہ عقل فطرۃً آزاد ہے، لیکن جب پوچھا جاتا ہے کہ کن چیزوں کے لیے؟ تو قولاً نہ سہی، تاہم عملاً ہمیشہ حاملان لواءِ حریت وآزادی سے ہمیں یہی جواب ملتا ہے کہ مذہبی دائروں کے لیے، الٰہی احکام وحدود کے لیے، مسائل نبوات وتعلیمات سماوی کے لیے اور بس۔

ورنہ آخر پھر یہ کیا ہے کہ تعلیم وتمدن، تہذیب ومعاشرت، خیالات وعقائد کے سوا آج جتنے ابواب ہیں، سب میں مشرقی عقلیں، بصد نیاز واضطرار، محراب مغرب کے آگے سربسجود ہیں اور یہی نہیں آزادی کا میدان جس قدر فلسفہ میں وسیع ہے، شاید دنیا میں اتنی فراخی کسی کو نصیب نہیں۔ فلسفی دعویٰ کرتا ہے کہ میں جو کچھ کہتا ہوں، ان ہی قوتوں کے ذریعہ سے کہتا ہوں جس میں ہر ایک انسان شریک ہے، وہ خود تقلید اشخاص پروری کا دشمن ہوتا ہے اور دوسروں کو بھی اس کی تعلیم دیتا ہے، وہ چیلنج دیتا ہے کہ ہمارے دلائل وقیاسات پر جس کو شبہ کرنا ہو، کرے۔

لیکن اس تیرہ بختی کا اندازہ کرو کہ ہم اس میں بھی یورپ کی کورانہ تقلید کرنے سے باز نہیں آتے، اس کی متکبرانہ تحدّیوں کو سنتے ہیں اور دم بخود ہو کر چپ چاپ بیٹھ جاتے ہیں۔ ایشیائی عقلوں کی یورپ تضحیک وتوہین کرتا ہوا اپنے دعاوی کو تحقیقات کی صورت میں ہمارے سامنے پیش کرتا ہے، لیکن وائے برجمود ما! کبھی اس کا احساس تک نہیں ہوتا کہ آخر ہم بھی آدمی ہیں، ہمارے پاس بھی ادراک وعلم کے وہ آلات موجود ہیں، جس سے یورپ کام لیتا ہے، پھر یہ مرعوبیت کیوں؟ تذلیل ونیاز کی وجہ؟ آخر عقل اگر آزاد ہے، تو اس کی آزادی

اتنے تنگ دائرہ تک کیوں محدود ہو (العیاذ باللہ) جب وہ خدا اور اس کے انبیاء ورسل علیہم الصلوٰۃ والتسلیم کی پابندیوں سے بیزار ہے، تو پھر نیوٹن اور ہملٹن کومسٹ ڈیکارٹ کی زنجیروں کو کیوں نہیں توڑ سکتی؟

بلاشبہ علمی میدانوں میں عصبیت ووطنیت کو گذر نہیں، لیکن آزادی کا تقاضا یہی نہیں کہ یورپ جو کچھ کہتا ہے، کبھی کبھی اسے ہم بھی معیار صحیح پر جانچیں، دیکھیں تو سہی کہ ان بڑھے چڑھے دعووں میں سچائی کا کتنا حصہ ہے؟ حرّیت کی تلوار اگر یورپ نے ہمارے ہاتھوں دی ہے، تو کیا اس کی مشق کے لیے سب سے پہلے یورپ کی تقلید سزاوار نہیں؟ تمہارے نزدیک نہ ہو، لیکن ہم تو یہی سمجھتے ہیں اور آج اس کے لیے ''جذب وکشش'' کے مسئلہ کو منتخب کیا جاتا ہے کہ فلسفہ جدیدہ کے اکثر اصول کا مرجع بحث اخیر میں یہی مسئلہ ٹھہرتا ہے۔ موجودہ ''نظام شمسی'' کا دلفریب تخیل اس کے ثمرات ونتائج میں سے ہے، پھر ساتھ ہی اس کے اہل وطن کے نزدیک اس کا مفہوم اجنبی بھی نہیں رہا ہے۔

لیکن تقریر ونقد سے پہلے مجھے جتا دینا چاہئے کہ آئندہ میں جو کچھ بھی لکھوں گا، وہ گویا بمنزلہ شہادت وشکوک کے ہوں گے، جدل وطعن خواہ مخواہ مجھے منظور نہیں، بلکہ سمجھنا چاہتا ہوں، پھر اگر کوئی صاحب میری تسلی کر سکتے ہیں، تو میں اس کو نہایت سکوت وخاموشی اور انصاف سے سنوں گا، اگر تشفی ہوگئی، تو اپنے شکوک کو واپس لینے کے لیے بھی تیار ہوں۔

تقریر مسئلہ جذب وکشش

یورپ[1] کے سامنے جس شخص نے سب سے پہلے اس مسئلہ کو ایک علمی صورت میں پیش کیا، وہ سر اسحاق نیوٹن تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک زمانے سے وہ اس پر غور کر رہا تھا کہ درختوں کے پھل، ٹہنیوں سے خود بخود کس طرح ٹپک پڑتے ہیں؟ آخر تحقیق وتلاش کے بعد وہ اس

---

[1]...... میں نے یورپ کی تخصیص اس لئے کی کہ مشرق میں اس کی آواز آج سے صدیوں پہلے اٹھائی جا چکی ہے۔ ثابت بن قرہ نے اسکی تقریر واثبات میں بہت زیادہ زور لگایا ہے اس کا خیال تھا کہ اگر زمین کے کرہ کو اس مقام سے جہاں اس وقت ہے اٹھا کر آفتاب کے قریب ڈال دیا جائے گا تو جو ڈھیلا یہاں سے پھنکا جائے گا وہ کھینچ کر اپنی کرہ سے مل جائے گا۔ تفصیل کے لئے دیکھو مباحث مشرقیہ امام رازی ونیز تفسیر کبیر، بلکہ فارسی کا مشہور کرہ مرارۃ الخیال بھی اس کی تصریح کرتا ہے۔ شعرا کی کتابوں میں اسکے متعلق بہت زیادہ معلومات ملتی ہیں۔ ۱۲

نتیجہ تک پہنچا کہ زمین میں ایک خاص قسم کی قوتِ جذّابہ موجود ہے، جو پھلوں کو ٹہنیوں سے اور ڈھیلوں کو (جسے کسی نے پھینکا ہو) ہوا سے بندوق کھا کر مرجانے والے شکاروں کو درختوں سے نیچے کھینچ لیتی ہے۔

اس کی مثال بجنسہ ایسی ہے کہ تم زمین پر مقناطیس کی تہ جمادو اور درختوں میں مصنوعی پھل لوہے کے لگادو، وہ درخت سے ٹوٹ ٹوٹ کر اس مقناطیسی سطح پر گر جائیں گے۔ ابتداء ابتداء میں یہ مسئلہ صرف چند چیزوں تک محدود رہا، لیکن رفتہ رفتہ نیوٹن کی نازک خیالیوں نے اس کے دامن کو پھیلانا شروع کیا، حتی کہ دنیا کے سامنے وہ دن بھی آ گیا کہ نیوٹن اس قوت کو تمام اجسام میں خواہ سفلی ہوں، یا علوی ثابت کرنے لگا، اس نے دعویٰ کیا کہ آفتاب زمین کو کھنچتا ہے، زمین آفتاب کو اپنی طرف جذب کرتی ہے، حتی کہ تمام اجرام سماویہ، سیارات ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ غرض کہ چند ہی دنوں میں آسمان وزمین کے قلابے ان غیر محسوس زنجیروں کے ذریعے سے آپس میں ملا دیئے گئے، جو اسحٰق کو شاہ بلوط کے نیچے نظر آئی تھی۔

حتی کہ اخیر میں غلو واغراق اس درجہ تک ترقی کر گیا کہ اس سے متاثر ہو کر ایک جدید مصنف لکھتا ہے:

”قوت کشش کے ذریعہ سے صرف زمین ہی اور اشیاء کو اپنی طرف نہیں کھینچتی، بلکہ یہ قوت کل اجسام میں ہے، عام اس سے ذی روح ہوں، یا غیر ذی روح، اگر دنیا میں ہمارے اور آپ کے سوا کوئی ہستی نہ ہوتی، تو ہم اور آپ چپک جاتے، کیونکہ ہماری قوت کشش آپ کو ہماری طرف کھینچتی اور آپ کی قوتِ جاذبہ ہم کو آپ کی طرف، پس دونوں مل جاتے“۔

ایک اعتراض اور اُس کا جواب

نیوٹن نے جب اپنے اس نظریہ کو اس قدر عام کیا، تو اعتراض کیا گیا کہ زمین جب آفتاب سے دس لاکھ حصہ چھوٹی ہے اور آفتاب کے جذبات کا اثر اربوں میل دور رہنے والے سیاروں پر پڑتا ہے، تو زمین پر بدرجہ اولیٰ زیادتی کے ساتھ پڑنا چاہیے، علی الخصوص جب زمین بھی آفتاب کو کھینچتی ہے، تو چاہیے کہ دونوں آپس میں ٹکرا جائیں۔

اس عقدہ کی گرہ کھولنے کے لیے اس نے ایک مثال سے کام لیا، یعنی: فلاخن (جس میں بچے ڈھیلے کھکر گھمایا کرتے ہیں) لے کر اس نے کہا کہ اسے خوب زور سے گھماؤ، جب وہ اپنی پوری تیزی پر آ جائے، تو اندازہ کرو کہ ڈھیلے کی طبیعت کیا چاہتی ہے، تم دیکھو گے کہ جو دائرہ اس کی گردش سے پیدا ہو گیا ہے، اس سے نکل بھاگنے کی کوشش کرے گا، حتی کہ کبھی غایت زور میں آ کر نکل بھی جاتا ہے۔

الغرض اسی کے ساتھ مخصوص نہیں، جو چیز اسطرح چرخ کھاتی ہے، اس میں قطعی طور پر یہ قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس قوت کا نام "قوت المرکز" ہے، یعنی: مرکز سے جسم کو الگ کرنے کے درپے ہوتی ہے، پس اسی طرح یہاں بھی سمجھو کہ زمین آفتاب کے اردگرد چرخ کھا رہی ہے اور یہ گردش اس قدر تیز اور شدید ہے کہ گھنٹہ میں اڑسٹھ ہزار دوسوستر میل مسافت زمین طے کر لیتی ہے۔ ایسی حالت میں اسمیں قوت تارک المرکز کا پیدا ہونا ضرور تھا، جس کا تقاضا ہے کہ زمین اپنے مدار سے نکل کر اس کے مرکز (آفتاب سے) بہت دور جا پڑے اور مدار کے وسط میں اس کا مرکز چونکہ آفتاب ہے، وہ اپنی پوری قوت سے اسے کھینچ رہا ہے اور زمین بھی اسے کھینچ رہی ہے، جسے ہم "قوت طالب المرکز" سے تعبیر کرتے ہیں، پس قوت تارک المرکز اور قوت طالب المرکز کی باہمی تزاحم ومقابلہ کا یہ نتیجہ ہے کہ زمین اپنے مدار پر گھوم رہی ہے، ورنہ ان قوتوں میں سے اگر ایک بھی ندارد ہو جائے، تو اس وقت زمین یا تو آفتاب سے ٹکرا جائے گی (یہ اس صورت میں کہ قوت تاریک المرکز معدوم ہو جائے) یا آفتاب سے اس قدر دور ہو جائے کہ وہاں تک نہ آفتاب کی پوری حرارت پہنچ سکتی ہے اور نہ روشنی، جیسا کہ بعض تاریک سیاروں کا حال ہے (یہ اس صورت میں کہ قوت طالب المرکز باطل ہو جائے) اس طویل کلام کی تحلیل کرنے لینے کے بعد جو صورت رہ جاتی ہے، وہ اس قدر ہے:

۱۔ پھل چونکہ درخت سے ٹپکتے ہیں اور اُن کے لیے کوئی دوسرا سبب نہیں، اس لیے معلوم ہوا کہ زمین اپنی طبعی کشش سے ان کو کھینچ لیتی ہے۔

۲۔ اسی پر ہم آفتاب، زمین اور تمام سیارات کو قیاس کر لیں۔

۳۔ زمین آفتاب سے اس لیے نہیں ملتی کہ اس میں ایک قوت تارک المرکز بوجہ دوری

حرکت کے پیدا ہوگئی ہے، جیسا کہ فلاخن کے ڈھیلوں میں پیدا ہو جاتی ہے۔

ہم ان تمام مقدمات پر بالتفصیل گفتگو کرتے ہیں۔

اولاً یہ غلط ہے کہ پھلوں کے ٹپکنے کی علت علاوہ جذب وکشش کے اور کوئی نہیں نکلتی، حالانکہ کہا جا سکتا ہے کہ جب تک پھل چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں، اس وقت ان کا وزن کم رہتا ہے اور جس ٹہنی میں وہ لگے ہوتے ہیں، ان کا اتصال بھی درخت سے قوی رہتا ہے، پھر بوجہ حرارت وغیرہ ان کے اندر کچھ ڈھیلا پن اور تفرق پیدا ہوتا ہے، ادھر پھلوں کا وزن بھی زیادہ ہو جاتا ہے، اس لیے شاخیں ان کی متحمل نہیں ہو سکتیں، بالآخر اس کے چھوڑ دینے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔

کہہ سکتے ہو کہ اس کا مدار وزن کے ثبوت پر ہے اور نیوٹن وزن اور ثقل کا منکر ہے، لیکن چونکہ وزن کا انکار جذب وکشش کے ماننے کے بعد ثابت کیا جاتا ہے اور ابھی تک وہ ثابت نہیں ہوا، اس لیے یہ انکار نا قابل سماعت ہے، پھر تم یہ بھی پوچھ سکتے ہو کہ جب تک آم کی کیریاں چھوٹی ہوتی ہیں، زمین انہیں کیوں نہیں کھینچتی، حالانکہ اس وقت طاقت کم صرف ہوگی کہ ان کا مادہ بہت تھوڑا ہوتا ہے، کشش کا اثر بہ نسبت آئندہ زمانے کے اس وقت زیادہ پڑنا چاہیے۔

اور اس کو بھی جانے دو، ہم اسی پھل کو جو درخت سے ٹپک گیا ہے، پھر دھاگے سے باندھ کر درخت میں باندھ دیتے ہیں، بتاؤ کہ زمین اسے کیوں نہیں کھینچتی اور اب وہ کیوں نہیں گرتا؟ اور اگر ہم فرض کرلیں کہ پھلوں کے ٹپکنے کی علت کشش زمین ہے، تو یہ کیسے معلوم ہوا کہ یہی نسبت آفتاب وزمین میں بھی ہے...؟ آخر اگر مقناطیس لوہے کو کھینچتا ہے، تو یہ کس طرح ثابت ہو جائے گا کہ سنگ مرمر بھی لوہے کو اپنی طرف کھینچ لے گا؟

ہم یورپ کے عام سطحیوں کو مثالوں اور نظیروں کے ذریعہ سے استدلال کرتے ہوئے دیکھ کر اکثر معذور سمجھتے تھے، لیکن حیرت ہوتی ہے کہ نیوٹن جیسا فاضل حکیم بھی ایسا دعویٰ بلند آہنگی سے کرتا ہے، لیکن دلیل میں بجز چند مثالوں کے اس کے پاس اور کچھ نہیں دیکھا جاتا، پھلوں کو جذب وکشش کا ماتحت دیکھ کر قاعدہ کلیہ بنالیتا ہے کہ تمام دنیا اور اس کے تمام اجزاء میں یہی قانون جاری ہے، نیوٹن میں اور اس حکیم میں کیا فرق ہے، جس نے ایک پتھر کو اپنے

سامنے گرتا ہوا دیکھ کر رائے قائم کی تھی کہ آسمان بھی پتھر سے بنا ہے...؟

اور ہم ان سب چیزوں سے اگر قطع نظر بھی کر لیں، تو عقل ومشاہدہ کی شہادتیں صاف طور پر اسکی تکذیب کرتی ہیں۔

۱):......فرض کرو کہ ہم تمہارے ہاتھ کو کسی (جذّابہ، مثلاً: سنگھی) وغیرہ سے کھینچتے ہیں، تو تمہیں محسوس ہوگا کہ کوئی چیز ہم کو کھینچ رہی ہے، پس اگر آفتاب زمین اور اس کے رہنے والوں پر اپنی کشش کا اثر ڈالتا، تو چاہئے تھا کہ ہمیں وہ محسوس ہوتا، حالانکہ نہیں ہوتا ہے۔

۲):......زمین اگر پھلوں کو کھینچتی ہے، تو پھر اس پر چلنے والے حیوانوں کو بھی بدرجہ اولیٰ جذب کرتی ہوگی اور جب کہ اس کا اثر آفتاب جیسے جرم عظیم تک پہنچتا ہے، تو مکھیوں اور چونٹیوں پر اس سے کہیں زیادہ پڑھنا چاہئے کہ یہ چیزیں بنسبت آفتاب کے قریب اور بہت قریب ہیں اور ان کا مادہ بھی بہت ہی کم ہے، حالانکہ معمولی کیڑوں تک کو گرتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا گیا، جب تک کہ وہ خود بیٹھنے کا ارادہ نہ کریں۔

۳):......مسئلہ جذب وکشش کے سمجھنے کے لیے ہمارے پاس مقناطیس اور لوہا موجود ہے، فرض کرو کہ ایک تولہ لوہے کو دو مقناطیسوں کے درمیان رکھتے ہیں، ایک طرف مقناطیس ایک سیر ہے اور دوسری طرف صرف ایک تولہ، ظاہر ہے کہ اس صورت میں لوہا ایک سیر والی کی طرف کھنچ جائے گا، پس اسی طرح آفتاب اور زمین کے درمیان جتنے موجودات ہیں، چاہیے کہ سب کے سب آفتاب کی طرف منجذب ہو جائیں کہ آفتاب کو زمین سے وہی نسبت ہے، جو ایک تولہ مقناطیس کو ایک سیر سے، کیونکہ یہ فلسفہ جدیدہ وقدیمہ دونوں کو مسلم ہے کہ آفتاب بہ نسبت زمین کے دس لاکھ حصہ سے زیادہ بڑا ہے، آفتاب کا قطر آٹھ لاکھ تراسی ہزار دو سو چھیالیس میل ہے اور زمین کا قطر تقریباً آٹھ ہزار میل ہے۔ غائت سے غائت سے خط استواء کا قطر میں ۳۵ میل کا اور اضافہ کیا جاتا ہے، حالانکہ معمولی غبار اور تنکے ہوا میں اڑتے ہیں اور آفتاب ان میں سے کسی کو نہیں کھینچتا۔

۴):......فلسفہ جدیدہ والے نور کو جسم مانتے ہیں، جو آفتاب سے نکل نکل کر دنیا میں پھیلتا

ہے، پس جبکہ تمام اجسام میں باہمی تجاذب ہے، تو چاہئے کہ آفتاب سے یہ اجسام نو رپیہ نہ بکھیریں کہ یہ کشش کے منافی ہے، کم از کم کچھ کشاکش تو ہونی چاہئے، حالانکہ یہ بھی نہیں ہوتا کہ خود مغربی حکماء کی تصریح ہے کہ نور کی رفتار آفتاب سے زمین کی طرف اس قدر تیز ہے کہ اندازہ کرنے کے بعد اس کی سرعت توپ کے گولے کی سرعت سے دس لاکھ گنا زیادہ معلوم ہوئی۔

۵): ...... ہم پوچھتے ہیں کہ زمین ہوا کو بھی کھینچتی ہے، یا نہیں؟ اگر کھینچتی ہے، تو یہ کہنا کہ تمام اجسام ایک دوسرے کو کھنچتے ہیں، حتی کہ اگر صرف دنیا میں ہم تم رہتے، تو آپس میں چپک جاتے، یہ قاعدہ غلط ہوا اور اگر کھینچتی ہے، تو چاہئے کہ ہوا کو زمین کے خطوط کشتی تھام لیتے اور اس کے چلنے میں مانع آتے، حالانکہ مشاہدہ اس کے خلاف ہے۔

٦): ...... فرض کرو کہ ہم مشک میں ہوا بھر کے اس کے منہ کو بند کر دیتے ہیں اور پھر پانی کے اندر لیجاتے ہیں اور زمین سے بالکل متصل کر دیتے ہیں، اب پوچھتے ہیں کہ زمین اپنا اثرِ جذب اس پر ڈالتی ہے، یا نہیں؟ اگر نہیں ڈالتی ہے، تو جذب کا قاعدہ عمومی غلط ہوا اور اگر ڈالتی ہے، تو ہمارے چھوڑ دینے کے بعد وہ اچھل کر کیوں اوپر نکل آتا ہے؟

۷): ...... زمین سے درخت کیونکر پیدا ہوتا ہے، اس کی علت بھی بیان کی جاتی ہے کہ بیج کے ذریعہ سے پانی اور مٹی اوپر چڑھتی ہے، حالانکہ زمین میں اگر قوت جذب کی ہے، تو اسے کیوں نہیں تھامے رہتی ہے۔ کس قوت کا اثر ہے وہ اسے چھوڑ دیتی ہے؟

۸): ...... یورپ کو بڑا ناز ہے کہ کشش وجذب کے مسئلہ سے اس نے سمندروں کے جزر ومد (یعنی: جوار بھاٹے) کا راز دریافت کیا، حالانکہ اگر غور کیا جائے، تو جزر ومد دراصل اس کی ابطال کے لیے کافی ہے، تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ عامۂ حکماء مغرب کہتے ہیں کہ سمندر پر آفتاب اپنی قوت جذبیہ کا جب اثر ڈالتا ہے اور اسی طرح چاند بھی اس کے پانی کو اپنی طرف کھینچتا ہے، اس لیے سمندر وں میں مدّ (چڑھاؤ) نمایاں ہوتا ہے، پھر جب اس پر زمین کی کشش غالب آتی ہے، تو جذر (اتار) پیدا ہو جاتا ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ بنسبت آفتاب کے قمر کا اثر سمندروں پر زیادہ پڑتا ہے، وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ ماہتاب بنسبت آفتاب کے سمندر سے

زیادہ قریب ہے، کیونکہ آفتاب ساڑھے نو کروڑ میل سے سمندر کے پانی کو کھینچتا ہے، بخلاف چاند کے کہ کل وہ تقریباً دولاکھ اڑتیس میل سے اپنا عمل کرتا ہے۔

اب اس قاعدہ کے اعتبار سے کہ ہر جسم دوسرے جسم کو کھینچتا ہے تسلیم کرنا چاہئے کہ زمین بھی سمندر کے پانی کو کھینچتی ہے اور ظاہر ہے کہ زمین کو سمندر کے پانی سے بہت زیادہ قربت ہے، کیونکہ اس میں اور زمین کے درمیان کوئی چیز حائل نہیں، دومیل، تین میل سے زیادہ گہرائی سمندروں کی آج تک ثابت نہیں ہوئی، اس کے علاوہ اس کو بھی پیش نظر رکھو کہ زمین اور چاند کی جسامت میں نمایاں فرق ہے کہ چاند کا قطر کل دو ہزار ایک سوستر میل ہے اور زمین کا قطر آٹھ ہزار میل ہے۔

الغرض زمین سمندر سے قریب بھی ہے، اس کی جسامت بھی چاند سے بہت زیادہ بڑھی ہوئی ہے، پھر ایسی صورت میں چاند کی کشش کا سمندر پر غالب آنا کیا حیرت انگریز نہیں؟ کیا مثال بعینہ ایسی نہیں کہ چیونٹی اور ہاتھی ایک چیز کے کھینچنے میں زور لگاتے ہیں، لیکن چیونٹی غالب اور ہاتھی مغلوب ہو جاتا ہے؟ کیا کوئی معمولی عقل کا آدمی بھی اس کو تسلیم کرسکتا ہے....؟

پھر یہی نہیں، فرض کرو کہ چاند غالب آیا اور اس نے سمندر کو سوفٹ تک بلند کر دیا، جس کو عموماً خلیج فنڈا میں دیکھا گیا ہے، تو اس وقت پانی بنسبت پہلے کے چاند سے زیادہ قریب ہوگیا، چاہئے کہ اب اس کے غلبہ کا اظہار زیادہ ہو، حالانکہ بہت جلد زمین غالب آجاتی ہے اور سمندر اتر جاتا ہے۔

جذب کا مقتضے تھا کہ سمندر کھنچ کر بالکل کرۂ قمر، یا آفتاب تک پہنچ جاتا ہے کہ جو زمین قریب غالب نہیں آسکی، اب دور ہو جانے کے بعد کیوں کر غالب آسکتی ہے؟

۹):......عجیب بات ہے کہ بارش بادل وغیرہ کے بیان میں جدید فلاسفہ مغرب وہی کہتے ہیں، جو یونانیوں نے کہا تھا کہ آفتاب اپنی شعاع تر زمینوں پر، یا سطح سمندر پر ڈال کر ان کو اس درجہ رقیق کر دیتا ہے کہ وہ اس ہوا سے بھی ہلکے ہو جاتے ہیں، جو زمین اور سمندر پر چھائی ہوئی ہے اور چڑھ کر طبقہ زمہریرہ تک پہنچتے ہیں اور وہیں بادل بارش اولے بن جاتے ہیں، حالانکہ کشش وجذب کی صورت میں یہ بالکل ناممکن ہے،

کیونکہ یہ کھلا ہوا سوال ہوتا ہے کہ زمین تو ان بخارات سے بہت قریب ہے، وہ ان کو کیوں نہیں داب لیتی، علاوہ اس کے آفتاب جب سمندر کے پانی کو خود اپنی کشش سے اوٹھا لیتا ہے، تو بخارات کو اوپر کھینچ لینے، کرنوں سے کام لینے کی کیا ضرورت ہے، حالانکہ جدید فلاسفہ لکھتے ہیں کہ:

''بخارات کو آفتاب بذریعہ شعاع کے اپنی طرف کھینچتا ہے''۔

خیر ہمیں اس سے بحث نہیں، لیکن یہ سوال ضرور ہے کہ ابخرات کو زمین کیوں نہیں دبوچے رہتی ہے، آفتاب اتنی دور سے اس پر کیوں اثر کرتا ہے....؟

۱۰):...... زلزلہ کی تحقیق میں بھی مغربی اور مشرقی حکماء بھی کہتے ہیں کہ زمین میں ابخرات گھٹ جاتے ہیں اور اوپر نکلنا چاہتے ہیں، چونکہ منفذ نہیں ہوتا، اس لیے ان میں اور زمین میں مزاحمت ہوتی ہے، اس سے زلزلہ پیدا ہوتا ہے، حالانکہ اگر زمین میں جذب کی قوت ہے، تو ان کے نکلنے اور اوپر چڑھنے کے کیا کہنے...؟

۱۱):...... مقناطیس کی کوئی سل نیچے رکھ دو اور اوپر سے اس پر لوہا گراؤ، وہ اس پر چپک کر رہ جائے گا، اب اگر ڈھیلے اور زمین میں بھی نسبت ہے، تو چاہیے کہ ڈھیلا زمین پر آتے ہی چپک جائے، حالانکہ اچھل پڑتا ہے، جو بجائے قوت جاذبہ ثابت کرنے کے واقعہ کی مثبت ہے۔

۱۲):...... جذب و کشش کے اصول پر نہروں کا جاری ہونا، دریاؤں کا بہنا، سیلاب کا بڑھنا محال ہے، کیونکہ زمین کا ہر جز پانی کے ہر جز کو اپنی قوتِ کشش سے کیونکر سرکنے دے سکتی ہے۔

۱۳):...... کہا جاتا ہے کہ زمین سے خطوط کششی نکل کر آفتاب کو کھینچتے ہیں اور معلوم ہے کہ زمین آفتاب کو نو کروڑ میل سے کھینچتی ہے، اب ہم ایک دس ہاتھ کی چھت زمین سے دو ہاتھ اونچی کر کے دو بانسوں پر بلند کرتے ہیں، اب ظاہر ہے کہ اتنے خطوط کششی جن کو اس چھت نے روک لیا، بجائے آفتاب کے خود اس چھت کو اپنی طرف کھینچیں گے، اس وقت عقل کا مقتضے ہونا چاہئے کہ یہ چھت فوراً گر جائے، کیونکہ جو چیز نو کروڑ میل تک اپنا اثر پہنچا سکتی ہے، وہ دو ہاتھ پر اپنی قوت کا مظاہرہ کس شدت کے ساتھ

کرے گی، حالانکہ ایسی چھتیں سالہاسال قائم رہتی ہیں اور زمین کی خطوط شعاعی ان کواپنی طرف نہیں کھینچ سکتے۔الا ماشاءاللہ۔

۱۴):......تم پڑھ آئے ہو کہ نیوٹن نے اس اشکال سے بچنے کے لیے کہ جذب وکشش کی صورت میں کوآفتاب سے ٹکرانا چاہئے ،فلاخن پر قیاس کر کے زمین میں ایک ''تارک المرکز'' قوت کا پتہ چلایا، حالانکہ اس میں بھی وہی سطاحت وتنگ نظری ہے، مرچ ایک پھل ہے، جو تلخ ہوتا ہے، اسی پر کوئی اگر انگور کو قیاس کرے، تو کیا یہ قیاس صحیح ہوگا؟

علاوہ اسکے قوت تارکۃ المرکز کا ثبوت زمین کی حرکت پر موقوف ہے اور حرکت زمین خود ایک نظری اور قابل غور مسئلہ ہے، اردو زبان میں اس کے ابطال واستحالہ کے دلائل کثرت سے شائع ہو چکے ہیں، جب تک اس کو ثابت نہ کر لیا جائے، کشش کا مسئلہ طے نہیں پاسکتا۔میں انشاءاللہ آئندہ نمبر میں اس پر بھی ایک بحث کروں گا۔ ان وفقنی الله تعالیٰ وهو علی کلی شیء قدیر.

(ماہنامہ الرشید دیوبند)

البدعة و حقيقتها

ایک پنجاہ سالہ انداز و تبلیغ الحمداللہ کم از کم یہ نتیجہ تو دیکھا جاتا ہے کہ عموماً ہندوستان کے مسلمان اس آواز سے نا آشنا نہیں رہے۔ ارباب علم راسخ ومعرفتہ صادقہ میں ایسے نفوس تزکیہ بکثرت پیدا ہو گئے ہیں، جو اپنی ہر حرکت وسکون دینی میں اس کا خیال کر لیتے ہیں کہ شریعت میں اس کی اصل موجود ہے، یا نہیں۔

تاہم ایک جماعت ہے، جو ابھی تک دل کو سخت کر کے چاہتی ہے کہ ان کی آوازوں کو پادر ہوا بناوے، جب اس کے کسی عمل وفعل پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ بدعت ہے، تو چند امثلہ مروّجہ کے ذریعے سے فضول حق کو باطل کے ساتھ گڈ مڈ کر دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

ہم کہتے ہیں کہ تمہارا فلاں فعل بدعت ہے کہ قرن مشہور میں اس کی مثال نہیں ملتی ، جواب میں کہہ دیا جاتا ہے کہ اگر ہر چیز میں قرون اولیٰ کے اصل کی ضرورت ہے، تو مدارس کیوں بدعت نہیں، کتابوں کی تالیف وتصنیف کیوں بدعت نہیں؟ جمع ہو کر ایک خاص شان کے ساتھ حلقہ درس قائم کرنا کیوں بدعت نہیں، مطابع وجرائد کا اجراء کیوں بدعت نہیں کہ ان چیزوں کی بھی اصل تم قرون سابقہ میں کہاں سے لاسکتے ہو؟

اگرچہ اس کے جوابات بہت سے ہیں اور دیے جاچکے ہیں اور دونوں کے باہمی امتیازات کو اچھی طرح واضح کر دیا گیا ہے، ضرورت نہ تھی کہ اسے ہم اس وقت غرناطہ (اندلس) کے ائمہ فن میں ہو گزرے ہیں، ابواسحاق ابراہیم بن محمد اللخمی الشاطبی جو غرناطہ (اندلس) کے ائمہ فن میں ہو گزرے ہیں، ان کی کتاب ''الاعتصام'' نظر سے گزری، جو حال ہی میں مصر سے چھپ کر آئی ہے، انہوں نے بدعت پر ایک بسیط تبصرہ کر ڈالا اور ان اعتراضات کی بابت تشفی بخش جوابات دیئے، خیال ہوا کہ ناظرین ''الرشید'' اگر اس کے تمام مضامین سے واقف نہیں ہو سکتے، تو کم از کم چند صفحات میں اس کا خلاصہ پہنچا دینا چاہئے۔

امام موصوف اپنے عصر کے وحید فاضل ومفسر، یگانہ دہر، فقیہ ومحدث، لغت، بیان، معانی، نحو میں ان کا رتبہ مجتہدینِ فن سے کم نہیں مانا جاتا، نہایت کثیر التالیف والتصنیف

ہیں، اصول فقہ میں ان کی کتاب ''موافقات'' جس کا نام ''عنوان التعریف بأصول التکلیف'' ہے، ایک نادر تصنیف خیال کی جاتی ہے، عموماً ان کے بعد علماء نے اس کتاب کی تعریف کی اور فائدہ اٹھایا، یا اس کے علاوہ مجالس افادات ''عنوان الاتفاق فی علم الاشتقاق'' ''اصول النحو'' وغیرہ اور بھی کتابیں مشہور ہیں اور ہر ایک اپنے موضوع میں نہایت جامع اور محققانہ انداز سے لکھی گئی ہیں۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

امام موصوف کو زیادہ تر بدعات، احداث فی الدین سے سخت نفرت تھی، خیال تھا کہ اگر اسی طرح شرعی امور میں ہر ایک مسلمان کو اضافہ، یا نقص کا اختیار دیا جائے گا، تو اسلام کا اصلی چہرہ پھر کسی کو نظر بھی نہیں آسکتا اور بالکل سچ فرماتے تھے، مثلاً: فرض کرو کہ ہندوستان میں اس وقت آٹھ کروڑ مسلمان آباد ہیں، ان کو اجازت دی جائے کہ تم اپنی طرف سے عبادات ومعاملات میں دخل دے سکتے ہو... اور ان میں سے ہر سال ایک ایک شخص صرف ایک مسئلہ کا اضافہ کرے۔

بادی النظر میں صرف ایک مسئلہ کے بڑھا دینے سے کیا نقصان ہوسکتا ہے، لیکن مجموعہ کے اعتبار سے صرف دو سال کی قلیل مدت میں سولہ کروڑ ہو جائیں، کیا اس انبوہ کے نیچے ''دین الیسر ملۃ سمحاء'' کی صورت پھر کسی کو نظر آسکتی ہے؟ پتہ بھی چل سکتا ہے خدا تعالیٰ نے مسلمانوں کو کن احکام کے لیے مکلّف کیا تھا، رسول خدا ﷺ نے ہماری فلاح و بہبود کے لیے کن اصولوں کی تعلیم دی تھی؟ کیا اس کے بعد پھر انسان خُدائی حکومت سے نکل کر چند اپنے ہی ایسے دماغوں کی زیرِ ریاست نہیں داخل ہوگا؟ احبار ورہبان کی وہی بیڑیاں جن کو رسول ﷺ کاٹنے آئے تھے، کیا اسی کو پہننے کے لیے ہم اپنے کو مجبور نہ پائیں گے، حقیقت یہ ہے کہ اس سے زیادہ نکبت انداز وقت مسلمانوں کے لیے اور کوئی نہیں ہوسکتا کہ لوگ ان پر اپنے اختراعی قوانین واحکام کو لازم کرتے رہیں اور ان سے بچانے والا کوئی نہ ہو، لیکن یہ خدا کا شکر ہے کہ جہاں بدعت کے سیلاب آئے، دن ابھرتے رہتے ہیں، وہیں ان کے رکنے کے لیے بھی کوئی ہاتھ ہر قرن میں پڑ جاتا ہے، جو اگرچہ نبی نہیں ہوتا کہ نبوت کا دروازہ بند کردیا گیا، تاہم ''مجدد'' ہوتا ہے اور دین کو ان فتنوں سے محفوظ کردیتا ہے، اس کا نتیجہ ہے کہ آج اسلام کی چودہویں صدی گزر رہی ہے اور درمیان میں سینکڑوں مفاسد ومحدثات کا زور

رہا، مگر پھر بھی کچھ لوگ ہیں جو ہر وقت اسلام حق کے چہرے سے نقاب اٹھا سکتے ہیں، سمجھتے ہیں کہ محمد ﷺ کن چیزوں کو لائے اور غیروں نے ان میں کیا اضافہ کیا؟ جو ﴿وجعلنا منهم ایمه یهدون بأمرنا﴾ (اور بنایا ہم نے ان میں سے امام جو ہدایت کرتا ہے ہمارے حکم سے) کے حقیقی مصداق ہیں۔ فجزاهم الله تعالىٰ عنّی وعن المسلمین خیراً جزاء

بہر حال علامہ شاطبیؒ بھی انہی لوگوں میں سے ہیں، اندلس میں جب بدعات کا چرچہ ہوا، تو اس وقت آپ نے یہ کتاب تصنیف کی۔ بدعت کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

بدعت کی لغوی تحقیق

بدعت کا اصل مادّہ ''بدع'' ہے۔ ایسی چیز بنانی جس کی مثال پہلے سے موجود نہ ہو، لغت والے اس کا ترجمہ کرتے ہیں، قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿بدیع السمٰوات والارض﴾

''بلانمونہ کے بنانے والا آسمان وزمین کا''۔

اس کے معنی بھی یہی ہیں کہ اس نے آسمان وزمین کو اس طرح بنایا کہ اس کی مثالیں پہلے سے موجود نہ تھیں، یا مثلاً دوسری آیت:

﴿وما کنت بدعا من الرسل﴾

''اور تو پیغمبروں میں نئی چیز نہیں''۔

میں بھی یہی قصد ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا دعویٰ رسالت ایسا دعویٰ نہیں ہے کہ جس کی نظیر پہلے سے موجود نہ تھ، عرب عموماً اپنے محاورات میں بولتے ہیں:

''ابتدع فلان بدعة''

''فلاں نے بدعت نکالی''۔

مراد یہ ہوتی ہے کہ فلاں شخص نے ایک ایسا انوکھا راستہ ایجاد کیا، جس پر پہلے کوئی نہیں گزرا، یا مثلاً:

''هذاامر بدیع''

''یہ بڑی بدیع چیز ہے''۔

ایسی خوبصورت چیز کو کہتے ہیں جس کی حسن وخوبی کی مانند اور کسی چیز کا حسن نہ ہو، گویا وہ آپ اپنی نظیر ہے۔

بدعت کی شرعی تحقیق

انہیں مناسبتوں سے آخر ان کاموں کو جو بالکل انوکھے ہوتے تھے، عرب ''بدعت'' کہنے لگے، گویا وہ ایک چیز ہے کہ اس کی نظیر اس سے پہلے نہیں پائی گئی، شریعت نے لغت سے بدعت کو اسی مناسبت سے اپنی زبان میں منتقل کیا، علماء نے اس شرعی بدعت کی حقیقت یہ منقح کی: ''جس عمل پر کوئی دلیل نہیں ہے، وہ بدعت ہے''۔

یہ اطلاق لغوی استعمال کے اعتبار سے گو خاص ہے، تاہم مناسبت ظاہر ہے کہ جن اعمال وافعال پر دلیل نہیں ہوگی، وہ یقیناً شرعی نقطۂ نظر کے اعتبار سے انوکھی اور نئی ہوگی، ہم اس کی تفصیل کے لیے ذیل کی مباحث پر ناظرین کو متوجہ کرنا چاہتے ہیں۔

مقدمات

(۱)_ الٰہی قانون کو سامنے رکھ کر جب ہم اپنے افعال واقوال پر نظر ڈالتے ہیں، تو اس کی کل تین صورتیں ہوسکتی ہیں:

۱: بعض اقوال و افعال ایسے ہیں جن کا ہمیں حکم وامر کیا گیا ہے، جیسے: نماز، زکوٰۃ وغیرہ۔

۲: بعض ایسے ہیں جن سے منع کیا گیا اور روکا گیا ہے، جیسے: سودخوری، زنا وغیرہ۔

۳: بعض ایسے بھی ہیں جن کے متعلق اختیار واجازت دی گئی، خواہ ہم کریں، یا نہ کریں، ہمیں ہر طرح کا اختیار حاصل ہے، مثلاً: چارپائی پر سونا، سواری پر بیٹھنا وغیرہ۔

الغرض بندوں کے افعال واقوال، رفتار وگفتار، ان تین قسموں سے متجاوز نہیں ہوسکتے کہ شارع علیہ السلام یا دنیا والوں کو اس کا پابند بنانا چاہتے ہیں، یا اسے چھڑانا چاہتے ہیں، یا نہ پابند بنانا منظور ہے اور نہ چھڑانا مقصود ہے، بلکہ اس کے کرنے نہ کرنے میں بندہ ماذون ومجاز ہے۔

(۲)_ دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ جن کردار وگفتار کو شارع علیہ السلام دنیا سے مٹانا چاہتے

ہیں، وہ یقیناً یا تو ان کے افعال کے مخالف ہوں گے، جس پر دنیا کو چلانے کا ارادہ کیا گیا ہے اور اگر ان کے مخالف نہیں، تو پھر جن باتوں کا ہمیں اختیار دیا گیا ہے، اس کے مخالف ہوگیا لغرض ممنوع باتوں کو ان دو قسموں کا مخالف ہونا ضروری ہے، اس کو مثال کی صورت میں یوں سمجھو! شارع علیہ السلام اس شخص کو ڈانٹتے ہیں اور جہنم کا خوف دلاتے ہیں، جو نمازیں نہیں پڑھتا، کیوں؟ اس لئے کہ ترکِ صلوٰۃ، اداءِ صلوٰۃ کے منافی ہے، یہ تو اس کی مثال تھی کہ امور ممنوعہ، احکام واجبہ کے مخالف ہوئی ہیں۔ اب اس کی مثال لو کہ امور ممنوعہ، مباح و ماذون باتوں کے مخالف ہوتے ہیں اور یہ بہت زیادہ ہیں، مثلاً: عموماً کھانے پینے کی انسان کو اجازت دی گئی، اب شراب نوشی، یا سود خوری اس کے خلاف ہے۔

(۳) تیسرا مقدمہ یہ ہے کہ جب یہ بات محقق ہوگئی کہ امور ممنوعہ مامور یا مباح کے مخالف ہوتے ہیں، تو اب سمجھنا چاہئے کہ ان کی مخالفت کی دو صورتیں ہیں:

۱: ایک تو یہ کہ اس کی مخالفت بالکل کھلی کھلی ہو، مثلاً: ترک صلوٰۃ کی منافات اداءِ صلوٰۃ سے بالکل ظاہر ہے۔

۲: دوسری صورت یہ ہے کہ بادی النظر میں وہ مخالف نظر نہیں آتے، لیکن غور کرنے کے بعد معلوم ہوجاتا ہے کہ یہاں مباح و ماذون باتوں کے خلاف ایک الگ قانون بنایا جارہا ہے، مثلاً: اپنی عبادتوں میں خاص خاص کیفیات کا اضافہ کرنا، جیسے: کھڑے ہوکر روزہ رکھنا، یا کسی خاص ہیئت کی تعیین کرنا، مثلاً: شعبان کے مہینے میں ۱۴ یا ۱۵ کی رات کو مسجدوں میں جمع ہوکر جماعت کے ساتھ نمازیں ادا کرنی، یا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کسی خاص عبادت کے لیے کسی خاص زمانے کو اپنی طرف سے مقرر کرلینا، مثلاً: رجب کے مہینے میں معراج کے ذکر سے ثواب حاصل کرنے کا طریقہ، یا رسول ﷺ کے ولادت کے دن کو عید بنانی، مردے کے لیے تیسرے، نویں، یا چالیسویں دن کھانا تقسیم کرنا وغیرہ۔

تو چونکہ یہ باتیں عموماً امور مباح و ماذونہ کے مخالف ہوتی ہیں، جو یقیناً تشریع اور تقنن کے خلاف ہے، قانون کا مقتضیٰ یہی ہوتا ہے کہ مقنن نے جن لفظوں میں اپنا مدعا ادا کیا ہے، اس سے سرمو تجاوز نہ کیا جائے، پس شرعی قانون میں اس کی کیوں مراعات نہیں کی جائے گی، اور یہی میرا مدعا ہے کہ وہ باتیں جو ظاہر تشریع کے مخالف ہیں، وہ بدعت ہے، اس کا

مرتکب ''مبتدع'' ہے اور اسی بناء پر اب بدعت کی تعریف یہ ہوئی:

بدعت کی تعریف

دنیا میں ایک مخترع خود تراشیدہ راستہ ہے، جو شرعی راہوں کے مشابہ ہے اور اس پر چلنے والوں کا یہ مقصود ہوتا ہے کہ خداوند تعالیٰ کی عبادت میں اس سے زیادتی ہوتی ہے۔

یہ تعریف ان لوگوں کی ہے جو دنیاوی کاروبار کو جسے ''افعالِ عادیہ'' کہتے ہیں، بدعت کے اندر داخل نہیں کرتے، مگر جن لوگوں نے ان کو بھی داخل کیا ہے، انہوں نے بدعت کی تعریف یہ کی:

''بدعت دین میں ایک ایسا مخترع ایجاد کردہ راستہ ہے، جو شرعی راستوں کے مشابہ ہو، اس پر چلنے سے وہی باتیں مقصود ہوں، جو شرعی راستوں پر چلنے سے ہوتی ہیں''۔

تعریف کی تنقیح وتوضیح

امام شاطبی نے حسبِ عادت ائمہ سلف دونوں تعریفوں کے ہر ہر لفظ پر الگ الگ بحث کی، میں بجنسہ اس کا ترجمہ کر دیتا ہوں۔

سب سے پہلا قطعہ ہمارا یہ ہے کہ ''دین میں وہ خود تراشیدہ راستہ ہے''۔ میں نے دین کا لفظ اس لئے بڑھایا کہ بدعتی کا مقصود ایسے اعمال وافعال کے ایجاد کرنے سے یہی ہوتا ہے کہ اپنی اس ساختہ پرداختہ ایجاد کو شرعی باتوں کے ساتھ گڈمڈ کر دے، اس لئے گویا وہ دین میں ایک نئی سڑک ہوئی، علاوہ اس کے دنیاوی امور میں نئی نئی ایجادات چونکہ بدعت نہیں ہیں، مثلاً: صناعات وحرف، شہروں کا بسانا وغیرہ، اس لئے ہم نے یہ قید بڑھائی ہے، ورنہ مطلق رکھنے کی صورت میں ان پر یہ تعریف صادق آجاتی۔

بہرکیف اس وقت اسلام میں جتنے راستے چلنے کے لیے مقرر ہوئے، ان کی دو صورت ہیں: ایک تو وہ ہیں جن کی ابتداء اور اصل ہے اور دوسری وہ ہیں جو جدید التعمیر ہیں اور محض بے اصل ہیں۔

تو چونکہ بدعت یہ آخری صورت تھی، اس لئے خود تراشیدہ اور مخترع کا لفظ بڑھایا گیا، یعنی: سرزمین شریعت میں وہ ایک سڑک ہے، جس کی داغ بیل شارع علیہ السلام نے

نہیں ڈالی....اس کے بعد لکھتے ہیں کہ:

''تم نے اس مقام پر سمجھ لیا ہوگا کہ اکثر چیزیں جو بادی الراء میں بدعت نظر آتی ہیں، وہ بدعت نہیں، مثلاً: کہا جاتا ہے کہ نحو وصرف، مفردات، لغت، اصول دین، الغرض تمام علوم جو شریعت کے خادم ہیں، یہ سب بدعت ہیں''۔

لیکن یہ سراسر حماقت ہے، اس لئے گو یہ موجودہ صورت کے ساتھ اس زمانہ میں موجود نہ تھے، تاہم داغ بیل ان کی اسی زمانہ میں پڑ چکی تھی، مثلاً: قرآن پر اعراب لگانے کا حکم منقول ہے۔

علاوہ اس کے ہمیں قرآن وسنت کے فقہ کا حکم دیا گیا ہے اور وہ بغیر زبان عربی سیکھے ناممکن ہے اور عربی زبان کا سیکھنا ان علوم پر موقوف ہے، پس ہمیں نحو وصرف وغیرہ سے تعبّد مقصود نہیں، بلکہ عبادت کے طریقے سیکھنے کے لیے ہم ان علوم کو پڑھتے ہیں، کیونکہ قرآن وحدیث کے ذریعے سے ہم اپنے مالک ذوالجلال کی مرضی کے مطابق اپنی زندگی کو بنا سکتے ہیں۔

اسی طرح سے جن دلائل سے مسائل پیدا ہوتے ہیں، ان کے کلیات کی تلاش وجستجو یہ اصول فقہ ہے، اس سے بھی مقصود عبادت نہیں، بلکہ مجتہد اس میں اس لئے غور کرتا ہے، تاکہ اپنے مسائل نکالنے کے لیے کسی چیز کو نصب العین بنالے اور مقلد کے لیے مسائل کی تلاش میں آسانی ہو۔

اسی طرح قرآن وحدیث کے ان دعووں کو جن کا تعلق عقائد سے ہے، عقلی طور پر مدلّل کرنا، ان کی وضاحت وتفسیر یہ ''علم کلام'' ہے اور ان میں کوئی باتیں نئی نہیں ہیں۔

کیا صحابہؓ کلامِ مجید اور حدیث سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے تھے؟ اور جبکہ کرتے تھے، تو ہم بھی اگر ایسا کرتے ہیں، تو یہ وہ سڑک کس طرح ہوسکتی ہے، جس کی داغ بیل قرنِ مشہود میں نہیں پڑی تھی.....؟ کہہ سکتے ہو کہ خیر اگر یہ علوم بدعت نہیں، تو ان کی تالیف وتدوین کے بدعت ہونے میں کیا شبہ ہے؟ لیکن نہیں، تم کو بادنی تأمل معلوم ہوسکتا ہے کہ تصنیف کا رواج تو آنحضرت ﷺ کے زمانے میں ہو چکا تھا، علاوہ اس کے اگر ہم اس سے قطع نظر بھی کرلیں، تو یہاں ایک بات قابل غور یہ ہے کہ بعض چیزوں کے لیے کوئی خاص جزئی تو موجود نہیں ہوتی، لیکن پوری شریعت پر نظر ڈالنے کے بعد اس کی ضرورت ثابت

ہو جاتی ہے۔

بہر کیف کل دو حال ہیں، یا تو تالیف وتصنیف کی اصل شریعت میں موجود ہے، یا نہیں؟ اگر ہے، تو فھو المدعیٰ، اور اگر نہیں ہے، تو میں یقیناً اس کو بدعت کہوں گا اور جب بدعت کہوں گا، تو اس کی ضلالت ہونے میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ:

﴿کلّ بدعة ضلالة﴾

''ہر بدعت گمراہی ہے''۔ (صحیح مسلم)

لیکن تم کو کیا معلوم کہ کیا ہو گیا؟ لازم آیا کہ قرآن مجید کی کتابت اور اس کو دفتن میں تدوین کرنا بھی ضلالت وگمراہی ہو، حالانکہ یہ بالا جماع باطل ہے، تو اب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ اجماع[1] بلا کسی شرعی دلیل کے قائم ہو گیا ہو اور ہو سکتا ہے کہ گو کسی جزئی سے یہ ثابت ہو، لیکن جملہ شریعت نے قرآن کی کتابت وتدوین کو ضروری بنا دیا ہے اور جب ایک جزئی کے اندر مصالح مرسلہ کے ذریعے سے مسائل ثابت ہو سکتے ہیں اور اسی مصالح مرسلہ کے قانون کے اعتبار سے صرف ونحو، علم اصول، فقہ وکلام وغیرہ کو بدعت نہیں کہنا چاہئے اور جن لوگوں نے اسے بدعت کہا ہے، تو یہ یا تو اطلاقِ مجازی ہے، جیسا کہ حضرت عمرؓ نے رمضان کی تراویح کو بدعت کہا، یا یہ ان کی حمقا کے اقوال ہیں، جو سنت اور بدعت کے درمیان تمیز دینے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔

اس کے بعد تعریف کا لفظ ''شرعی باتوں کے مشابہ ہو'' تھا۔

شرح اس کی یہ ہے کہ صرف ان طریقوں کو شرعی باتوں سے مشابہت ہی مشابہت ہو، ورنہ واقع میں وہ شریعت کے مخالف ہو، مثلاً: روزہ میں شارع علیہ السلام نے کھڑے ہونے اور بیٹھنے دونوں کی اجازت دی ہے، اب اگر کسی نے کھڑے ہونے کا روزہ میں التزام کر لیا، تو یہ بدعت ہے کہ یہ تعیین حدود ہے اور میں بتا چکا ہوں کہ وہ ظاہر شرع کے خلاف ہے، اسی طرح کھانے پینے، اور کپڑوں میں خاص خاص قسم کو اپنے لئے تعیین کرنا اور یہ سمجھنا کہ اس سے عبادت میں مبالغہ پیدا ہوتا ہے، یقیناً بدعت ہے، یا جمع ہو کر ذکر کرنا، یا رسول ﷺ کے ولادت کے دن عید بنانی وغیرہ۔

[1]:.....لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ اجماع کے ذریعے سے شریعت میں نئے مسائل آ جاتے ہیں، حالانکہ یہ غلط ہے،۔ بلکہ اصل یہ ہے کہ کوئی مسئلہ جز واحد وغیرہ سے ثابت ہوتا ہے لیکن وہ ظنی رہتا ہے۔ اجماع کے ذریعے سے اس میں قطعیت آ جاتی ہے۔

الحاصل جس نئے فعل میں ایسے اوصاف ہوں کہ ان کا شرعی افعال کے ساتھ ملتبس ہو جانا اغلب ہو، پس اسی کو بدعت کہتے ہیں اور اگر اس کو شرعی امور سے مشابہت نہیں ہوئی (مثلاً: شادیوں میں باجا گاجا، آتش بازی، گشت وشنی وغیرہ کا ہونا بدعت نہیں، بلکہ سفاہت اور تبذیر واسراف ہے، کیونکہ یہ کوئی نہیں سمجھتا ہے کہ ان باتوں سے ثواب ہوتا ہے، یا اس سے خدا کی عبادت میں مبالغہ پیدا ہوتا ہے____ علاوہ اس کے اس قید سے اس پر بھی تنبیہ مقصود ہے، جو اکثر مبتدعین کے دل میں مستور ہوتی ہے۔

تفصیل یہ ہے کہ جب بدعتی کسی بدعت کو تراشتا ہے، تو اس کے تراشنے کی کل تین علتیں ہوسکتی ہیں:

۱: یا اس سے کوئی نفع حاصل کرنا مقصود ہے، جیسا کہ عموماً میلا وے اور قبروں کے مجاوروں کا حال ہے۔اسی طرح مُردوں کے کھانے پر ٹوٹنے والوں کا۔

۲: یا کسی ضرر کا ازالہ منظور ہوتا ہے، الٹی سیفی وغیرہ، اور سورۃ الفاتحہ کو الٹ کر پڑھنے کی یہ تاثیر بیان کرنی کہ اس سے میرا دشمن مر جائے گا۔

۳: یا شہرت وجاہ، گویا لوگوں کو سمجھانا کہ دیکھو میں ایسے وسائل تمہیں دیتا ہوں، یہ تمہیں خدا تک جلدی پہنچائے گا اور یہ تمام باتیں بغیر شرعی ڈھال کے ناممکن ہیں، اسی لئے بدعتی اپنی خودساختہ باتوں کے متعلق ایسی چکنی چپڑی باتیں بناتا ہے، گویا کہ قانون تشریع یہی ہے، کم از کم آخری حربہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ فلاں فلاں بزرگ جس کے متعلق مسلمان حُسنِ ظن رکھتے ہیں، ان کی اقتداء ہے، ان لوگوں کی بجنسہ وہ حالت ہے، جو کفار اہل مکہ کا حال تھا، جب شرک کے متعلق پوچھا جائے، تو اسے شرعی قانون کے مشابہ کرنے کے لیے کہہ دیتے:

﴿مانعبدهم الاليقربونا الى الله زلفىٰ﴾

''نہیں پوجتے ہم ان بتوں کو، لیکن اس لئے کہ خدا کے قریب کر دیں''۔

قریش کے معززین نے عرفہ پر وقوف چھوڑ دیا تھا اور محض اس میں اپنی عزت پروری تھی، لیکن کہتے تھے کہ ہم حرم کو چھوڑ کر نہیں جاسکتے، حرم کی حرمت اس کے متقاضی ہے کہ ہم ہر وقت اس پر پڑے رہیں، ورنہ کم از کم حج کے دنوں میں تو ایسا ہی کرنا چاہئے، کعبہ کا طواف ننگے ہو کر کیا کرتے تھے اور وجہ یہ بیان کرتے کہ جن کپڑوں میں ہم نے گناہ کئے ہیں، ان

میں کیونکر طواف کر سکتے ہیں۔

سب سے آخری جملہ ہمارا یہ ہے: ''جس پر چلنے سے عبادت مقصود ہو''۔

بدعت کی حقیقت ان لفظوں پر تمام ہو جاتی ہے کہ مبتدع دراصل مغالطہ اسی لفظ سے دیتا ہے، قدر مشترک تمام مبتدعین کا یہ ہے کہ ''انسان خدا کی عبادت کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور فلاں فلاں طریقوں سے خدا زیادہ خوش ہوتا ہے اور اس کی قربت زیادہ حاصل ہوتی ہے'' حالانکہ ان احمقوں کو یہ معلوم نہیں کہ جو کچھ شارع علیہ السلام نے فرمادیا، کیا وہ کافی نہ تھے؟ کیا دین کامل نہیں ہو چکا ہے؟ اور کامیابی اس میں یوں ہو جاتی ہے کہ ایک ہی قسم کی عبادت کرتے کرتے لوگ اُکتا جاتے ہیں، مبتدع ان کے سامنے نئی چیزیں پیش کرتا ہے، لوگ جدّت کی وجہ سے اس کو تھام لیتے ہیں، پھر اس پر یہ مغالطہ بڑھا دیا جاتا ہے کہ ''جس طرح گناہوں میں نئی باتوں کا اضافہ ہو رہا ہے، چاہئے کہ نیکیوں میں بھی اسی کے حساب سے زیادتی کی جائے''۔

ایک حدیث میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے، حضرت معاذ بن جبلؓ راوی ہیں کہ:

''حضور ﷺ نے فرمایا: قریب ہے کہ کہنے والا کہے گا کہ میں نے لوگوں کو قرآن پڑھایا، لیکن انہوں نے میری پیروی نہ کی، پس اب بہتر ہے کہ کوئی نئی بات نکالی جائے، تاکہ وہ پھر میری اتباع کریں، پس کوئی نئی بات ایجاد کرے گا، پس خبردار! کہ تم اس کے قریب نہ ہونا کہ وہ گمراہی ہے''۔

اس سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ ایسی نئی باتیں جن سے تعبد مقصود نہیں، وہ بدعت نہیں، مثلاً: ہاتھ اشنان[1] کے ساتھ دھونا، آٹا چھاننے کی چھلنی بنانی وغیرہ۔

یہ شرح بدعت کی پہلی تعریف تھی، رہی دوسری تعریف، تو اس بناء پر افعال عادیہ میں بھی نئی نئی ایجادیں بدعت ہو جائیں گی، جن لوگوں نے یہ مذہب اختیار کیا ہے، ان کی تقریر یہ ہے کہ شریعت دین و دنیا دونوں کو درست کرنے کے لیے آئی ہے، پس جس نے دنیاوی امور میں ایجاد کیا، گویا وہ شریعت کو اپنا خیر خواہ نہیں سمجھتا، اگر دین میں اختراع کرتا ہے تو گویا وہ آخرت کی فلاح کے طریقے بیان کرنے میں شریعت کو ناقص سمجھتا ہے۔

[1]...... ایک قسم کی گھاس ہے۔۱۲

اس بناء پر مناغل[1] وغیرہ کا بنانا بھی بدعت ہے اور لازم آتا ہے کہ چھنے ہوئے آٹے کی لذت اس کے نزدیک بغیر چھنے ہوئے سے کم ہو، جھونپڑے کی زندگی اونچی عمارتوں سے زیادہ آرام دہ ہو، پس بدعت کے اصل معنی وہی سمجھنا چاہئے، جو میں نے پہلے بیان کیئے۔ واللہ ولی التوفیق

آخر میں ہم اس پر بھی تنبیہ کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ جیسا کے بعض افعال واعمال کا کرنا بدعت ہے، اسی طرح بعض چیزوں کو چھوڑ دینا بھی بدعت ہے، اصطلاح میں اس کو ''بدعت ترکیہ'' کہتے ہیں، اس لئے جن چیزوں کو شریعت نے ہمارے لئے مباح کیا ہے، اگر اس کو کوئی ترک کرتا ہے، تو اس سے پوچھنا چاہئے کہ اس نے یہ کیوں چھوڑا؟ اگر کسی شرعی وجہ سے چھوڑا، مثلاً: کسی نے بھینس کا گوشت کھانا چھوڑ دیا، اس لئے کہ اس سے جسم میں خرابی پیدا ہوتی ہے، یا اسی طرح سے کسی اور چیز کو چھوڑ دیا کہ اس سے عقل میں فتور ہوتا ہے، تو ایسی چیزوں کا چھوڑنا بدعت نہیں، بلکہ اگر علاج کرنا مطلوب شارع ہے، تو ایسا کرنا ضروری ہے، ورنہ مباح ہونے میں تو کوئی شبہ ہی نہیں، یا احتیاطاً ایسی چیزوں کو کھاتا ہے، جن میں نقصان اور مضر کا احتمال نہیں اور جن میں ہے، اسے چھوڑتا ہے، تو کوئی مضائقہ نہیں۔

اس کی مثال ایسی ہوگی، جو متشابہات کو چھوڑ کر صرف حلال طیّب پر قناعت کرتا ہے اور اگر ان اغراض میں سے کوئی غرض نہیں، تو ان چیزوں کے ترک کو تدیّن اور تعبد شمار کرتا ہے، یا نہیں، اگر تدین نہیں سمجھتا، تو پھر ایک عبث کھیل ہوگا اور ہماری تعریف کی بناء پر گو یہ بدعت نہیں، بلکہ عادات میں شامل ہوگا، لیکن پھر بھی عاصی ضرور ہے کہ جس کو خدا نے حلال کیا، وہ اسے حرام اعتقاد کرتا ہے اور اگر تدین سمجھتا ہے (جیسا کہ ہندوستان کے بعض فقراء علاوہ زرد ساریوں کے تمام کپڑے بغیر سلے، اور چار پائی وغیرہ پر بیٹھ کو تعبد وتدین سمجھ کر چھوڑ بیٹھتے ہیں) پس یہی بدعت ہے اور یہ صریح خدا کی مخالفت ہے کہ خدا نے تو ایک چیز کو حلال قرار دیا تھا، لیکن اس کے خلاف اس نے حرام کر دیا، حالانکہ حکم ہے:

﴿یاایھاالذین امنوا لاتحرموا طیبات مااحل اللہ لکم ولاتعتدوا ان اللہ لایحب المعتدین﴾

[1]......آٹا چھاننے کی چھنی کو کہتے ہیں۔

''اے ایمان والو! ان پاک چیزوں کو جن کو خدا نے تمہارے لئے حلال کیا ہے، حرام مت کرو اور خدا سے نہ بڑھو، اللہ حد سے بڑھنے والوں کو دوست نہیں رکھتا''۔

بعض صحابہ نے اردہ کیا تھا کہ مطلقاً دن کو نہ کھائیں اور بعضوں نے عورتوں کے پاس نہ جانے کی قسم کھالی تھی اور بعضوں نے اپنے آپ کو ''خصّی'' بنانے کا فیصلہ کرلیا تھا، لیکن آنحضرت ﷺ نے اس سے منع کیا، پس جو شخص بغیر کسی عذرِ شرعی کے خدا کی حلال کی ہوئی چیزوں کو اپنے اوپر روکتا ہے، تو وہ سنت سے خارج ہے اور مبتدع اسی کو کہتے ہیں جو اپنے کو دیندار سمجھ کر خلافِ سنت عمل کرتا ہو۔

البتہ ایک سوال آخر میں رہ جاتا ہے کہ جن باتوں کے کرنے کا حکم ہمیں دیا گیا ہے، خواہ وہ فرض ہو، یا مستحب، یا سنت، تو کیا اس کا چھوڑنا بھی سنت ہے؟ جواب اس کا یہ ہے کہ اس نے کیوں ماموراتِ شرعیہ کو ترک کیا، اگر مخلص کسلمندی اور کاہلی سے اس نے چھوڑا ہے، تو اگر فرض واجب کا چھوڑنے والا ہے، تو عاصی وگنہگار ہے، اور اگر مستحبات کا تارک ہے، تو آیا ایک دو مستحب وسنت کا تارک ہے، یا تمام مستحبات کا تارک ہے، اگر سنت کا تارک ہے، تو عاصی ہے، ورنہ نہیں اور اگر اس کے چھوڑنے کو دین ومذہب سمجھتا ہے، جیسا کہ بعضوں کا خیال ہے کہ انسان آخر میں ایسی حد تک پہنچتا ہے کہ اس سے عبادت ساقط ہو جاتی ہے، یہ ترک البتہ بدعت ہے۔

حاصل مباحث

گذشتہ تعریف، یعنی: ''بدعت وہ طریقہ ہے جو شرعی امور کے مشابہ ہو'' بدعت کے تمام اقسام کو شامل ہے، ہم بغرض آسانی ان تمام اقسام کو ایک فہرست اخیر میں دیتے ہیں، جو بدعت کے نیچے داخل ہیں۔

۱: بدعت ترکیہ ''یعنی: وہ چیزیں جن کا ترک بدعت ہے۔

۲: بدعت اعتقادیہ ''یعنی: اعتقاد میں کوئی نئی بات بنظر تعبد پیدا کرنی، مثلاً: سائنس اور فلسفہ کے مسائل پر یقین کرنا کہ خدا اس سے خوش ہوتا ہے، یا نجات وغیرہ کا اس پر مدار ہے،

ورنہ یوں تو کوئی اقلیدس کے اشکال پر یقین لانے والے کو کیوں بدعتی کہنے لگا۔

۳: بدعت افعالیہ، یعنی: جوارح واعضاء سے بدعت کا ارتکاب۔

۴: بدعت اقوالیہ، یعنی: ایسی باتیں بنانی جن کو شریعت سے کوئی تعلق نہیں، اس کو بنظرِ تعبد ورضاءِ خدا بیان کرنا، جیسے قصّہ خوانی کو وہ وعظ جس میں ملائکہ رحمت جمع ہوتے ہیں قرار دینا وغیرہ۔

کرامات اولیاء

ان بلبلوں میں صرف اضطراب ہے، محض بے چینی ہے، جو بحر ہستی کے وسیع سطح پر انسانیت کی کج ٹوپیاں نکالے ہوئے تھرا رہے ہیں۔

تم سمجھو کہ میں اسے خوب سمجھ چکا ہوں۔

آغوش مادر کے گرداب میں جو ایک ہلکی ہلکی نازک سی چادر اوڑھے ہوئے ننھا سا ''حباب'' روتا ہے، بلبلاتا ہے، تو دیوانے سمجھتے ہیں کہ اسے دودھ کی چھینٹوں کی تلاش ہے، حالانکہ وہ اپنی بھوک مٹانا چاہتا ہے اور یہ بھی نہیں، وہ اس اذیت سے نجات کا طالب ہے، جو ریزش صفراء نے اس کی آنتوں کو پہنچائی ہے اور یہ بھی نہیں، وہ صرف ایک بھی چیز کو ڈھونڈھتا ہے، جسے ہر شخص ڈھونڈھتا ہے، مگر کوئی نہیں ڈھونڈھتا۔

صبح پو پھٹنے سے پہلے جو کندھے پر ہل کی لکڑیاں رکھ کر بیلوں کے پیچھے پیچھے دہقانی اپنی کشت زاروں کی طرف رواروی کے ساتھ بہتا ہوا جارہا ہے، سطحیوں نے خیال کیا کہ اسے ہل جوتنے کے شوق نے متحرک کیا ہے، حالانکہ اسے غلے کی ضرورت ہے اور اس کی بھی نہیں، بلکہ اپنے بال بچوں کی شکم پروری کی ضرورت ہے اور اس کی بھی نہیں، بلکہ ان کے بھوک مٹانے کی ضرورت ہے اور اس کی بھی نہیں، بلکہ بھوک کی تکلیف سے نجات پانے کی ضرورت ہے اور یہ بھی نہیں، بلکہ اسے صرف صرف ایک ہی چیز کی ضرورت ہے، جسے ہر شخص ڈھونڈھتا ہے، مگر کوئی نہیں ڈھونڈھتا۔

ایک وکیل جو شہروں کی تمام امواج عیش وسرور سے کنارہ کش ہو کر آٹھ بجے رات سے بارہ بجے تک چراغ کی تھپیروں کے آگے اپنے کو ڈالے ہوئے ہے، آنکھوں کو عینک کی کشتیوں پر سوار کر کے قانون نظائر کی سمندروں میں تیر رہا ہے۔ میں نے کئی احمقوں کو کہتے ہوئے سنا کہ انہوں نے اسے وکیل کی عادت قرار دی، حالانکہ اس کے دل سے پوچھو، مگر میں پوچھ چکا ہوں، وہ اپنے جگر پر پتھر باندھتا ہے۔ کس قدر بدعقلی ہے کہ لوگوں نے اس برگرویدگی مطالعہ کا اتہام جوڑا، حالانکہ وہ اس کا دشمن ہے، مگر کرتا ہے کہ ایسے روپے کی تمنا

ہے اور یہ بھی نہیں، بلکہ اپنی حیثیت اور ابرو کی بقاء کی تمنا ہے اور اس کی بھی نہیں، اسے بھی صرف صرف ایک ہی چیز کی ضرورت ہے، جسے ہر شخص ڈھونڈھتا ہے، مگر کوئی نہیں ڈھونڈھتا۔

وہ جو صبح کی نماز کے متصل ہی وظیفہ سے پہلے اپنے مطب کی گودی پر آ کر لہراتا ہوا کبھی نجس قاروروں سے آنکھوں کی شعاؤں کو ملوث کرتا، زرد زرد، سوکھے روکھے چمڑوں، چرم، استخوانوں کے گھناؤنے جسموں پر اپنی نرم خوبصورت انگلیوں کو ڈالتا ہے۔ کس نے کہا کہ اس کی طبیعت کا یہ فطری تقاضا ہے، حالانکہ وہ کتنی دفعہ اس بیزاری کا اظہار کر چکا ہے، غلط ہے جس نے ایسا سمجھا، بلکہ اسے فیس کی ضرورت ہے اور اس کی بھی نہیں، بلکہ اپنے اہل وعیال کی پرورش کی ضرورت ہے اور اس کی بھی نہیں، بلکہ اسے بھی صرف صرف ایک ہی چیز کی ضرورت ہے، جسے ہر شخص ڈھونڈھتا ہے، مگر کوئی نہیں ڈھونڈھتا۔

اور قلزم امکان کے ان چھوٹے چھوٹے ہلکے پھلکے، حبابوں پر کیا موقوف، اسی سمندر کا سب سے جسیم، طویل وعریض بلبلا جس کے طرۂ دستار میں سلطنت و بادشاہت کے موتی ٹکے ہوئے ہیں، وہ بھی اپنی مسہریوں کے ابروانی پردوں کے محیط میں اسی لئے کروٹیں بدل بدل کر کشور حدوث میں جنبش پیدا کر رہا ہے، ایک خیال ہے جو کہا گیا کہ اسے ملک کی پروا ہے۔

نہیں، بلکہ رعایا کی امن وآسائش کی فکر ہے اور یہ بھی نہیں، بلکہ اسے بھی صرف ایک چیز کی ضرورت ہے، جسے ہر شخص ڈھونڈھتا ہے، مگر کوئی نہیں ڈھونڈھتا۔

اخیر یہ بچوں کی شور وغوغا پر کیا بہتان نہیں کہ اسے شیر مادر کی جستجو ہے کہ آنکھوں والوں نے اس میں سکون واطمینان کی تلاش کا نظارہ کیا ہے، وہ فقط اپنی روح میں چین پیدا کرنا چاہتا ہے، وہ طمانیتِ دل کے لئے تڑپ رہا ہے، مگر بیکار تڑپ رہا ہے کہ ماں صرف دودھ دے سکتی ہے، مگر ہضم اس کے اختیار میں نہیں، اس کے پھوڑے پھنسیوں کی آمد کو وہ روک نہیں سکتی۔

کیا دہقانی کاوشوں پر یہ سراسر الزام نہیں کہ وہ غلوں کے مہوسانہ دام ہیں، حالانکہ کسان فقط ان سے فراغبالی کو جذب کرنا چاہتا ہے، اور نہیں کر سکتا کہ بادلوں پر اسے اقتدار

نہیں، ٹڈیوں کے دلاس کی زیر حکومت نہیں، ٹھنڈا اور پالے اس کے زیرِ فرمان نہیں، پھر کیا اس وکیل پر یہ ایک گستاخانہ جملہ نہیں کہ وہ شگون، ومحستنانہ کے چند ذلیل سکوں کے لیے با ابرو دپوزیشن کے لیے وقفِ مطالعہ ومحوِ کتابت ہے، حالانکہ جسم پر نہیں، اس کے دل پر نظر ڈالو کہ احباب واقران، ہم چشم معاصرین کے سنگہائے تحقیر وملامت کے خوف سے وہ کانپ رہا ہے، آہ! کہ وہ مسکین وکیل اس کی لرزش کو تھامنا چاہتا ہے، مگر نہیں تھام سکتا کہ موکلوں کے دل اس کی انگلیوں کے درمیان نہیں، ججوں اور مجسٹریٹوں کے قلم اس کے قبضے میں نہیں اور نہ صرف یہی، بلکہ اپنے دماغ پر بھی بھروسہ نہیں، زبان پر بھی اعتبار نہیں۔

پھر کیا اسی طرح اس غریب طبیب کے شریف پیشہ پر یہ ایک کور بختانہ سفیہانہ چوٹ نہیں، نہ کہ قارورہ بینی نبض شناسی کی علہ، صرف عطار خانے کی فروغ دہی ہے، حالانکہ اس کی گھر میں جا کر اندازہ لگاؤ کہ کس طرح اس کے بچے اور بیوی نے اس کے دل کو تردد و افکار کے تیروں سے چھلنی کر دیا ہے، وہ صرف ان پر جمیعت خاطر کا مرہم لگانا چاہتا ہے، مگر نہیں لگا سکتا کہ اس کے حافظہ میں فقط دواؤں کی تاثیرات بند ہیں، پر صحت کی کنجی اس کے پاس نہیں اور ہو بھی، تو وہ اپنے ہم پیشوں کو اپنے شہر میں آنے سے نہیں روک سکتا۔

اور جبکہ ایسا ہے تو کیا بادشاہوں کی فکر ہائے نیم شبی پر یہ نا قابل عفو الزام نہیں کہ اس کی تمام تڑپ و بے چینی مٹی کے چند تودوں کی نگہبانی کے ساتھ وابستہ کی جاتی ہے، حالانکہ تم اس کی ممالک محروسہ کی چاردیواریوں کی روزنوں میں جھانک کر دیکھو کہ ہم عصر سلطنتوں کی خونخوار وغاصب آنکھوں نے اس کے اقلیم دل میں ہلچل ڈال رکھی ہے، وہ صرف اس خطرہ سے مطمئن ہونا چاہتا ہے، مگر نہیں ہوسکتا کہ دست بازو کی قوتوں کی وہ خالق نہیں، زمین کی روئیدگی اس کی مطیع نہیں۔ بالفرض ہوں بھی، تو قسمت کی باگ تو اس کی پنجۂ اقتدار میں نہیں۔

حبابستان امکانی کا یہی عبرت انگیز اضطراب پاش تماشا تھا، جس کی نہ ختم ہونے والی رستخیزیوں پر ان ''سعیکم لشتیٰ'' کی قدوسی آواز نے متنبہ کی۔

پھر کچھ لوگ تھے، جنہوں نے اس کے بعد وہ سب کچھ سمجھ لیا، جس کے بعد فنا آباد کی کوئی چیز کچھ نہیں سمجھی جاتی اور یکا یک ایک غیبی آواز

﴿ففروا الی الله انی لکم منه نذیر مبین﴾

''بھا گو طرف اللہ کہ میں اس سے کھلا ڈرانے والا ہوں''۔

کی آئی، جس کے بعد ان کے بستر سے بندھ گئے، اسباب لد گئے، چلنے والے بھاگے گرتے پڑتے، اٹھتے بیٹھے، گاؤں اور قصبوں کو چھوڑتے ہوئے، بڑے بڑے شہروں کو پاس کرتے ہوئے، ہانپتے کانپتے آخر وہ ایک بڑی سرائے میں جا کر اتر گئے، جس کے دروازہ کے طاق پر کندہ تھا۔

﴿الا بذکر الله تطمئن القلوب﴾

''خدا کی یاد سے دل کو چین ملتا ہے''۔

انہیں سیدھے سادے، اجنبی لوگوں کا نام اولیاء اللہ ہے، جو ہنگامہ ہستی سے دور ہو کر جسمانی نہیں، بلکہ روحانی سفر کرنے میں مصروف ہیں، بے اطمینانی سے بھاگے تھے، مگر جہاں جا کر طمانیت ملتی ہے، وہاں پھر کچھ نہیں ملتا، انسانوں کی آبادیوں کا پھر وہاں پتہ بھی نہیں چلتا۔ اگر ملتا ہے، تو صرف خدا اور ایک خدا جس کے علاوہ اور کچھ نظر نہیں آتا، آخر وہیں کمر کھولدیتے ہیں اور جو نظر آتا ہے، اس کے مہمان بن جاتے ہیں۔

اور جبکہ انسانوں کے یہاں کوئی مہمان آتا ہے، تو باوجود یکہ ان میں غریب بھی ہیں سخت دل بھی ہیں، سبھی کچھ ہیں، لیکن خدا نے حکم دیا کہ ان کی اکرام و تعظیم کرو، انہیں آرام پہنچاؤ، تو پھر وہ جو غریب نہیں، ملک ہے، جو بخیل نہیں، کریم ہے، جو سخت نہیں، رؤف ہے، پھر کس طرح ممکن تھا کہ اس کی سرائے میں ٹھہرنے والے مہمانوں کی تکریم نہیں کی جاتی، یقیناً کی گئی اور آئے دن ایسے مسافروں کی ہمیشہ کی جاتی ہے اور اسی کا نام ''کرامت'' ہے، گویا خدا اپنے مہمانوں کو ان چیزوں سے سنوارتا اور ان کی تکریم کرتا ہے، جسے ہم تم ''کرامت'' کہتے ہیں۔

حضرت شیخ محی الدین عربی قدس سرہ کی نزدیک کرامت کی بھی تعریف ہے اور یہی وجہ تسمیہ بھی ہے، اس کے بعد ارقام فرماتے ہیں کہ:

ہمارے نزدیک کرامت کی دو قسمیں ہیں: ا۔حسیہ　۲۔معنویہ

صوفی کے وہ تصرفات جو دوسروں کو محسوس ہوتے ہیں، یعنی اپنے اندر نہیں، بلکہ اپنی

باہر کی ہستیوں پر جو اثر ڈالتا ہے، کبھی دلوں کے خطرات بتا دیتا ہے، کبھی وہ ہوا پر اڑتا ہے، کبھی پانی پر چلتا ہے، کبھی بڑی مسافت کو چند دنوں میں طے کر لیتا ہے، لوگوں کی نگاہوں پر پردہ ڈال کر اپنے کو غائب کر لیتا ہے، بلکہ اسی طرح وہ بھی جس کی دعا فوراً قبول ہو جاتی ہے، میں ان چیزوں کو ''کرامات حسیہ'' قرار دیتا ہوں۔

اور صوفی کے وہ تصرفات جو خود اپنے اندر کرتا ہے، مثلاً: وہ شریعت کی فرائض وسنن سے گذر کر آداب کی رعایت ونگہداشت کرنے پر قادر ہو جاتے ہیں، اس میں اچھی اخلاق، عمدہ خصائل پیدا ہو جائیں، وہ ہر ایک قسم کی بری باتوں سے پرہیز کرنے پر مجبور ہو، وہ ہر حکم شرعی کو عین اس وقت ادا کرنے کے لیے اپنے کو تیار کر سکتا ہو، جو خاص اس کا وقت ہے، نیکیوں کے گزرنے میں ہمیشہ سبقت کرنے کا عادی ہو گیا ہو۔

وہ اپنے دل سے ہر کسی کے کینے کو نکال پھینک سکتا ہو، حسد، یا کسی کی جانب سے برے خیالات اولاً اس میں آتے ہی نہیں اور آئیں تو اس کے ازالہ کی قوت اس میں موجود ہو۔

الغرض سب سے بڑی کرامت یہی ہے کہ دل سے تمام بری صفات چن چن کر الگ ہو گئے ہوں، خدا کے حقوق، یا دوسروں کے حقوق جو اس کے ذمہ عائد ہوتے ہوں، ان کے ادا کرنے میں اسے دقت محسوس نہ ہوتی ہو، وہ اپنے دل کو ہر وقت ٹٹولتا رہے کہ اس میں خدا کی جانب سے کیا کیا آثار ودیعت کیے گئے ہیں، اخیر میں یہ کہ اس کی جو سانس نکلتی ہو، اس وقت بھی وہ اپنے مالک کے آگے ادب کے ساتھ اپنے کو حاضر سمجھے اور جب سانس اندر آئے، تو اس وقت بھی حضور کی خلعت اس کے دل پر موجود ہو۔

میں اسے کرامات معنویہ سمجھتا ہوں، جو عوام کے نزدیک اگرچہ کچھ نہیں ہیں، لیکن خواص سے پوچھو کہ سب کچھ یہی ہیں۔ میں اسکا منکر نہیں کہ حسی کرامات کرامات نہیں اور وہ خدا کی سرائے میں ٹھہرنے والی مہمانوں کی تکریم کو نہیں بتاتی؟

نہیں میں اسے کرامت مانتا ہوں، لیکن حسرت ہوتی ہے، جب کہ جوگیوں، بازیگروں کو بھی ان اعمال پر قادر دیکھتا ہوں، بے شک سبب کے اعتبار سے دونوں میں فرق ہے کہ صوفیاء وہ چیزیں سب ان کی مہمان نوازی کی صادر ہوتی ہیں اور جوگیوں وغیرہ سے اس لیے کہ نفسانی طاقتوں کی پرورش کے بعد انسان ایسے اعمال وافعال بخوبی انجام دے سکتا

ہے، مگر پھر بھی مجھے ان کرامتوں کے متعلق ہمیشہ ایک دغدغہ لگا رہتا ہے کہ بالفرض جن تصریفات کا ظہور ہم سے ہوا، وہ خداوند تعالیٰ کے اکرام کے نتائج ہوں۔

تاہم دل کی باتوں کا بتادینا، یا ہوا میں اڑنا وغیرہ یہ کوئی نہ سنت ہیں اور نہ فرض، نہ پھر ممکن ہے کہ خداوند تعالیٰ ہمارے تمام مجاہدات اور صعوبات سلوک کا اسے بدلہ قرار دیں اور محاسبہ کر کے کہیں ہمیں خالی داماں نہ بنا دیا جائے، بخلاف کرامات معنویہ کے کہ اس میں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس کو استدراج وشعبدہ وغیرہ سے کوئی اشتباہ نہیں، یہ ممکن ہے کہ ایک جوگی ہوا فراٹے بھرتا ہوا تیرتا پھرے، لیکن یہ مشکل ہے کہ وہ اپنے دل سے کینہ و بغض کو نکال کر پھینک دے۔ یہ بہت آسان ہے کہ کوئی آدمی دریا پر پیادہ پا روانہ، ہو لیکن یہ بہت مشکل ہے کہ وہ پانچوں وقت کی نماز مع طہارت جسم و جامہ اور حضور قلب روزانہ ادا کرنے پر قادر ہو۔

اور یہ بالکل ظاہر ہے، اس لیے کہ استدراج میں خداوند تعالیٰ محض شریروں کی رسی دراز کرتا ہے، انہیں ڈھیل دیتا ہے حالانکہ وہ اس کے لئے شریک کرتے ہیں، وہ قبروں پر جا کر خدا سے نہیں، بلکہ خدا کی مخلوق سے براہ راست حاجت طلب کرتے ہیں، پھر بھی وہ بسا اوقات دل کے خطرات بتا دیتے ہیں، اکثر موقعوں پر ان کی دعائیں پوری ہو جاتیں ہیں۔

اس صورت میں ان خرق عادات کو اگر استدراج نہ کہا جائے، تو اور کیا کہا جائے...؟

لیکن ایک شخص ہے جس کا دل بغض و کینہ سے پاک ہو گیا ہے، وہ نمازوں کا تمام شرائط کے ساتھ پابند ہے۔ اس میں عمدہ اخلاق پیدا ہو گئے، تو یہ چیزیں کیونکر استدارج کا آلہ بن سکتی ہیں کہ یہ خدا کے مقرر کردہ حدود ہیں اور اسی کے بتائے ہوئے راستے ہیں، پھر ناممکن ہے کہ ان راستوں پر خداوند تعالیٰ ہی کسی کو استدارج و تمھیل کے اندر مبتلا فرمائے، بخلاف کرامات حسیہ کے کہ وہ خداوند تعالیٰ کے مقرر فرمودہ راستے نہیں ہیں، پس جو شخص اس پر چل رہا ہے، وہ خطرات ومہالک سے کیونکر مامون رہ سکتا ہے۔ الغرض کرامات معنویہ ہی وہ چیزیں ہیں کہ جس پر انسان بے خوف وخطر چل سکتا ہے۔ اس کو اس راہ میں بجز ایک چیز کے، یعنی غرور تکبر کے اور کسی چیز کا ڈر نہیں، لیکن اگر علم پاس ہے، تو فوراً وہ علم تنبیہ کریگا کہ بندہ کچھ نہیں کر سکتا، جو کچھ ہے، خدا کی جانب سے ہے اور اسی مقام سے تکبر کی

دیوار بھی گر سکتی ہے۔

بلکہ میرا خیال تو ایسا ہے کہ حتی الوسع کراماتِ حسیہ کا صدور نہیں ہونا چاہئے اور کبھی اتفاق سے سرزد ہو گئے، تو خداوند تعالیٰ کی طرف الحاج کے ساتھ رجوع کرنا چاہئے اور دعا کرنی چاہئے کہ عوام کے نزدیک اس کرامت کا کوئی ظاہری اور مادی سبب نکل آئے، تا کہ میں استدارج، یا اس خطرہ سے کہ میری عبادتوں کا یہی تو بدلہ نہیں مامون ومصون ہو جاؤں۔

اور میں تمام کراماتِ معنویہ میں سے خاص کر خداوند تعالیٰ کے اس اکرام کو جو اپنے مہمانوں کو علم کی صورت میں دیتا ہے، بہتر سمجھتا ہوں، جس کے بعد انسان پر اپنے مالک کے انعام واحسانات کی تفصیل اس کی صفاتِ کمال کی حقیقت کھل جاتی ہے، وہ آخرت کے واقعات کا مشاہدہ کرنے لگتا ہے، وہ سمجھ جاتا ہے کہ میں کس لئے پیدا کیا گیا ہوں اور مجھے کس کام کے واسطے بنایا گیا ہے اور یہی علم دراصل سبب بن جاتا ہے ان تمام اصلاحات باطنیہ وظاہریہ کے لئے، جن کو میں پہلے کراماتِ حسیہ معنویہ قرار دے چکا ہوں۔ وہ شخص جس سے کراماتِ حسیہ سرزد ہوتے ہیں اور ساتھ ہی اس کے وہ نماز نہیں پڑھتا، روزے نہیں رکھتا، تمام بری باتوں میں مبتلا ہے، وہ خدا کا یقیناً مہمان نہیں کہ وہاں کے مہمانوں کی توقیر سب سے پہلے علم باللہ اور علم بالآخرۃ سے کی جاتی ہے اور پھر کھولا جاتا ہے کہ اس کی ہستی کی غائت کیا ہے، تو چونکہ یہ مدعی وہاں گیا ہی نہیں اور محض غلط لوگوں میں اپنے کو مسافر مشہور کر رکھا ہے، اس لیے وہ حدودِ شرعیہ پر چل ہی نہیں سکتا، ان کی رعایت ہو نہیں سکتی اور جو اس کی رعایت جس درجہ کرتا ہے یاد رکھو کہ وہ خدا سے اس قدر زیادہ قریب ہے کہ قریب کے موافق علم عطا ہوتا ہے اور علم کے موفق اعمال، اقوال ونیات کی درستگی ہوتی ہے۔

بایزید بسطامی رحمۃ اللہ تعالی علیہ سے کسی نے پوچھا کہ جوطی الارض (یعنی: چند دن میں پوری زمین طے کر لیتا ہے) کرتا ہے، اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے، بولے کہ کچھ نہیں، اس کا مرتبہ کچھ نہیں، شیطان بھی اس پر قادر ہے اور ایسا کرتا ہے، حالانکہ خدا کے یہاں اس کیا مرتبہ ہے؟ پھر کسی نے پوچھا اور جو ہوا میں اڑتا ہے، تو کیا وہ بھی کچھ نہیں، تو فرمایا کہ ہوا پر تو پرندے بھی اڑتے پھرتے ہیں، پھر یہ کیسی بیوقوفی ہے کہ اللہ تعالی انسان کی تکریم کرتے ہیں اور جس چیز سے تکریم کی جاتی ہے، وہ ایسی چیز ہے کہ کوّا اور چیل کی بھی

اس میں عزت نہیں، وہ بھی اسے اپنی معمولی عادت قرار دیتے ہیں۔

اسی طرح جن جن چیزوں کے متعلق جو عام طور پر کرامت مشہور ہیں، لوگوں نے ان سے پوچھا، سبھی کے متعلق اسی قسم کے جواب دیتے رہے اور اخیر میں ہاتھ اٹھا کر فرماتے تھے:

''میرے معبود! ایک قوم ہے جس نے تجھ کو صرف اس لیے ڈھونڈھا کہ انہیں وہ مل جائے، جس کا وہ ذکر کر رہے ہیں، تو تو نے ان کو اسی مشغلہ میں پھنسا دیا اور اسی کے اندر وہ ڈوب گئے، غافل ہو گئے، پس اے پروردگار! اگر مجھے بھی تو کسی چیز کے ساتھ غافل بنانا چاہتا ہے، تو اپنی کسی سر اور بھید، یعنی: اپنی صفات وتعلقات کے ذریعے سے غافل بنا''۔

تو دیکھو! ایسے جلیل القدر ولی مسلم رضی اللہ تعالی عنہ کی بھی یہی دعا ہے کہ کرامات حسیہ تو ہم سے سرزد ہی نہ ہوں اور اگر کرامات ہوں بھی، تو معنویہ جس میں ان کو طلب صرف علم کی ہے کہ وہی تمام کرامتوں پر غالب ہے اور سب اسکے ثمرات ہیں۔

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا نے اپنے دربار سے جس چیز کے مانگنے کا حکم دیا تھا، وہ بھی یہی تھا:

''وقل رب زدنی علما''۔

''کہہ اے محمد! اے پروردگار! میرے علم میں زیادتی فرما''۔

حضرت ابو یزید رضی اللہ تعالی نے بالکل صحیح فرمایا کہ پانی پر چلنا، ہوا میں اڑنا، انسان کے لیے کرامت نہیں، کیونکہ یہاں اکرام کرنے والا خدا ہے، جو اکرم الاکرمین ہے اور جس کی تکریم کی جاتی ہے، وہ انسان مکرّم ہے، جو اپنی نوعی فضیلت کے اعتبار سے تمام عالم پر شرف رکھتا ہے، پھر جہاں ایسا مہمان ہو اور ویسا میزبان، تو ایسے موقعہ پر ہوا وغیرہ میں اڑنے کا ذکر کرنا کسی طرح مناسب نہیں، بلکہ دیکھنا یہ چاہیئے کہ اس وقت جبکہ مہمانوں میں بھی سب سے اشرف ترین مہمان ہے اور میزبان بھی اکرم الاکرمین ہے، کرامت لینے کی صلاحیت کس چیز میں ہے، ظاہر ہے کہ خداوند عزاسمہ کے تمام انعامات وافضال، جود، بخششوں میں سب سے بہترین چیز رحمت ہے کہ اسی رحمت کی بناء پر موجودات اپنی ہستیوں کو برقرار دیکھتے ہیں، وہ ہر ایک چیز کو محیط اور سب کو شامل ہے۔ اب ہم قرآن مجید میں دیکھتے ہیں کہ خداوند تعالی حضرت

خضر علیہ السلام کے متعلق ارشاد فرماتا ہے:

"اتینا رحمة من عندنا و علمناه من لدنا علما".

"میں نے رحمت اپنے نزدیک سے اس کو دیا اور سکھایا علم اپنے پاس سے"۔

صفت رحمت کے قرب کو "عند" کے لفظ سے تعبیر کیا، جو اقرب اور قریب دونوں کے لیے عام ہے، بخلاف "لدن" کے وہ محض اقرب پر بولا جاتا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صفت رحمت وصف علم پر متفرع ہے اور علم ہی رحمت کا معدن اور سرچشمہ ہے، پس اس موقعہ پر جہاں خدا میزبان اور انسان مہمان ہوتا ہے، مناسب ہے کہ وہ علم ہی کے ذریعے سے نوازا جائے کہ یہی تمام انعامات میں بہترین انعام ہے، فقط۔ (ماہنامہ القاسم دیوبند)

تعلیمات غزالیؒ کے انقلابی اثرات

حجۃ الاسلام امام غزالیؒ نے "احیاء العلوم" وغیرہ کی تصنیف سے آخرت طلبی کا جو صور پھنکا تھا اور جس بری طرح عالم اسلامی کو اس کے اندرونی اضمحلال کے خلاف جھنجھوڑا تھا، اس کے کیا اثرات ہوئے؟ مولانا گیلانیؒ نے تاریخ کی روشنی میں ان اثرات کی جستجو کی ہے اور سب سے پہلے ایوانِ خلافت و وزارت پر نگاہ ڈالی ہے کہ یہاں کے نقشے میں بھی امام کی اس چیخ و پکار کے بعد کوئی تغیر نظر آتا ہے، یا نہیں؟

مولانا فرماتے ہیں کہ دیکھو ۴۵۰ھ جو امام کا سن ولادت اور خلیفہ مقتدر باللہ العباسی کا دور خلافت ہے، اس میں شاہانہ کر و فر اور اظہار شان و ثروت کا یہ عالم تھا کہ قسطنطنیہ سے رومیوں کی جو سفارت قیدیوں کے تبادلے اور صلح کی گفتگو کے لیے بغداد آئی تھے، مقتدر باللہ سے ملنے کے لیے جب اس کے ارکان دار الخلافۃ کی طرف روانہ ہوئے تو

> پہلے اس حاجب (عرض بیگی) کے محل کے سامنے پہنچے، جس کا نام "قصر القشوری" تھا، حاجب کے محل کی شان و شوکت دیکھ کر سفراء کچھ اس درجہ مبہوت ہوئے کہ اسی محل کو انھوں نے سمجھا کہ خلیفہ کا مکان ہے، ان کی غلطی فہمی کا ازالہ کیا گیا، وہ آگے بڑھے، سامنے وزیر کا قصر نظر آیا، ان کو پھر یہی خیال ہوا کہ وہ نہیں، تو ضرور یہی خلیفہ کا مستقر ہے، مگر کہا گیا کہ یہ وزیر کا گھر ہے، وہ آگے روانہ ہوئے، ان لوگوں کو

اس طریقے سے دارالخلافہ میں داخل کیا گیا کہ چاروں طرف پہلے وہ گھوم لیں، حالت یہ تھی کہ دارالخلافۃ کے اطراف و جوانب اس کے مختلف ابواب اور مقامات پر ۳۸ ہزار پردے پڑے ہوئے تھے، جن میں بارہ ہزار پانچ سو پردے تو خالص مزاکش، دیبا اور حریر کے تھے، درمیان میں جو فرش فروش بچھائے گئے تھے، ان کی تعداد بائیس ہزار تھی، دارالخلافۃ کے احاطہ میں (جو خود ایک مستقل دنیا کی حیثیت رکھتا تھا) مختلف مقامات میں جنگلی جانورں کی قطاریں بکھری ہوئی تھیں، جو لوگوں سے مانوس تھے، مختلف قسم کے درندے (شیر، بھیڑیا، وغیرہ) بھی زنجیروں میں بندھے ہوئے اپنے اپنے نگہبانوں کے ساتھ کھڑے تھے۔

سفارت والوں کو پھر اس کوٹھی میں لے جایا گیا، جس کا نام ''دارالشجر ہ'' (درخت والا محل) تھا، اس کے احاطہ میں ایک طویل وعریض تالاب تھا، جس میں صاف و شفاف پانی ہر وقت چھلکتا رہتا تھا، تالاب کے وسط میں ایک چبوترے پر ایک درخت تھا، یہ مصنوعی درخت تھا، جس میں بڑی بڑی بارہ ڈالیاں اور ہر ڈالی میں بے شمار شاخیں اور ٹہنیاں تھیں، ان شاخوں پر مختلف قسم کے پرندے اور چڑیاں طلاء اور نقرہ (سونے اور چاندی) سے ڈھال کر بنائی گئی تھیں اور یہی حال اس درخت کی شاخوں اور ٹہنیوں کا تھا، یعنی: ان میں بعض سونے سے بنائی گئی تھیں اور بعض چاندی سے۔

''دارالشجر ہ'' کے بعد سفیروں کو اس محل میں لوگوں نے پہنچایا، جس کا نام ''الفردوس'' تھا، اس قصر میں فرش فروش اور ظروف و آلات کی جو کثرت تھی، ان کا شمار مشکل ہے، صرف اس کی دہلیزوں پر طلائی کڑیوں سے بنی ہوئی دس ہزار زرہیں لٹک رہی تھی، اس کے بعد آبنوسی جڑاؤ تخت پر سفراء نے مقدر باللہ کو جلوہ افروز پایا، جس پر زریں جھالروں کی کارچوبی مخملی مسند پڑی ہوئی تھی، تخت کے داہنی جانب اور بائیں جانب بھی خاص سلیقہ سے مختلف جواہر کے بنے ہوئے جالے کے نو نو عدد لٹکے ہوئے تھے، جن کی جگمگاہٹ سے آنکھیں خیرہ ہوتی تھیں، دن کی روشنی کو بھی ان کی روشنی مات کر رہی تھی۔

انقلاب

لیکن اسی مسند خلافت پر امام غزالیؒ کی وفات کے پچیسویں سال المقتفی باللہ کا لقب اختیار کر کے جو شخص آتا ہے، اس کے متعلق تاریخ بتاتی ہے کہ اس نے آتے ہی دارالخلافۃ کا نقشہ یوں بدل دیا کہ:

"دارالخلافہ بغداد کا اپنے سارے فرش وفروش، خیمہ وخرگاہ، پردے وسراپردے، دو اب چوپائے اور دوسرے جانورں سے بالکلیہ تخلیہ ہوگیا، صرف چار گھوڑے اور دارالخلافت میں پانی پہچانے کے لئے کل آٹھ خچر اصطبل میں باقی تھے"۔

"خلفیہ منتخب ہونے سے پہلے اس کا زیادہ وقت دینی مشاغل میں صرف ہوتا تھا، دینی علوم کی کتابیں لکھتا رہتا تھا، یا قرآن کی تلاوت کرتا رہتا تھا، پھر جب خلیفہ منتخب ہوا، تو زہد وعبادت وتقویٰ وطہارت کی خصوصیتوں میں اس کے کسی قسم کی کمی نہ ہوئی، عدل وانصاف کے چمن میں پھر بہار اس کے عہد میں آئی، نیکی کے ابواب پھر کھل پڑے"۔

اسی کے ساتھ ساتھ مقتفی کے زمانہ میں بغداد اور عراق پھر خلیفہ کے قبضہ اقتدار میں واپس ہوا، ورنہ مقتدر باللہ کے زمانہ سے صورت حال یہ ہوگئی تھی کہ خلیفہ کا صرف نام تھا اور حکومت ان سلاطین اور ملوک کی قائم تھی، جنہوں نے جبراً خلیفہ کو اپنا تابعِ فرمان بنالیا تھا۔

مولانا گیلانی فرماتے ہیں: اور بات صرف مقتفی ہی کی حد تک اگر محدود ہوتی، تو استثناء اور شذوذ کے دعوے کی گنجائش بھی پیدا ہوسکتی تھی (مگر) واقعہ یہ ہے کہ امام غزالیؒ کے بعد پے درپے پچاس ساٹھ برس کا زمانہ بغداد کی خلافت پر ایسا گزرا ہے کہ اسی خلافت کی گدی پر بیٹھنے والوں کے پہلو کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ ان پچھلوں میں غیر معمولی انقلابی رنگ کیسے پیدا ہوگیا تھا، مقتفی کا حال تو آپ پڑھ ہی چکے ہیں، مقتفی کے بعد اسی کا بیٹا یوسف، مستنجد باللہ کے نام سے تخت خلافت پر امام غزالیؒ کی وفات کے ٹھیک پچاس سال بعد متمکن ہوا۔ سیوطی نے تاریخ

الخلفاء میں لکھا ہے:

"مستجد عدل اور نرم مزاجی کی خصوصیتوں سے موصوف تھا، سارے عراق سے ناجائز محصولوں کو اس نے اٹھا دیا تھا"۔

اور ابن اثیر کا فیصلہ تو اسی مستنجد کے متعلق یہ ہے کہ:

"كان احسن الخلفاء سيرة مع الرعية".

(ص: ۱۳۵، ج: ۱۱)

"عباسی خلفاء میں رعیت کے ساتھ بہترین سلوک کرنے میں مستنجد بہت اچھا خلیفہ تھا"۔

مستنجد کے بعد اس کا بیٹا حسن المستضی باللہ کے نام سے سر پر آرائے خلافت ہوا، اس سے بڑھ کر المستضی کے متعلق شہادت اور کیا ہو سکتی ہے کہ ابن جوزی جیسے بگڑے دل آدمی جو دوسروں پر جرح وتنقید کرنے میں تاریخی شہرت کے مالک ہیں، بخاری تک کے راۃ پر نکتہ چینی سے ابن جوزی نہیں چوکتے، مستضی کو انہوں نے خود دیکھا تھا اور بہت قریب سے دیکھا تھا، ان کی مجلس وعظ میں اکثر شریک بھی ہوتا تھا، بہر حال منتظم میں اپنی چشم دید گواہی ابن جوزی ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں:

"اظهر من العدل والكرم مالم نره فى اعمارنا".

(ص: ۲۵۰، ج: ٤)

"عدل وکرم کا اظہار المستضئ نے جس پیمانے پر کیا، ہم لوگوں نے ساری زندگی میں اس کی نظیر نہیں دیکھی"۔

ابن اثیر نے (اسی کا حال لکھتے ہوئے) آخر میں مشہور عربی فقرہ (لکھا ہے)

"فعاش حميداً ومات سعيداً رضى الله عنه".

(ص: ۱۷۳، ج: ۱۱)

"پس بڑی ہر دلعزیزی کے ساتھ اس نے زندگی بھی گزاری اور وفات بھی اسکی سعادت کے حالات کیساتھ ہوئی"۔

ایک عربی شعر بھی ابن اثیر نے مستضی کے ذکر کو ختم کرتے ہوئے درج کیا ہے:

کان ایامہ من حسن سیرتہ مواسم الحج والاعیاد والجمع

یعنی: اپنی سیرت وکردار سے مستضی نے ایک ایسا حال پیدا کردیا تھا کہ اس کی حکومت کا زمانہ گویا حج، عید اور جمعہ کے دن تھے، یعنی: ہر روز روزِ عید اور ہر شب شبِ برات کی کیفیت تھی۔

حالانکہ یہی بغداد تھا، ذرا غزالیؒ سے پہلے، بلکہ خود ان کے عہد کے حالات کتابوں میں پڑھیے، عیاروں اور طراروں، لصوص، یعنی: چوروں اور بٹ ماروں کے دھاوے صبح و شام ہوتے رہتے تھے، دینی اور آئینی زندگی سے گریز کا رجحان روز بروز عباسی خلفاء میں بڑھتا چلا جارہا تھا، یہ اس کا لازمی نتیجہ تھا، جیسا کہ میں نے لکھا بھی ہے، اور لوگوں کو معلوم بھی ہے کہ ممالک عباسیہ کے مختلف جہات واقطار میں ملوک وسلاطین کے زور آور بننے میں خلفاء کی ان ہی کمزوریوں نے امداد بہم پہنچائی تھی۔

کیا یہ انقلاب بے سبب تھا

لیکن اچانک غزالیؒ کے بعد ذمہ داری کا یہ احساس ان ہی خلفاء میں کیسے بیدار ہوگیا اور امن وامان کا جو قصہ بغداد کی سرزمین کے لیے افسانہ بن چکا تھا، اسی بغداد کو عید کے دنوں اور شب برات کی ان راتوں میں سانس لینے کا موقع جو ملا، تو لوگوں نے اس انقلاب کے سبب کو کیوں نہ تلاش کیا؟

سچی بات تو یہ ہے کہ یہی ملوک وسلاطین جن کو عباسی خلفاء کی کمزوریوں نے زور حاصل کرنے کا موقع عطا کیا تھا، خود ان کی حالت بھی غزالی کے بعد اور غزالی سے پہلے اتنی مختلف ہوگئی ہے کہ اسی اختلاف کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔

> ان ملوک وسلاطین کی حالت پہلے سے کس درجہ مختلف ہوگئی تھی، اس کا اندازہ کرانے کے لیے مولانا نے پچھلی تاریخ کے کچھ ورق الٹے ہیں، جن میں اسراف و فضول خرچی اور عشرت پسندی کے وہ نمونے نظر آتے ہیں کہ شاید تخیل کی رسائی بھی ان واقعات سے آگے ہونی مشکل ہے، اس کے مقابلہ میں مولانا کہتے ہیں کہ ذرا غزالی کے ۲۶ سال بعد دیکھو، اسی بغدادی خلافت کا ایک متوسل سلطان نورالدین

زنگی کے نام سے نظر آتا ہے،طویل وعریض زرخیز علاقے اس کے زیرِ نگین ہیں، شوکت کا یہ عالم ہے کہ حرمین اور یمن تک میں اس کا نام خلیفہ کے نام کے ساتھ خطبوں میں پڑھا جاتا ہے،لیکن زندگی کا ڈھنگ یہ ہے کہ:

''شام کے شہر حمص میں تین دوکانیں تھیں (جنہیں نورالدین زنگی نے مال غنیمت کے حصے سے خریدا تھا) ان ہی تینوں دوکانوں کے کرایہ کی آمدنی ملکہ کے لیے نورالدین نے مختص کردی تھی،سالانہ کل بیس دینار اس ذریعہ سے ملکہ کو ملتے تھے''۔(ابن اثیر)

ملکہ نے نورالدین سے تنگی کی شکایت کرتے ہوئے اس مشاہرے میں اضافہ چاہا،جواب میں نورالدین نے کہا:

''میرے پاس اسکے سوا کچھ نہیں ہے،باقی میرے قبضہ میں حکومت کی جو آمدنی ہے،سو اس میں مسلمانوں کا میں صرف خزانچی ہوں،میں اس مال میں خیانت کر کے جہنم کی آگ میں تمہارے لئے گھس نہیں سکتا''۔

اس وسیع وعریض سلطنت کے مالک سلطان نے اپنی پوری آخری بیماری اس چھوٹی سی کوٹھری میں گزاردی،جس میں وہ عبادت کے لیے خلوت اختیار کیا کرتا تھا اور بالآخر اسی میں جان جانِ آفرین کے سپرد کردی۔

مولانا فرماتے ہیں:

''اور ایک نورالدین ہی کیا،اسی کا شاہزادہ اسماعیل جو باپ کے بعد حلب کا حکمران تھا،کل ۱۹ سال کی عمر میں اس بے چارہ کو قولنج کے مرض سے وفات ہوئی،میں تو دنگ ہوکر رہ گیا،جب مورخین کی کتابوں میں یہ واقعہ پڑھا کہ عین ریعان شباب میں حکومت کی باگ،حالانکہ اس کے ہاتھ میں آئی تھی،لیکن وہی شراب جس سے ملوک وسلاطین امراء داعیان تو خیر،سچی بات تو یہ ہے کہ متوکل جیسے متعصب دیندار بادشاہوں تک کی مجلس نشاط جس کے دور سے خالی نہ ہوتی تھی،لیکن شاہزادہ اسماعیل جب قولنج میں مبتلا ہوا،تو اطبا نے یہ طبی تجویز پیش کی کہ تھوڑی سی شراب استعمال کیجئے،مرض کا ازالہ ہوجائے گا،اطباء اصرار کررہے تھے،مگر نوجوان شاہزادہ نے کہا: ''لاافعل حتیّٰ اسئل الفقهاء''۔

''میں فقہاء سے جب تک نہ پوچھ لوں گا، یہ نہ کروں گا''۔

آخر فقہاء بلائے گئے، شافعی مذہب کے علماء نے بالاتفاق جواز کا فتویٰ دیا، اس نے حنفی فقہاء کو خطاب کیا، آپ لوگ کیا فرماتے ہیں؟ لکھا ہے کہ صاحبِ بدائع علامہ ابو بکر کاسانی مشہور حنفی امام نے بھی کہا کہ جس حال میں آپ ہیں، شرعاً شراب کا استعمال آپ کے لیے جائز ہے[1]، مگر اس پوچھ گچھ کے بعد جو بجائے خود اس عہد کے ایک شہزادے اور وہ بھی نوجوان شہزادے سے کچھ کم اعجوبہ خیز نہیں ہے، سننے کی بات یہ ہے کہ شافعی و حنفی علماء کے ان فتوؤں کے باوجود شہزادے نے پوچھا کہ:

''میری موت کی مقررہ مدت اگر آچکی ہے، تو شراب پینے سے کیا وہ ٹل جائے گی؟''

اس کا جواب جو ہوسکتا ہے، وہی دیا گیا، یعنی: قرآن جس چیز کو مؤجل قرار دے چکا ہے، جس میں گھڑی بھر کے لئے بھی تقدیم و تاخیر کا کسی کو اختیار نہیں دیا گیا، بھلا دوا اور علاج سے اس کو کون ٹال سکتا ہے.......!

شہزادے نے اس جواب کو سن کر کہا کہ حوصلہ کی بلندی، ایمانی، بردو سکینت کی یہ کتنی اثر انگیز و عجیب و غریب مثال ہے، اس نے علماء کو خطاب کرتے ہوئے اپنے دل کی بات کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

''ایسی چیز جسے اللہ نے حرام قرار دیا ہے، اُسے استعمال کر کے خدا کی قسم میں اللہ سے ملاقات نہیں کروں گا''۔ (شذور، ص:۲۵۸، ج:۴)

مؤرخین نے لکھا ہے:

''مات ولم یشرب رحمه الله''.

''شاہزادہ اسماعیل مر گیا اور شراب نہیں استعمال کی، خدا کی رحمت ان پر نازل ہو۔

سلطان صلاح الدین ایوبی پر تعلیمات غزالیہ کا اثر

سلطان نور الدین زنگی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد صلیبی حروب کی قیادت جس عالمگیر شہرت

---

[1]:...... اصل یہ ہے کہ جب تک بدل مل سکتا ہے، امام ابو حنیفہ شرعی محرمات کا دواء استعمال بھی جائز نہیں سمجھتے۔ مگر ان کے سوا عام ائمہ فقہاء حتی کہ خود امام صاحب کے تلامذہ بھی دواء استعمال کی اجازت دیتے ہیں۔ خواہ بدل سے علاج ممکن ہو یا نہ ہو۔ (منہ)

رکھنے والے بادشاہ صلاح الدین ایوبیؒ کے حصے میں آئی، مولانا فرماتے ہیں کہ ذرا اس کے حالات بھی دیکھئے کہ کس قدر حیرت انگیز ہیں۔

امام غزالیؒ کی وفات کے ستائیس سال بعد امام صلاح الدین کی ولادت ہوئی، ان کی مجاہدانہ زندگی سے تو خیر دنیا واقف ہے، میں اس وقت یہ ذکر کرنا چاہتا ہوں کہ اتنی عظیم سلطنت کے تاجدار ہونے کے باوجود ذاتی حال اس سلطان کا یہ تھا کہ وفات کے بعد ان کے ذاتی خزانے کا جب جائزہ لیا گیا تو:

"ماخرج غیر دینار صوری واربعین درھماًناصریة".

(ابن کثیر، ۱۲، ص: ۲۸)

ایک صوری اشرفی اور چالیس ناصریہ درہم کے سوا اور کچھ نہ نکلا۔[1]

ایک طرف (امام غزالی ہی کی صدی کا کچھ پیشتر کا) عضد الدولہ تھا، جو چاہتا تھا کہ روزانہ اس کے خزانے میں دس لاکھ درہم جب تک داخل نہ ہوں گے، دم نہ لے گا، دوسری طرف صلاح الدین کا یہ حال تھا کہ اپنے خزانے میں کچھ نہ چھوڑوں گا.......... بقول ابن اثیر فاطمیوں کے مصری خزانہ کا صلاح الدین تنہا وارث ہوا تھا، مگر ان ہی کی شہادت ہے کہ:

"ففرقه جمیعاً". (ج: ۱۲، ص: ۳۸)

یا ایک وہ کیفیت تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر پر چڑھنے والے خطباء اور علماء تک بھی غیر شرعی لباس سے پرہیز نہ کرتے تھے، علما دین کے خچروں تک کے گلوں میں طلائی طوق پڑے رہتے تھے، یا ایک حال صلاح الدین کا تھا کہ:

"لم یلبس شیئاً ممایُنکره الشرع".

"ایسی کوئی چیز کبھی نہ پہنی، جسے شریعت نے ناجائز ٹھرایا ہو"۔

مولانا فرماتے ہیں کہ:

آخر آپ ہی بتائیے کہ بخت واتفاق کے نیچے آدمی کہاں کہاں تک پناہ ڈھونڈے اور

---

[1]:...... ابن اثیر نے تو صرف درہم ودینار کے متعلق لکھا ہے، مورخ ابو الفدا جو اسی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ لم یخلف عقاداً ولا داراً۔ سلطان نے کوئی غیر منقولہ جائداد زمین وغیرہ کی شکل میں چھوڑی نہ کوئی ذاتی مکان چھوڑا۔

مسلسل پیش آنے والے ان واقعات کی جو غزالی کے بعد اسلامی تاریخ میں ملتے ہیں، کیا توجیہہ کرے........ یہ جو کچھ ذکر ہوا، مشرقی اسلامی دنیا کے خلفاء وسلاطین کا تھا، لیکن جب مغربی دنیائے اسلام (اندلس اور مغربی افریقہ) کے دینی انقلاب میں، جس کا امام غزالی کے بغداد سے ہزاروں میل کا فاصلہ تھا، لوگوں کا امام غزالی کا ہاتھ نظر آتا ہے (جیسا کہ ابن خلدون نے روایت بیان کی ہے کہ محمد بن تومرت، جو مغرب میں موحدین کی دینی حکومت کا حقیقی بانی تھا، امام غزالی ہی نے اس کو ایک ملاقات میں ایک طاقتور دین سلطنت کے قیام پر آمادہ کیا تھا) اور ہم اس مغربی حکومت کا یہ رنگ دیکھتے ہیں کہ موحدین کا دوسرا بادشاہ، جس کا نام یوسف بن عبدالمومن تھا، "صحیح بخاری" اس کو زبانی یاد تھی، جہاد کی حدیثیں خود املا کراتا تھا، ساری زندگی یورپ کے عیسائی سلاطین سے اسلامی علاقوں کو واپس لینے میں اس کی گزری، اس کے بعد اس کا بیٹا یعقوبؒ جانشین ہوا، جس کے متعلق الیافعی کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

> "شریعت کو پوری طاقت سے اس نے پکڑا تھا، معروف کا حکم دیتا تھا، منکرات کو اس نے روک دیا تھا، اس معاملہ میں بڑا دلیر تھا، کسی جھجک کے بغیر وہ ان امور کو انجام دیتا تھا"۔

مغربی افریقہ کے سوا اندلس پر بھی اس نے دوبارہ اسلامی اقتدار قائم کردیا تھا، بے تھاہ دولت کا مالک تھا، مگر بایں ہمہ بالاتفاق مورخین کا بیان ہے کہ:

> "كان يلبس الصوف ويقف للمرأة والضعيف فيأخذلهم حقهم من كل ظالم عنيف"۔
>
> (الیافعی، ج:۳، ص:۴۸۲)

> "بال کے بنے ہوئے کپڑے استعمال کرتا (یعنی: کمبل پوش تھا) معمولی عورت اور کسی غریب کمزور کے لئے بھی کھڑا ہوتا اور بڑے سے بڑے ہیکڑی دکھانے والے ظالموں سے حق دلا کر رہتا تھا"۔

(جب مغربی سلاطین تک کے ان حالات میں لوگوں کو امام غزالی کی کارفرمائی نظر آئی ہے) تو آخر میرے پاس اس تاثر کو بے بنیاد ٹھہرانے کی کیا وجہ ہوسکتی ہے، جب مشرق کے

ان خلفاء و سلاطین و ملوک کے ان حالات میں مجھے غزالی کی روح کارفرما نظر آتی ہے.........واقعہ یہ ہے کہ غزالی کے بعد کے خلفاء، ملوک وسلاطین کے ان طبقات میں غیر معمولی انقلاب کی جن موجوں کو ہم متلاطم پاتے ہیں، ان کے متعلق اس بات کا ثابت کرنا تو مشکل ہے کہ براہ راست امام کے کارندوں نے ان لوگوں کو متاثر کیا تھا، بلکہ محمد بن تومرت کے ساتھ بھی امام غزالی کے جن تعلقات کا لوگ تاریخوں میں تذکرہ جن الفاظ میں کرتے ہیں، ان سے عام تاریخی یقین کا پیدا ہونا بھی دشوار ہے اور ذکر بھی اس واقعہ کا اتنا سرسری طور پر دوسرے واقعات کے ضمن میں کردیا گیا ہے کہ عوام ہی نہیں، خواص تک کو بھی اس کی خبر نہ پہنچ سکی، اس لئے مولانا فرماتے ہیں کہ میرا دعویٰ یہ نہیں ہے کہ یہ نتائج عملاً امامؒ کی ارادی کوششوں سے وابستہ تھے، بلکہ:

''کہنا صرف یہ ہے کہ غزالی کے دل سے ایک آواز نکلی تھی، ان کے سامنے یہ قطعاً نہ تھا کہ کس کو سنا رہے ہیں، خلفاء کو، یا سلاطین کو، امراء کو، یا وزراء کو، عوام کو، یا خواص کو، بس وہ صرف سنانا چاہتے تھے اور امید قائم کی ہوگی کہ سننے کی جس میں صلاحیت ہوگی، اپنے اپنے ظرف کے مطابق اس کو سنے گا اور فائدہ اٹھائے گا اور یہی واقعہ پیش آیا بھی''۔

خلفاء وسلاطین کے بعد وزراء

آپ کے سامنے اب تک تو ان خلفاء وملوک ہی کی مثالیں گزری ہیں، جو یکے بعد دیگرے مشرق ومغرب میں غزالی کے بعد نمایاں ہوتے رہے، لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا، غزالی کے سامنے کوئی خاص طبقہ نہ تھا، سارے مسلمانوں کے لیے ان کا خطاب عام تھا، پس اب ذرا خلافت وسلطنت کے بلند زینوں سے نیچے اتر کر بھی دیکھئے:

وزیر ابن ہبیرہ

یہ اسی خلیفہ مقتفی باللہ کے وزیر ہیں، جس کا تذکرہ یہ گزر چکا ہے۔ امام غزالی کی وفات کے کل ۳۰ سال بعد خلافت عباسیہ کے وزیر اعظم کے عہدے پر سرفراز ہوئے ہیں، نام تو ان کا یحییٰ تھا، ہبیرہ جو ان کے دادا تھے، ان ہی کی طرف منسوب ہو کر ابن ہبیرہ کے نام سے مشہور

ہوئے، بارگاہ خلافت سے جیسا کہ اس زمانہ میں عام دستور ہو گیا تھا، طویل وعریض القاب ارکان حکومت کے نام کے آگے پیچھے لگائے جاتے تھے، ابن ہبیرہ کو بھی وزیر العالم، العادل، عون الدین، جلال الاسلام، صفی الاسلام، شرف الانام، معز الدولہ، عماد الأمتہ، مصطفیٰ الخلافۃ، تاج الملوک والسلاطین، صدر الشرق والمغرب، سید الوزرا، کا لمبا چوڑا خطاب ملا تھا، مگر جو حالات کتابوں میں ان کے ملتے ہیں، ان کو دیکھ کر یہی خیال گزرتا ہے کہ خود ابن ہبیرہ کے قلب میں نہ ان الفاظ کا کوئی وزن تھا اور نہ اس عہدے پر سرفرازی کے بعد آدمی جس جاہی و مالی اقتدار کا مالک ہو جاتا تھا، اس اقتدار کی وقعت وقیمت بھی ان کی نگاہ میں پر پشہ سے زیادہ نہ تھی۔ ابن جوزیؒ، ابن ہبیرہ کے صرف دیکھنے والے ہی نہیں، بلکہ ان کے حلقۂ درس حدیث میں بیٹھنے والوں میں سے ایک ہیں، بڑی تفصیل سے عباسی خلافت کی اس عجیب وغریب شخصیت کا انہوں نے تذکرہ کیا ہے، دو واقعے سننے کے لائق ہیں:

(أ)

صحاح ستہ کی حدیثوں کی شرح میں انتہائی تدقیق وتحقیق سے "الافصاح" نامی ایک کتاب خود ابن ہبیرہ نے تصنیف کی تھی، اسی کا درس وزارتِ عظمیٰ کے منصب پر سرفراز ہونے کے بعد ایک دن دے رہے تھے، مالکی مذہب کے ایک فقیہ نے خواہ مخواہ ایک مسئلہ میں الجھنا شروع کیا، علماء کا حلقہ تھا، ہر ایک فقیہ کو سمجھاتا تھا، فن کی معتبر کتابیں لا لا کر دکھلائی جا رہی تھیں، مگر فقیہ کا اصرار اپنی بات پر جاری رہا، قدرۃً ابن ہبیرہ کو اس اصرار بے جا پر غصہ آگیا اور زبان سے بے ساختہ یہ فقرہ نکل گیا:

"بهيمة انت، اما تسمع هؤلاء يشهدون والكتب المصنفة وانت تنازع وتفرق المجلس".

(شذوذ، ج: ٤، ص: ١٩٣)

"تم نرے جانور ہو، کیا سن رہے ہو یہ تمام لوگ کس بات کی شہادت دے رہے ہیں اور کتابوں سے کیا معلوم ہوتا ہے، مگر تم ہو کہ جھگڑتے ہی جا رہے ہو اور مجلس میں گڑبڑ پیدا کر رہے ہو"۔

کہنے کو تو ابن ہبیرہ نے اس وقت ان کو جانور کہہ دیا، لیکن اس کے بعد ان کے شریف نفس میں ذمہ داری کا احساس جب بیدار ہوا، تو پھر کس حال میں وہ مبتلا ہوئے، یہی سننے کی بات ہے، لکھا ہے کہ اس دن کی مجلس تو ختم ہو گئی، لیکن دوسری مجلس میں جب لوگ جمع ہوئے اور قاری نے قرأت کرنی چاہی، تو ابن ہبیرہ نے اس کو روک دیا اور مالکی فقیہ کی طرف خطاب کر کے کہنا شروع کیا کہ کل آپ کے اصرارِ بے جا نے خوانخواہ ایک ایسے لفظ کو میری زبان پر جاری کر دیا کہ جب تک آپ اسی لفظ سے مجھ کو مخاطب نہ کر لیں گے، درس شروع نہیں ہو سکتا، آخر آپ کو بہیمہ (جانور) کہنے کا مجھے کیا حق تھا؟ میں اپنے اندر کوئی ترجیحی درجہ نہیں پاتا، مجلس سناٹے میں آ گئی، خلافت عباسیہ کا وزیر اعظم الحاح واصرار کے ساتھ ایک معمولی مولوی کے سامنے قصور کا اعتراف کر کے یہ استدعا کر رہا ہے کہ مجھے "بہیمہ" یعنی: جانور آپ جب تک نہ کہہ لیں گے، میرے دل کو چین نہ ہوگا، بیان کیا گیا ہے کہ اہل مجلس پر رقت طاری ہو گئی، لوگ رونے لگے، مالکی فقیہ بھی حد سے زیادہ شرمندہ تھا، وزیر سے کہہ رہا تھا کہ قصور تو میرا تھا، مجھے معذرت پیش کرنی چاہیے، مگر ابن ہبیرہ چلا چلا کر "القصاص، القصاص" (بدلہ، بدلہ) کے لفظ دہراتے چلے جاتے تھے، آخر چند لوگ آگے بڑھے اور عرض کیا کہ ہم لوگوں کی رائے ہے کہ مالکی فقیہ کو آپ مالی مشکل میں کچھ معاوضہ ادا کر دیں، مگر فقیہ کو اس سے بھی انکار تھا، بہت سمجھانے بجھانے پر بے چارہ ۱۰۰ اشرفیوں کے لینے پر آمادہ ہو گیا اور یوں بات رفع دفع ہوئی، طالبعلمی کے زمانے میں ایک دن سڑک پر چلے جا رہے تھے، پھٹے حال تھے، ایک سپاہی نے پھل کا ایک ٹکڑا اٹھانے کا حکم دیا اور انکار کرنے پر ایک تھپڑ اس زور سے رسید کیا کہ ابن ہبیرہ کی داہنی آنکھ کی روشنی جاتی رہی، لیکن زندگی بھر اس کا تذکرہ کسی سے نہ کیا، اتفاقاً وزارتِ عظمیٰ کے زمانے میں بجرم قتل وہی شخص گرفتار ہو کر ابن ہبیرہ کے سامنے لایا گیا، انہوں نے خون بہا ادا کر کے مدعیوں کو روانہ کر دیا اور اس کو بھی پچاس اشرفیاں دے کر رخصت کیا، لوگوں نے اس غیر معمولی سلوک کی وجہ پوچھی، تب کہا کہ میری داہنی آنکھ کی روشنی جو غائب ہے، اس کا علم غالباً آپ لوگوں کو نہ ہوگا، قتل کے اسی مجرم کا یہ کرتوت ہے، پھر قصہ سنایا اور آخر میں بولے کہ بدی کا بدلہ نیکی سے دینا چاہیے، اس پر عمل کرنے کے لیے دل بے چین ہو گیا، اسی لئے اس کے

ساتھ میں نے یہ خصوصی برتاؤ کیا۔

قاضی فاضل

غزالیؒ کے بعد وزراء کے طبقے میں ابن ہبیرہ ان حالات میں تنہا نہیں ہیں، بلکہ کافی تعداد ایسے وزراء کی پائی جاتی ہے۔کم از کم سلطان صلاح الدینؒ کے وزیر، با تدبیر قاضی فاضل سے کون ناواقف ہے، ابن عمادؒ نے ''شذوذ'' میں انکے متعلق لکھا ہے:

''كان نزهاً عفيفاً نظيفاً، قليل اللذات، كثير الحسنات، دائم التهجد، ملازم القرآن، والاشتغال بعلوم الادب''. (ص: ۲۳۵، ج: ٤)

''بڑے پاک باز، پارسا اور باصفا بزرگ تھے، لذتوں کا حصہ ان کی زندگی میں بہت کم تھا، نیکیوں اور بھلائیوں کی ان کے ہاں کثرت تھی، تہجد کے پابند اور قرآن کے ساتھ دائمی وابستگی رکھتے تھے، نیز ادبی علوم میں مشغول رہتے تھے''۔

مالی حالت یہ تھی کہ علاوہ وزارتِ عظمیٰ کی تنخواہ کے ہندوستان اور مغرب میں وسیع پیمانہ پر ان کا تجارتی کاروبار پھیلا ہوا تھا، جاگیریں الگ تھیں، صرف ایک گاؤں ''ترنجہ'' نامی سے ابن عماد نے لکھا ہے کہ بارہ ہزار اشرفی آمدنی ہوتی تھی، مگر اس تمام آمدنی میں قاضی فاضل کا اپنا حصہ کتنا تھا؟

یہی ابن عماد لکھتے ہیں:

''كان لباسه لايساوى دينارين''.

''دو اشرفی بھی ان کے لباس کی قیمت نہ ہوتی تھی''۔

سواری جب نکلتی، تو ایک غلام کے سوا کوئی ساتھ نہ ہوتا، بکثرت قبرستان جاتے، جنازوں کے ساتھ چلتے اور مریضوں کے گھر جا کر عیادت کرتے۔

(بشکریہ ''الفرقان''، لکھنؤ، تیسرا انتخاب نمبر)

حضرت حکیم الامت مجدد الملت

مولانا تھانویؒ کی اعتدال پسندی پر عمومی نظر

از حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ

افراط وتفریط سے ہٹ کر زندگی کے جس مسئلہ پر اور جس شعبہ میں بھی آپ اعتدالی روش اختیار کریں گے، تو اچانک معلوم ہوگا کہ آپ تنہا رہ گئے اور آپ کے ساتھ کوئی باقی نہ رہا، وجہ اس کی ظاہر ہے کہ اکثریت عموماً نقطۂ اعتدال سے ہٹ کر انحرافی زندگی بسر کر رہی ہے، ایسی صورت میں ''اعتدال'' پر قائم رہنے والوں کے ساتھ کوئی نہ ہو، ہاں ہوں، تو تھوڑے بہت آدمی ہوں، یہ تعجب کی بات نہ ہوگی، آج کتنے ہیں جو حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قدس اللہ سرہ سے عقیدت رکھتے ہیں، لیکن مولانا کی طبیعت کا جو رنگ تھا، ذیل کی چند مثالوں سے اس کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

(۱) عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ مولانا ضوابط وقوانین کی پابندی سختی کے ساتھ کرتے تھے، جن لوگوں کے مزاج میں سختی ہے، اپنی سختیوں میں ہمیشہ وہ مولانا کے اسی اصول سے تسلی حاصل کرتے ہیں، خیال یہ کرلیا گیا ہے کہ رورعایت کا مولانا کی فطرت میں کوئی عنصر نہ تھا، مگر یہ تو لوگوں نے سمجھا ہے، خود مولانا کا حال یہ تھا کہ آپ کی مجلس مبارک میں کبھی ادھر ادھر کی خبروں کا ذکر لوگ چھیڑ دیتے، بعض سختی پسندوں نے عرض کیا کہ حضرت کی مجلس میں اس قسم کی چیزوں کا تذکرہ کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتا، یہ بھی کہا کہ بعضوں کو اس پر اعتراض بھی ہے کہ مشائخ وصوفیہ کی مجلسوں میں حقائق ومعارف کے سوا ادھر ادھر کی عام خبروں کا ذکر واذکار اچھا نہیں معلوم ہوتا، مولانا نے فرمایا:

۱:...... حضرت مولانا مناظر احسن رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ ''کمالات اشرفیہ'' (جو مولانا محمد عیسیٰ رحمۃ اللہ علیہ کے جمع کردہ ملفوظات اشرفیہ ہیں) لگی، بس اس ایک کتاب ہی سے چند جواہر چن کر یہ مضمون تحریر فرمایا تھا۔ جو پہلے ماہنامہ دارالعلوم دیو بند میں اور پھر ماہنامہ مستقبل (کراچی) بابت اکتوبر ۱۹۵۴ء میں چھپا تھا، مناسبت کی وجہ سے فوری تحفظ اثر کے طور پر اب شریک کتاب کردیا گیا ہے۔ (مؤلف)

''کوئی میرے پاس آ کر بات کرے اور میں منہ موڑلوں، تو اس کو صدمہ ہو گا''۔

پھر اپنی متعدل فطرت کے فطری مذاق کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا:

''زائداز کار باتوں کی برائی میرے نزدیک دل شکنی سے کم ہے''۔(کمالات اشرفیہ،ص:۳۷۱)

یہ آخری الفاظ مولانا تھانوی کے ہو سکتے ہیں؟ میں خیال کرتا ہوں کہ ان کو قریب سے دیکھنے والے بھی تھوڑی دیر کے لیے سوچ میں پڑ جائیں گے، مگر کیا کیجیے کہ یہی واقعہ ہے۔ لوگ اس کا خیال نہیں کرتے کہ خود عدل خلق اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ عمل اس باب میں کیا تھا، معمولی بڑھیا ہاتھ پکڑ کر دیر تک اپنی غیر ضروری باتوں میں مشغول رکھتی ہے! اور آپ سنتے رہتے ہیں، کیا صحیح حدیثوں میں یہ نہیں آیا ہے۔ مولانا ہی فرمایا کرتے تھے کہ حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ کا بھی مذاق تھا کہ ملنے والے جب تک بیٹھے رہتے، ان سے گفتگو کرتے رہتے، مقصود یہی تھا کہ اگر ایسا نہ کیا جائے، تو بے رخی کا احساس دلوں میں پیدا ہوتا ہے، جو عموماً موجبِ دل شکنی بن جاتا ہے۔ مجلس نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خصوصیت صحابہ کرام بیان کرتے تھے:

''یضحك مما یضحکون ویتعجب مما یتعجبون''.

''لوگ جن باتوں پر ہنستے، آپ ﷺ ان پر ہنستے، جن باتوں پر لوگ تعجب کرتے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی تعجب فرماتے''۔

دل شکنی کا خیال یہاں تک تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مصافحہ کرنے والے کا ہاتھ خود بھی نہیں چھوڑتے تھے، جب تک کہ وہی نہ چھوڑ دیتا، کسی سے رخ نہ پھیرتے تھے، جب تک وہی نہ پھیر لیتا، خود حکیم الامت قدس سرہ اپنا ایک خواب بیان کرتے تھے کہ ملکہ وکٹوریہ جس زمانہ میں زندہ تھی، آپ نے خواب میں اس کو دیکھا، ایک ایسی گاڑی پر جس میں نہ گھوڑے ہیں اور نہ باگ نظر آتی تھی، (موٹر کا اس وقت تک ایجاد نہیں ہوئی تھی) بہر حال خواب میں معلوم ہوا کہ مولانا سے کہہ رہی ہیں کہ اسلام ہی حق مذہب مجھے معلوم ہوتا ہے، البتہ ایک شبہ مجھے ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام مذاق لوگوں سے کیوں کرتے تھے، نبوت تو بڑی چیز ہے۔ عام مذہب میں بھی اس کو اچھا نہیں سمجھا جاتا، خواب ہی میں حضرت فرماتے ہیں، میں نے اسے کہا کہ لوگوں کو مانوس بنانا مقصود تھا، ورنہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے رعب کی وجہ

سے لوگ کھل کر حضور (صلی اللہ علیہ وسم) سے دل کی باتیں نہیں کہہ سکتے تھے، ملکہ اس جواب کو سن کر مطمئن ہوگئی، دیکھا آپ نے! مولانا کی نظر کہاں پہنچی .....! بیداری میں نہیں، خواب میں بھی دماغ وہیں پہنچا تھا، جہاں اس کو پہنچنا چاہئے۔

(۲) عام طور پر مولانا کے جس مذاق کو لوگوں نے مشہور کیا ہے، اس کے حساب سے آپ ہی بتایئے کہ اس سوال کا جواب، یعنی: ایک ڈاڑھی منڈانے والے کے ساتھ لڑکی کا رشتہ کروں یا نہ کروں؟ ایک صاحب نے یہ لکھتے ہوئے سوال کیا کہ ڈاڑھی والے جو ملتے ہیں، تو دال روٹی کا ان کے یہاں اطمینان نہیں اور جہاں اس کی تھوڑی بہت امید ہے، وہاں خرابی یہ ہے کہ ڈاڑھی منڈانے والے لڑکے ملتے ہیں، مولانا کے مذاق شناسی کے مدعی خود سوچیں کہ اس کا وہ کیا جواب دیں گے، مگر سنئے مولانا نے کیا جواب دیا:

"میرا خیال ہے کہ اس زمانہ میں پوری دینداری داڑھی والوں میں بھی نہیں، پس ایک داڑھی منڈانے کا گناہ کر رہا ہے، دوسرا شہوت پرستی کا گناہ کر رہا ہے، تو نری داڑھی لے کر کیا کریں گے"۔ (کمالاتِ اشرفیہ: ۲۳۹)

حقیقت یہ ہے کہ مولانا نے بڑے نکتہ کی طرف اس میں اشارہ فرمایا ہے، لوگوں نے خاص خاص گناہوں کو پکڑ لیا ہے، گویا گناہ گار ہونے نہ ہونے کا معیار بس صرف وہی ہیں، ان ہی گناہوں میں ایک ڈاڑھی بھی ہے، ایک شخص غیبت کرتا ہے، بدنظر ہے اور عملی طور پر بے احتیاط ہے، لیکن لمبی ڈاڑھی رکھتا ہے، اس پر لوگوں کو کوئی اعتراض نہیں ہوتا، ایک بے چارہ ان عیوب سے بری ہے، صرف ڈاڑھی منڈانے کا گناہ کرتا ہے، تو سمجھا جاتا ہے داڑھی والے صاحب سے داڑھی منڈانے والے کو کیا نسبت، حالانکہ جیسے داڑھی منڈانا گناہ ہے، داڑھی والوں کے گناہ اس سے کم نہیں؟ پھر ایک داڑھی پر اتنا زور کیوں دیا جاتا ہے؟ مولانا نے صحیح فرمایا ہے کہ داڑھی منڈانے کے سوا اور باتیں لڑکے میں اچھی ہوں، تو اس کو گوارا کر لیا جائے، بلکہ اس برتاؤ سے اغلب ہے داڑھی کا مسئلہ بھی اس کی سمجھ میں آجائے گا، ورنہ جو طریقہ لوگوں نے داڑھی کے ساتھ اختیار کر رکھا ہے، میں دیکھتا ہوں کہ منڈانے والوں کی جرأتوں کو اس طریقے نے اور بڑھا دیا ہے۔

(۳) مولانا چونکہ خود مولوی تھے، اس لیے مولویوں کا خیال ہوگا کہ انگریزی تعلیم

یا فتوں پر ضرور مولویوں کو ترجیح دیتے ہوں گے اور اس میں شک نہیں کہ عربی خواں مولویوں کا مولانا خاص طور پر احترام فرمایا کرتے تھے، مگر ایک دفعہ آپ نے فرمایا کہ انگریزی دانوں میں اور جتنی باتیں بھی ہوں، لیکن: ''ان کی گفتگو میں مزہ آتا ہے، کیوں کہ یہ سمجھ میں آنے سے مان لیتے ہیں''۔ (کمالاتِ اشرفیہ:۲۳۹)

مولویوں کے اس طریقے کو کہ جو بات منہ سے نکل گئی، اس کی پچ کئے چلے جاتے ہیں، سخت ناپسند فرماتے تھے، مولوی عبدالحق صاحب کا فقرہ ''اڑیل ٹٹو'' اس قسم کے مولویوں کے متعلق نقل فرمایا اور کہا کہ ''جمود و اصرار بری چیز ہے'' پھر حکمت کی بات یہ فرمائی کہ: ''غلطی پر اصرار آدمی کو لوگوں کی نگاہوں میں ذلیل کر دیتا ہے، لوگ اس شخص کی تعریف کرتے ہیں، جو اپنی غلطی مان لیتا ہے''۔

(۴) انگریزی خواں بیچارے بھی تو بہر حال مسلمان ہی ہوتے ہیں، اسلامی گھرانے میں پیدا ہوتے ہیں، غیر مذاہب کے لوگوں سے ملنے جلنے کا طریقہ کیا تھا، اس قصہ سے اس کا اندازہ ہوتا ہے، جب آپ ''اعظم گڑھ'' تشریف لے گئے تھے، راستے میں کسی اسکول کے سامنے سے گذر ہوا، جہاں زیادہ تر ہندو اساتذہ تھے، مولانا نے فرمایا کہ مجھے گذرتا دیکھ کر سارے ہندو اساتذہ اور طلبہ بھی تعظیماً اٹھ کھڑے ہوئے، اس حال کو دیکھ کر مولانا فرماتے ہیں کہ:

''میں وہاں رکا اور ان سب سے ملا، لوگوں سے میں نے مصافحے کئے''۔

پھر خصوصیت کے ساتھ ارشاد ہوا کہ:

''ایک ایک سے ملا، حتی کہ ہندوؤں سے بھی اور مزاج پرسی کی''۔

(کمالاتِ اشرفیہ:۳۷۷)

آپ کو معلوم ہے کہ مولویوں کا عام قاعدہ ہے کہ ایسے مدرسہ کے سامنے سے جب گذرتے ہیں اور جیسے حضرت کے ساتھ مدرسہ والوں نے برتاؤ کیا تھا، اسی برتاؤ کے ساتھ پیش آتے ہیں، تو عام طور پر مولوی لوگ ان ہندوؤں کی طرف متوجہ ہونا اپنی شان کے خلاف تصور کرتے ہیں، پھر حضرت نے اس تنگ دل ملا کا ذکر کیا، جس کے وعظ میں ایک غیر مذہب کا آدمی جو شاید ہندو ہی تھا، شریک ہو گیا تھا، مجلس وعظ میں ہندو کو دیکھ کر ملا

صاحب آپے سے باہر ہو گئے، گرجنے لگے کہ:

''نکالوں اس کافر مردود کو''۔ (کمالاتِ اشرفیہ: ۳۳)

(۵) بعض، خاص نوعیت کے متعلق مشہور کردیا گیا ہے کہ دیوبند کی طرف منسوب ہونے والے علماء کا ان مسائل میں یہ خیال ہے، حتیٰ کہ بے جانے بھی لوگ سمجھ جاتے ہیں کہ دیوبندی مولوی اس کا یہ جواب دے گا، مثلاً: یہ سوال کہ ''یا رسول اللہ'' (صلی اللہ علیہ وسلم) کے کہنے کا مسلمانوں میں عام رواج جو پایا جاتا ہے، دیوبندی مولوی اس کو کبھی جائز نہیں کہہ سکتا، مگر سنئے دیوبندیوں کے پیشواء کا کیا خیال تھا، فرمایا کہ: ''شوقاً دالتذاذاً ما ذونٌ فیہ''۔ (کمالاتِ اشرفیہ: ۵)

یعنی: پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مسلمانوں کے قلب کا جو اشتیاقی تعلق ہے، اس تعلق کا اظہار ''یا رسول اللہ'' (صلی اللہ علیہ وسلم) سے اگر کوئی کرتا ہو، ''یا رسول اللہ'' صلی اللہ علیہ وسلم کہنے میں اس کو لذت ملتی ہو، تو مولانا اس صورت میں ''یا رسول اللہ'' (صلی اللہ علیہ وسلم کہنے کی اجازت دیتے ہیں، البتہ استعانۃً واستغاثۃً فرمایا کہ جائز نہ ہوگا۔

ایسے سینکڑوں مسائل اور امور ہیں، جن کے متعلق لوگوں کے عام خیالات اور توقعات کے قطعاً مخالف چیزیں مولانا کے کلام میں ملتی ہیں، ضرورت ہے کہ ان چیزوں کو نمایاں کیا جائے، غلط فہمیوں کے ازالہ کے سوا خود مولانا کے عقیدت مندوں کے بہت سے غلط خیالات کی اس سلسلہ سے جہاں تک میں سمجھتا ہوں، اصلاح ہوسکتی ہے، میرے پاس اس وقت مولانا کی کتابوں کا ذخیرہ نہیں، صرف ''کمالاتِ اشرفیہ'' سے سرسری طور پر چند چیزوں کا ارتجالاً انتخاب کرلیا گیا ہے، افسوس ہے کہ مولاناؒ کی زندگی کے بہت سے گوشے جب تک زندہ رہے، غایتِ اخفاء کی وجہ سے پوشیدہ رہے، کچھ شک نہیں کہ اس زمانے میں بھی بعض مصلحین نے اپنی قوموں سے چھوت چھات، نسلی تفریق اور اخلاقی خرابیوں کو ختم کرنے کے لیے بڑی کوششیں اور اس راہِ عمل میں بڑے مجاہدے کئے ہیں، مگر اکثر ان لوگوں کے کاموں میں نمود ونمائش کا شائبہ پایا جاتا ہے، ان کی ہر چیز کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا ہے، اس سے بھی گہری بات وہ ہے، جس کی طرف امام غزالیؒ نے لباس کی بحث میں اشارہ کیا ہے کہ نمائش صرف اچھے کپڑوں ہی کے پہننے میں نہیں ہے، بلکہ اس سے بھی بڑی

ریا کاری یہ ہے کہ پھٹے پرانے گودڑ پیوند در پیوند لگے ہوئے کپڑے کے ساتھ اپنے آپ کو اتنا مقید کرلیا جائے کہ جب تک وہ نہ ملے، کپڑے ہی نہیں پہنیں گے، اسی طرح یہ ضد کہ میں رہوں گا، تو فلاں کے پاس اور ٹھہروں گا، تو فلاں جگہ، مجھے اس میں بھی بجائے بڑائی کے کچھ اس قسم کی بات نظر آتی ہے، جو عموماً چھوٹے لوگوں میں پائی جاتی ہے، آخر آپ اس شخص کو کیا کہیں گے، جس نے التزام کرلیا یہ کہ کھاؤں گا، تو جو ہی کی روٹی کھاؤں گا، قورمہ اور پلاؤ پر اصرار کرنے والوں میں اور اس جو کی روٹی میں اپنی غذا کو منحصر کرنے والوں میں کیا فرق ہے....؟

خیر! دوسروں سے مجھے کیا بحث!! میں تو مولانا کے متعلق عرض کر رہا تھا کہ خود ہی فرماتے تھے: ''کہ میرے بھائی اکبر علی نے مجھ سے ایک دن کہا کہ اب تمہارا شمار ہندوستان کے بڑے آدمیوں میں ہے، اس لیے چاہیے کہ سفر کم از کم سیکنڈ کلاس میں تو کیا کرو''۔ حضرت فرماتے ہیں کہ ان کے اس مشورہ کو سن کر میں نے عرض کیا کہ:

''کیا کروں، میری طبیعت کے خلاف ہے، میں ریل میں گنواروں اور بھنگی چماروں کے ساتھ بیٹھتا ہوں''۔ (کمالاتِ اشرفیہ:۳۷۵)

اسی طرح آج عام انسانی ہمدردی کا دنیا میں کتنا چرچا ہے، لیکن مولانا نے خود اپنا قصہ جو بیان کیا ہے کہ ''بھاولپور گیا ہوا تھا، گرمی سخت تھی، جیل خانے کے قیدیوں کو پنکھا کھینچنے کے لیے بلایا گیا'' مولانا فرماتے ہیں کہ: ''پہلے یہی بات مجھے ناگوار ہوئی اور چاہا کہ ان کو واپس کردوں، لیکن اس کے ساتھ یہ خیال بھی آیا کہ جیل کی زندگی سے ان بیچاروں کو تھوڑی دیر کے لیے اس ذریعے سے تو رہائی مل جاتی ہے، یہ سوچ کر واپس کردینے کے خیال تو دل سے نکال دیا، انتظار کرتا رہا، جب سب لوگ چلے گئے، تو میں نے ان قیدیوں سے کہا کہ

:''پنکھا بند کردو، پھر جی چاہے سو رہو، یا بیٹھے رہو، کیونکہ بیگار لینا جائز نہیں ہے''۔

فرمایا کہ کھانا آیا، تو ان قیدیوں کو بھی کھانا دلوایا، پھر تو ہر قیدی اس کی خواہش کرتا تھا کہ میں ہی بلایا جاؤں۔ (حیاتِ اشرف، ڈاکٹر غلام محمدؒ)

آغوش موج کا ایک درِ تابندہ یا اسلامی ہند کے طوفانی عہد میں خدا کا ایک وفادار بندہ

کیا کروں بات نکلتی چلی آ رہی ہے، قلم کو روکتا ہوں، لیکن یہ خیال کر کے کہ پھر موقعہ ملے نہ ملے، جو کچھ اپنے اندر ہے، دوسروں تک پہنچا دیا جائے، جذبات دبانے سے نہیں دبتے اور سلف کے حالات سننے، یا سنانے کا مقصد بھی صرف سننا، یا سنانا نہ ہونا چاہئے کہ ماضی سے مستقبل کی تعمیر میں اگر کچھ مدد مل سکتی ہے، تو پھر یہ کام کی بات ہے، ورنہ بجز ایک دلچسپ داستان کے وہ اور کیا ہے.....؟

ہاں تو عرض کر رہا تھا کہ ہندوستان ہی میں قیام کا ارادہ طے کرتے ہوئے شاہ صاحب نے یقیناً اپنی عمل کا کوئی پروگرام بنایا، اگرچہ بہ تفصیل انہوں نے اپنے دستور العمل کے ضوابط کو کسی جگہ قلم بند نہیں فرمایا، لیکن پھلوں سے بھی درختوں کی نوعیت کا پتہ چلایا گیا ہے، خود جس کا عمل اس کے منصوبے کی فہرست اگر ہمارے سامنے پیش کرتا ہو، تو ہمیں اس کے سمجھنے اور پڑھنے سے انکار نہ کرنا چاہئے۔

بہر حال میں نے جہاں تک غور کیا ہے اور شاہ صاحب کی کتابوں کی کثرت مطالعہ نے جن نتائج تک مجھے پہنچایا ہے، اس کا خلاصہ میرے الفاظ میں یہ ہو سکتا ہے کہ اپنے زمانہ کے مختلف فتنوں کو دیکھ دیکھ کر ان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے، گویا ٹھیک "اطیب النغم" میں شاہ صاحب کا پہلا شعر ہے:

کان نجوما اومضت فی الغیاھب عیون الافانی
اورؤس العقارب

تاریکیوں میں جو ستارے چمک رہے ہیں، مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ
ناگوں کی آنکھیں یا بچھوؤں کے سر ہیں

وہ سماں میں ہندوستان میں ان کی آنکھوں کے سامنے گھوم رہا تھا، انہوں نے اندازہ کر لیا تھا اور وہ نہ کرتے، تو کون کر سکتا تھا کہ اب۔

بنے رہو گے تم اس مُلک میں میاں کب تک

بہ دیر، یا بسویر رہی سہی نام نہاد اسلامی حکومت کے خاتمہ کا وقت قریب آ چکا ہے، ان کے سامنے سوال آتا ہوگا کہ آخر ان کروڑوں مسلمانوں کا انجام کیا ہوا گا، معاش کا کفیل تو ''خیر رزاق مطلق'' ہے، جب تک جو جیتا ہے، ذولقوۃ المتین بہر حال اس کا انتظام کسی نہ کسی شکل میں کر ہی دیا کرتا ہے اور یوں قناعت کی راہوں کی چھوڑ کر کوئی سینہ کوبی ہی پر مصر ہو، تو آج انگلستان جو نہ صرف سیاسی قوتوں کے ذریعہ سے دنیا کے آباد ترین پیداوروں کا تنہا خرمن ہے، بلکہ تجارت صنعت حرفت قمار ربوا، الغرض مالی انتقاع کے ممکنہ وسائل کی کنجیاں ساری روئے زمین کی اسی کے ہاتھ میں ہیں اور کس انگلستان کا یہ حال ہے، جو اپنے طول وعرض میں بنگال کے کسی متوسط درجہ کے ضلع سے بھی زیادہ بڑا نہیں ہے، آبادی بمشکل صرف چار ساڑھے چار کروڑ تک پہنچتی ہے، لیکن بایں ہمہ ان چار کروڑوں میں تقریباً دو کروڑ لیبرس اور مزدور کے پیٹ پیٹ کے شور سے آسمان تھرا رہا ہے، آئے دن حکومت والوں پر پتھر پھینکے جاتے ہیں، کھڑکیاں توڑی جاتی ہیں اور جو کچھ ہوتا رہتا ہے، روزناموں کے تاروں میں اس کی خبریں چھپتی رہتی ہیں، بھلا جس ملک کو خود آزادی ہی حاصل نہیں ہے، بلکہ بیسیوں ممالک واقالیم کی آزادیاں بھی اسی کی آزادی میں ہضم ہو چکی ہیں، سیاستۃً بھی، تجارتۃً بھی، صنعتۃً بھی، حرفتۃً بھی۔۔۔ اور اس کے سوا ہر راہ سے ہر چیز ہر قوم کی اسی انگلستان کے باشندوں میں فنا ہو رہی ہے، جب اس کا یہ حال ہے، تو جن کا یہ خیال ہے کہ صرف غیروں سے آزاد ہو کر، یا نیم آزاد ہو کر ہم بتیس کروڑ انسانوں کے آزاد شکم کو قناعت کے ذریعہ سے نہیں، بلکہ حرص وآز کی بھٹیوں کو بھڑ کا کر دبانے میں کامیاب ہوں گے، ان کے پاس اس خیال کو خواب وخیال کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے؟ آج جو حضرات عوام کو اپنے جھنڈوں کے نیچے پیٹ بجا بجا کر بلا رہے ہیں اور دنیا کو یہ بتلا اور سمجھا رہے ہیں کہ انسان کے لیے سب سے مقدم اور اہم پیٹ کا مسئلہ ہے اور اعضائے انسانی ہیں، عضو رئیس بس معدہ ہے، ان کو فکر معقول سے کام لینا چاہئے کہ جس راہ پر آدم کی اولاد کو وہ لئے جا رہے ہیں، یہ ترکستان جاری ہے، یا کعبہ پہنچائے گی۔

بہر حال میرے نزدیک شاہ صاحب کے سامنے مسلمانوں کے ''شکم'' کے غم سے

زیادہ زندگی کے اس ''سوال اہم'' کا غم تھا، جس کے جواب کے بغیر اس دنیا کی ہر زندگی بے نتیجہ ہو کر رہ جاتی ہے، یعنی محمد ﷺ نے مسلمانوں کو انجام کی درستی کے لیے ''آغاز'' کا جو دستور دیا تھا، مسلمانوں کو اس پیغام سے جو تعلق ہے، ان فتنوں کی پہلی زد قدرتاً اسی تعلق پر پڑے گی، اب تک تو ہر مسلمان علاوہ موروثی مسلمان ہونے کے ''علی دین ملوکھم'' کے قانون کے تحت بھی مسلمان ہی رہنے میں فائدہ محسوس کرتا تھا، بلکہ غیروں میں بھی کتنے تھے جو اپنے نامسلمان ہونے پر اس زمانہ میں پچھتاتے تھے، لیکن جب ''ملوک'' بدل جائیں گے اور ((افسدوھا وجعلو ااعزۃ اھلھا اذلہ و کذالک یفعلون)) (قرآن کی آیت ہے جو ملکہ سبا نے کہا تھا کہ: ''سلاطین جب کسی ملک میں داخل ہوتے ہیں، تو اس کو بگاڑ دیتے ہیں اور ملک کے عزت والوں کو خوار و ذلیل کر دیتے ہیں) مستمر قاعدہ کی بنیاد پر اس وقت اسلام سے وابستگی کا یہ ''ملوکی'' ذریعہ بھی باقی نہ رہے گا، سوال یہی تھا کہ پھر اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے دامن مبارک کے ساتھ بندھے رہنے کی ہندوستان میں مسلمانوں کی کیا شکل ہوگی؟

دوسری طرف وہ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ ہندوستان میں مذہب اسلام کی تعلیم و تعلم اور نشر و اشاعت کے جو ذمہ دار ہیں، ان کے دونوں طبقوں (یعنی: مذہب کے ظاہری رسوم و عام عقائد کے محافظ جنہیں عموماً ''علماء'' کہتے ہیں اور مذہب کی واقعی روح اور اس کے باطنی مقاصد کے علم بردار جنہیں ''صوفیہ'' اور ''مشائخ'' کہتے ہیں) دونوں گروہوں کا اس زمانہ تک پہنچتے پہنچتے عجب حال ہو رہا تھا، شاہ صاحبؒ کے جس ''پیغام'' کا ترجمہ پہلے درج کر چکا ہوں، اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس عہد کے علما کی کیا حالت تھی کہ ان کو مخاطب کر کے فرمایا تھا:

اشتغلتم بعلوم الیونانین وبالصرف والنحو والمعانی

تم یونانیوں کے علوم اور صرف ونحو و معانی میں الجھے ہوئے ہو

اور یہ عام علماء کا حال تھا، خصوصیت کے ساتھ جنہیں علماء دین کا لقب حاصل تھا اور فلسفہ و منطق سے وہ کارہ تھے، جن کا نام فقہاء تھا، ان کی یہ کیفیت تھی کہ دین کے حقیقی سرچشموں قرآن و حدیث اور ائمہ مجتہدین اور ان کے تلامذہ کے اقوال تک سے بہت دور

آگے نکل کر ہر وہ چیز جو فقہ کے نام سے کسی کتاب میں لکھی ہوئی ہوتی، ان کے نزدیک ''وحی محکم'' اور ''نص قطعی'' کا درجہ حاصل کئے ہوئے تھی، اپنی مشہور کتاب ''انصاف'' میں فقہاء عصر کی تصویر ان الفاظ میں کھینچتے ہیں:

فالفقيه يومئذ هو الثرثار المتشدق شدقيه الذى حفظ اقوال الفقهاء قويها وضعيفها من غير تميز و سردها بشقشقة شدقيه.

اس زمانہ میں فقیہ اس شخص کا نام ہے، جو باتونی ہو، زور زور سے ایک جبڑے کو دوسرے جبڑے پر پٹکتا ہو، جو فقہا کے اقوال قوی ہوں، یا ضعیف سب کو یاد کر کے بغیر اس امتیاز کے ان میں سے کس میں قوت ہے، کس میں نہیں ہے، وہ انہیں اپنے جبڑوں کے زور سے چلتا کرتا رہے۔

اسی گروہ کے متعلق دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ ان کی بے تمیزیوں کا یہ حال ہے کہ خود امام ابوحنیفہؒ ان کے تلامذہ اور بعد کے علماء کے اقوال تک میں فرق نہیں کر سکتے۔

ويزعم ان جميع مايوجد فى هذه الشروح الطويلة وكتب الفتارى الضخمة فهو قول ابى حنيفة وصاحبيه ولا يفرق بين القول المخرج بيس ماهو قوال فى الحقيقة ولا يحصل معنى قولهم على تخريج الكرخى كذاوعلى تخريج الطحاوى كذا ولا يميزباين قولهم جواب المسئلة على قول ابى حنيفة كذا وعلى اصل ابى حنيفة كذا.

(یعنی: اس زمانے کے فقیہوں کا) خیال یہ تھا کہ طویل ضخیم شرحوں اور فتاوی کی کتابوں میں جو مسائل پائے جاتے ہیں، یہ سارے کے سارے امام ابوحنیفہؒ اور ان کے شاگردوں کے ہیں، (یہ مسکین فقیہ) اس کی تمیز نہیں رکھتا کہ جو باتیں ائمہ کے اصول کی بنیاد پر ان کی طرف منسوب

کی گئی ہیں، ان میں اور جو واقعی میں ان کے اقوال ہیں، ان میں کیا فرق ہے؟ وہ بیچارہ فقہ کی یہ اصطلاح بھی نہیں سمجھتا، جو لکھتے ہیں کہ فلاں بات کرخی کی تخریج پر مبنی ہے، یا طحاوی کی تخریج سے اس کا تعلق ہے، اسی طرح یہ قول کہ ابو حنیفہ ؒ کے قول پر مسئلہ کا جواب یہ ہے اور ان کی اصل پر مسئلہ کا جواب یہ ہے، ان دونوں میں ان کو کوئی تمیز نہیں ہوتی۔

اس قسم کی واقعی تنقیدوں سے ان کی کتابیں معمور ہیں، ماسوا اس کے اسی طبقہ میں ایک گروہ ان لوگوں کا بھی تھا جو:

نهضوا الطلب العلم توصلا الی العز و درك الجاه فاصبح الفقهاء بعد ما كانوا مطلوبين طالبين، وبعد ان كانو اعزه بالاعراض عن السلاطين اذلة بالا قبال عليهم.

طلب علم کے لیے اس لئے آمادہ ہوئے، تاکہ علم کو اپنی عزت اور جاہ کے حاصل کرنے کا ذریعہ بنائیں، نتیجہ اس کے بعد ہوا کہ فقہاء جو پہلے عوام کے مطلوب تھے، اب یہی عوام کے طالب ہوگئے اور سلاطین اور بادشاہوں کے دربار سے الگ رہنے کی وجہ سے جو معزز شمار کئے جاتے ہیں، اب بادشاہوں کے آستانوں پر وہ جھک کر ذلیل وخوار ہو رہے ہیں۔

دین کے ان حاشیہ برداروں کو شاہ صاحب دیکھ رہے تھے اور ان کا سینہ شق ہوا جاتا تھا، "ملوکی" ربط کے ختم ہونے کے بعد مسلمانوں کو ان کے صحیح دین پر باقی رکھنے کی ایسوں سے کیا توقع ہو سکتی تھی، پھر کچھ ہی دن پیشتر ان ہی دنیا طلب علما کے ہاتھوں اکبر کے دربار میں اسلام کا جو ہنجار ہو چکا تھا، اس کا نقشہ بھی شاہ صاحب کے پیش نظر تھا۔

دوسری طرف صوفیہ اور مشائخ کی جو کیفیت تھی، شاہ صاحب کے دردمند دل کے لیے صرف اذیت اور دکھ ہی بنی ہوئی تھی، کیونکہ علماء سے زیادہ غریب مسلمانوں پر اس زمانہ میں خصوصاً ہندوستان میں ان ہی کا اثر غالب تھا، ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اگر مسلمان ان ہی کے ہاتھوں میں سپرد کر دیئے گئے، تو یہ ان کو کہاں لے جا کر غرق کریں گے، اپنے وصیت

نامہ میں لکھتے ہیں:

کرامات فروشان ایں زماں ہمہ الا ماشاء اللہ طلسمات و نیز نجات را کرامات دانستہ اند۔

کراموں کے بیچنے والے اس زمانہ میں سب کے سب (بجز اسکے جسے خدا چاہے) اپنی طلسماتی کاروائیوں اور علم نیز نج کے نتائج کو کرامات سمجھ بیٹھی ہے۔

پھر اس کی تفصیل کرنے کے بعد کہ آدمی طلسمی قوانین اور علوم نیز نجات کے زور سے کس کس قسم کے ''خوراق'' دکھا سکتا ہے، آخر میں فرماتے ہیں کہ:

واعمال جوگ کہ بعضے ملاحظات جوگیہ را خاصیتے تمام ست در اشرف وکشف

اور جوگ بعض تدبیریں، کیونکہ جوگیوں کی زندگی کے بعض پہلوؤں کو دوسروں کے دل کی حالت پر فی الجملہ اطلاع، یا کشف وغیرہ سے خاص تعلق ہے۔

جن لوگوں نے شاہ صاحب کے متعلق خیال قائم کیا ہے کہ انہوں نے ہندوستان کے براہمہ اور جوگیہ کے فلسفہ ویدانیت اور فلسفہ یوگا کو اسلامی حقائق سے مخلوط کر کے ایک ''جدید ہندی دین'' کی بنیاد ڈلی ہے، کیا ان کی نگاہوں سے یہ اور اس قسم کی بیسیوں عبارتیں نہیں گزری ہیں؟ شاہ صاحبؒ نے صاف کھل کر لکھدیا ہے کہ:

''بسیارے از سادہ لوحاں دیدہ ایم کہ چوں ایں اعمال از شیخے فراگرفتہ انداں راعین کرامات می دانند''

''میں نے بہت سے سادہ لوحوں کو دیکھا ہے کہ کسی شیخ سے جب اس قسم کے عمل وغیرہ کو سیکھ چکتے ہیں، تو انہی باتوں کو ٹھیک کرامت قرار دیتے ہیں۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ:

صلاح وفجور، مقبول بودن، یا مردود بودن دریں جا ہیچ فرق پیدا نمی کند

نیکوکاری، یا بدکاری اسی طرح مقبول ہونا، یا مردود ہونا، اس معاملہ میں اس اختلافِ حال سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

(یعنی ان روحانی ورزشوں سے یہ نتائج ہر ایک میں پیدا ہوتے ہیں، خواہ شقی ہو، یا سعید)

خصوصاً جو زمانہ شاہ صاحب کا تھا، طرح طرح کے طریقے اور نئی نئی شکلوں میں تصوف پیش ہو رہا تھا، آپ ہی کے عہد میں دلی کا وہ مشہور مردود معروف بہ۔۔۔ ''نمود وانمود'' ۔۔۔ ایک خاص بھیس میں ان ہی طلسمی نیرنجاتی جوگیاتی طریقوں کو سیکھ کر نمودار ہوا تھا، جس نے ایک خاص زبان اور اس کے قواعد ایجاد کئے تھے اور اپنے ایک ساتھی کو محرم اسرار بنا کر۔۔۔۔۔ ''آقوزہ مقدسہ'' ۔۔۔۔ نامی کتاب کے الہام کا دعویٰ کیا تھا، مدعی تھا کہ نبوت اور وصیت کے درمیان ایک اور لاہوتی عہدہ ہے، جس کی تعبیر وہ ''بیگوکت'' کے لفظ سے کرتا تھا کہ ہر اولوالعزم پیغمبر کے ساتھ ہمیشہ نو بیگوک ہوا کئے ہیں اور آنحضرت ﷺ کے ساتھ بھی نو ہی بیگوک کا پیدا ہونا ضروری ہے، پھر شیعوں کی جماعت میں تو یہ کہتا ہے کہ بیگوک اول حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ تھے، ان کے بعد آٹھ اماموں تک ،یعنی: حضرت علی رضاؒ تک امامت اور بیگوک کے عہدے ایک ہی ذات میں جمع رہے، ان کے بعد صرف امامت رہ گئی اور نویں آخری بیگوک کا منصب مجھے عطا ہوا ہے، مجھے ہی پر یہ عہدہ ختم بھی ہوتا ہے اور سنیوں سے کہتا کہ چار بیگوک تو خلفاء راشدین تھے، اور باقی چار بیگوک کے لیے بنی امیہ اور عباسیہ کے بعض ایسے خلفاء کا نام لیتا، جو گونہ نیکی اور دینی حمیت میں امتیاز رکھتے تھے اور نواں بیگوک اپنے کو ٹھہراتا، اس نے عوام کو فریب دینے کے لیے اپنے مریدوں اور لڑکوں، لڑکیوں کے خاص خاص مجہول المعنی نام رکھتے تھے، مثلاً وہی محرم اسرار جو گویا اس کا خلیفہ تھا، اس کا نام ''دو جی یار'' تھا۔ نما، نمود، فغار، نمودیدیہ، اس کے لڑکوں کے اور نمانہ کلاں، نمانہ خورد لڑکیوں کے نام تھے، مریدوں کو ''فربود'' کہتا تھا، اس نے پنجوقتہ نمازوں کے سوا ''دید'' نامی عبادت کا طریقہ جاری کیا تھا، جو طلوع وغروب واستواء شمس کے وقت ایک خاص طریقہ سے ادا کی جاتی، اس کے علاوہ اسلامی عیدوں کے چند مزید تہواروں کا اضافہ کیا تھا، یعنی: جن دنوں میں (العیاذ باللہ) ''وحی'' کی اس پر ابتداء ہوئی، ملعون مدعی تھا کہ اس پر بھی وحی دو طریقوں آتی ہے، ایک میں آفتابی قرص اس کے سامنے نمودار ہوتا ہے اور اسی پر حروف لکھے ہوئے نظر آتے ہیں اور دوسری میں آواز آتی ہے، الغرض خرافات کا ایک سیلاب تھا، جو پیر و مرید نے مل کر بہایا تھا، چونکہ بعض امراء بھی اس کے معتقد ہو گئے تھے، اس لئے عوام کا میلان بھی اس کی طرف بتدریج بڑھتا جاتا تھا، حتیٰ

کہ فرخ بادشاہ بھی اس کی استجابت دعا کی شہرت سن کر تنہائی میں ملا، مکار نے یہ سن کر کہ بادشاہ ملنے آرہا ہے، کمرہ کا دروازہ بند کردیا، ہزار منت سماجت کے بعد جب دروازہ کھلا، تو بادشاہ کے سامنے اس مرگ چھالے کو پھینک کر جس پر خود بیٹھا ہوا تھا بولا:

پوست تخت گدائی وشاہی ہمہ داریم آنچہ می خواہی

بادشاہ اپنے ساتھ روپیوں اور اشرفیوں کی تھیلیاں نذر کے لیے لے گیا تھا، ٹھوکر مار کر کنارہ کردی، جب فرخ سیر نے بہت اصرار کیا، تو خود نوشتہ قرآن دے کر اس کی اجرت کل ستر روپیہ اس نے قبول کی، بادشاہ پر اس کی مصنوعی بے نیازی واستغناء کا پورا اثر ہوا، نتیجہ یہ ہوا کہ اب تک تو کچھ علماء اور عام پبلک کے خوف سے اپنے مزخرفات کے علانیہ اظہار کی اسے جرات نہ ہوئی تھی، لیکن بادشاہ کی عقیدت مندی کے بعد خود کھیل کھلا، ایک خاص قسم کی لمبی ٹوپی سر پر رکھے دو جھنڈوں کے ساتھ اس کے فربود اس کی سواری نکالتے تھے، باہم ایک دوسرے پر عبیر وگلاب چھڑکتے جاتے، اور وہی مجہول المعنی اختراعی الفاظ والے منتر جپتے جاتے تھے اور اب ان کو کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا تھا، دلّی کی ایک بڑی مخلوق اس کی معتقد اور اس کی اصطلاح میں اسکی ''فربود'' ہوگئی تھی، فرخ سیر کے عہد تک اس کا یہی حال رہا، محمد شاہ کے زمانہ میں جب محمد امین خاں منصب وزارت سے سرفراز ہوئے، تو منجملہ اور کاموں کے اس ''نمودوانمود'' کی بھی خبر لینی چاہی، لیکن اتفاق دیکھئے جیسا کہ طباطبائی نے لکھا ہے، ٹھیک ان ہی دنوں میں جب اس کی گرفتاری کے احکام جاری ہوئے، امین خاں جو مرض قولنج میں پہلے ہی سے متبلا تھے، انتقال کر گئے، مردود ''وانمود'' کے لیے ان کی موت استدراج کا ذریعہ بن گئی، اب کیا تھا خوب لن ترانیوں کی لینے لگا، اگر چہ دو تین سال بعد خود بھی مر گیا، اور اسی کے بعد اس کے خلیفہ اول ''دو جی یار'' اور صاحبزادے بلند اقبال ''نمانمود'' میں ''نصف لی ونصف لک'' کے قصہ میں جھگڑا ہوگیا، ''دو جی یار'' نے آخر ایک دن جب اس کے اکثر ''فربودوں'' کا مجمع تھا، کھڑے ہو کر سازش کا سارا قصہ سنایا، دونوں نے مل کر جو مسودات بناتے اور کاٹ پیٹ کر درست کرتے تھے، ان کا طومار لوگوں کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ اگر:

از جانب خدا می بود حاجت بحک واصلاح ہمدیگر نداشت (سیر المتاخرین، ج:۲،ص:۴۴۶)

اگر اللہ میاں کی طرف سے یہ کتاب ہوتی، تو اس میں کانٹ چھانٹ اور

اصلاح کی ضرورت نہ ہوتی۔

دونوں کے حروف کے پہچاننے والے کثرت سے موجود تھے، راز کھل گیا اور بیچارے عوام کو اس کے فتنے سے نجات میسر آئی، اگرچہ ''نمانمود'' نے کچھ دن اپنے باپ کی بیگوئت کے بجائے دہلی کے ایک دیہات میں جا کر چلایا اور ''نمانمود'' کے بعد ''فغار'' صاحب دوسرے بیٹے نے بھی کچھ دن اس تحریک کو چند لوگوں میں باقی رکھا، یہاں تک کہ بالآخر فغار کے مرنے کے بعد چند بقیہ السلف اس کے اعزہ بنگال میں پناہ گزیں ہوئے اور مشہور اشقی القوم میر جعفر کے بیٹے میرن کی سرپرستی میں کچھ دن گزارے، خدا جانے ان منحوسوں کے نام لیوا اب بھی بنگال میں پائے جاتے ہیں، یا نہیں، تاہم ایک مدت تک خصوصاً اس زمانہ میں جس میں حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ دلّی میں تھے، ہندوستان کے مسلمان اس خبیث فتنہ کے شکار ہورہے تھے اور واقعہ کچھ بھی نہ تھا، عالمگیر کے عہد میں کابل کا صوبہ دارا میر خان تھا، اس کے پاس ایران سے یہی ''نمود وانمود'' جس کا اصلی نام محمد حسین تھا آیا، اور سید ہونے کا مدعی ہوا، امیر خان کی بیوی جولا ولد تھی، اس نے ایک لڑکی پال رکھی تھی، اسی سے اس کا نکاح ہوگیا، امیری سے گزرنے لگی، امیر خان صاحب مرگیا، تو محمد حسین جو امیر خان کے خوشبو خانہ کا داروغہ بھی تھا، عطر وگلاب کا تحفہ لے کر دلّی چلا، لاہور میں عالمگیر کی وفات اور خانہ جنگی کی خبر ملی، امراء کے ہاتھ اسی عطر وگلاب کو بیچ کر اس نے ساٹھ ستر ہزار روپیہ کھرے کئے اور اسی نے دو جی یار سے سازش کر کے مکروفریب کا یہ طلسم کھڑا کیا تھا۔[1]

مسلمانوں کی یہ زود اعتقادیاں، جو غلط تصوف کے رواج کا نتیجہ تھیں، حتی کہ بادشاہ تک ان ہی اوہام میں مبتلا تھا، اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ایک صاحب بصیرت روح کے لیے کس درجہ سوہان روح بنی ہوئی ہوگی اور بات کچھ اسی پر ختم نہیں ہوگئی تھی، یہ تو ایک فرقہ تھا اور بھی اس قسم کے مختلف فرقے مختلف ناموں سے تصوف وعرفان کے بلند آہنگ دعووں کے ساتھ پیدا ہورہے تھے اور مختلف قسم کے شعبوں، کرشموں سے عوام کو اپنی طرف مائل

---

[1]..... میں نے اس مردود نمود وانمود کے حالت میں ذرا زیادہ بسط سے قصداً کام لیا ہے تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ اس زمانہ میں بھی بعض لوگ اپنے مردودوں اور عزیزوں کو جو عجیب وغریب خطابات تقسیم فرماتے ہیں، یا نبوت ومسیحیت، مہدویت وغیرہ کے معجون سے ''بروزی'' مثالی اور خدا جانے کس کس قسم کی نبوتیں تراش رہے ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہندوستان ان تمام تماشوں کو پہلے بھی دیکھ چکا ہے۔

کر کے گمراہ کر رہے تھے، شاہ صاحب خود اپنا ذاتی تجربہ بیان فرماتے ہیں:

ما تجربہ کردہ ایم کہ ماہر درفن نجوم چوں دانست کہ الحال کدام دقیقہ ست از دقائق روز ازیں جا ذہن اور منتقل می شود، بطالع و ہمہ بیوت ومواضع کواکب در خاطر حل صورت می بندد گوایا صفحہ تسویۃ البیوت، مقابل خود ایستادہ است وہم چنین ماہر درفن رل گاہے دردل خود معین می کند کہ فلاں انگشت رالحیاں قرار دادہ ام، وفلاں انگشت رافلاں شکل درذہن صورت می بندوازیں شکال کدام متولد می شود، تاینکہ زائچہ پیش او حضری شود۔

میں نے خود تجربہ کیا ہے کہ نجوم کے فن میں جن لوگوں کو مہارت ہوتی ہے، جب انہیں معلوم ہو جاتا ہے کہ اس وقت دن کے دقیقوں میں سے کون دقیقہ ہے، تو مطالع اور ہر ہر بیت و مقامات کواکب کی طرف اس کا ذہن منتقل ہو جاتا ہے اور یہی حال ان لوگوں کا ہے، جو فن رل میں ماہر ہوتے ہیں، اپنے دل میں یہ خیال جماتے ہیں کہ فلاں انگلی کو میں نے لحیاں قرار دیا ہے اور فلاں انگلی فلاں شکل اور ان سب سے ذہن میں ایک صورت قائم کر کے سوچتے ہیں کہ ان میں ظاہری شکل وصورت میں بچہ کس کے مناسب ہوگا، اسی طرح زائچہ سامنے ہو جاتا ہے۔

اور یہ نجوم کا حال ہے، شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ کہانت جس کی بہت سی قسمیں ہیں، جن میں کبھی جن اور ارواح کو حاضر کیا جاتا ہے، (یعنی موجودہ زمانہ کا اس پر ولیوجزم) نیز توجہ کو کسی خاص نقطہ پر مرکوز کر کے معمول کو متاثر کرنا، جسے اب ''مسمریزم'' کہتے ہیں، شاہ صاحب لکھتے ہیں:

ہمت بستن بر کارے وبشکل مہیب برآمدن ودل بہ دل کے داشتن وطالب را مسخر کردن ہمہ از فنون نیرنج است۔

کسی کام کے متعلق ہمت کو قوی کرنا اور ڈراؤنی شکل میں لوگوں کے سامنے اپنے کو نمایاں کرنا کسی کے دل پر دل رکھنا اور طالب کو مسخر کرنا، یہ ساری باتیں ''علم نیرنگ'' سے تعلق رکھتی ہیں۔
لیکن غلط تصوف نے عوام کو باور کرایا تھا کہ یہ ساری باتیں قرب الٰہی کے دلائل ہیں۔



حضرت شیخ الہندؒ کے درس میں

علامہ مناظر احسن گیلانیؒ

چاہئے تو یہی تھا کہ صدر دار العلوم اور رئیس الاساتذہ ہونے کی حیثیت سے جس کے ذکرِ جمیل کو اب حوالہ قلم کر رہا ہوں، سب سے پہلے ان ہی کا تذکرہ کرتا۔ میری مراد سے ''شیخنا وشیخ الکل''، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی (طاب ثراہ وجعل الجنۃ مثواہ) کی ذاتِ گرامی ہے۔

لیکن بزرگوں کے متعلق پیمائش اور فیتہ بازی کے شغل نا محمود سے فطرۃً نہ میرے دماغ ہی کو کبھی کسی قسم کا تعلق رہا اور نہ دل کو ناپنا اور ناپ ناپ کر بزرگوں کی نمبر اندازی، کسی کو اول، کسی کو دوم، کسی کو سوم نمبروں کا مستحق ٹھہرانا، یہاں تو بلندی کی آخری سطح تک اس جرأتِ بے جا کی اپنے اندر ہمت ہی نہیں پاتا، سب اپنے بزرگ ہیں، سب ہم سے بہتر و برتر، سب بڑے اور اونچے ہیں، رہا اپنے پیدا کرنے والے خالق تعالیٰ سبحانہ کے نزدیک ان کی لاہوتی مقامات ومراتب، سو ظاہر ہے کہ جب کلمۃ اللہ وروح منہ حضرت مسیح علیہ السلام تک کا یہ اعتراف قرآن میں نقل کیا گیا ہے کہ اپنے خالق کردگار کو خطاب کر کے عرض کریں:

﴿تعلم مافی نفسی ولا اعلم مافی نفسک﴾ (المائدۃ)

''جو کچھ میرے جی میں ہے، اسے تو جانتا ہے اور جو کچھ تیرے جی میں ہے، وہ میں نہیں جانتا''۔

تو آپ ہی بتائیے کہ ایک ظلوم وجہول میں اس فیصلے کی جرأت کیسے پیدا ہو سکتی ہے کہ حق تعالیٰ کے ہاں احترام وتقرب میں کس کا درجہ کیا ہے؟ یہ تو ''مافی نفسک'' کے علم کے جہاں تک میں سمجھتا ہوں ایک بے بنیاد ادعاء کے سوا شاید اور کچھ نہیں، بقولِ شخصے

جگر ان کا ہے، جو تجھ کو صنم سے یاد کرتے ہیں
میاں ہم تو مسلماں ہیں خدا کہنے سے ڈرتے ہیں

کچھ بھی ہو فقیر نے اپنے بیان میں تاثیر وتاثر کی ترتیب کو چونکہ پیش نظر رکھا ہے، پہلے

بھی مختلف پیرایوں میں عرض کر چکا ہوں کہ دارالعلوم دیوبند کے حلقۂ تدریس میں شریک ہونے کے بعد سب سے پہلے یہ واقعہ ہے کہ اپنا دل حضرت شاہ صاحبؒ کی ہی ذات سے متاثر ہوا تھا، اس لئے قدرۃً اس سلسلے میں ان ہی ذکر کو مقدم کرنا پڑا۔

شاہ صاحبؒ کے بعد دوسری ہستی سے متاثر ہونا کیا معنی؟ واقعہ یہ ہے کہ جس سے تاثر کے بعد اور کچھ ہوا ہو، یا نہیں، لیکن جو کچھ پہلے تھا، اس تاثر جدید کے بعد قطعاً وہ باقی نہ رہا۔

داستانِ انقلاب

اب انقلاب کی اس داستان کو سنئے، دل پر یہ افتاد جس زمانے میں پڑی تھی اور جس حادثہ کی شکار یہ جانِ حزین ہوئی، اس وقت بھی یاد آتا ہے کہ مولانا حالی مرحوم کی ''مسدس'' کے مقدمہ والا مشہور شعر۔

آن دل کہ دم نمودے، از خوب رو جواناں
دیرینہ سال پیرے بردہ بیک نگاہے

زبان پر جاری تھا اور اب بھی جب خیال آجاتا ہے، تو بے ساختہ حافظہ میں یہی شعر تازہ ہو جاتا ہے، شاید پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ دارالعلوم دیوبند کے تعلیمی رشتہ میں منسلک ہو جانے کے بعد خاکسار چند مہینوں تک دارالعلوم کے اساتذہ سے بے گانہ اور نا آشنا ہی رہا۔ ان استادوں میں حضرت شیخ الہندؒ بھی تھے، پڑھنے کی حد تک تو طلبہ کے ساتھ ان کے حلقہ درس میں دوسروں کی طرح فقیر بھی بیٹھ جاتا تھا، لیکن براہِ راست ذاتی نیازمندی کا موقع اب تک میسّر نہیں آیا، اپنی اس محرومی کے اسباب کیا عرض کروں، خیر آبادی رجحانات کا کچھ دباؤ کہئے اور کچھ یہ خیال کہ دارالعلوم میں لال پیلے، ہرے، رنگ برنگ کے طلباء مختلف صوبہ جات، ہند کے مختلف اقالیم کے کیڑے مکوڑوں کی طرح پھیلے ہوئے ہیں، کوئی وجہ نہ تھی کہ اپنے آپ کو انہیں کیڑوں میں سے کوئی ناپرسان کیڑا اور گمنام مکوڑا خیال نہ کرتا، کوئی امتیازی بات اپنے اندر ایسی نظر نہ آئی کہ ان بزرگوں سے ذاتی تعارف کی ہوس دل میں پیدا ہوتی۔ الغرض کچھ اس قسم کے ملے جلے اسباب ومؤثرات تھے، جنہوں نے کئی مہینوں تک حضرت شیخ الہندؒ سے میرے تعلقات کو درس کے عام حلقے تک ہی محدود

رکھا۔ دستور بس یہی تھا کہ کتاب یعنی ''ترمذی شریف'' کا جو نسخہ مدرسہ سے عاریتاً پڑھنے کی لیے ملا تھا، بغل میں دبائے طلبہ کے ساتھ نودرہ کے شمالی سمت کی طرف بالا خانہ پر جو ایک وسیع وعریض کمرہ تھا، اسی میں حضرت شیخ الہندؒ بھی پڑھاتے تھے اور شاہ صاحبؒ بھی، بس اسی کمرہ میں حاضر ہو کر طلباء کے حلقہ میں کسی جگہ بیٹھ جاتا، زیادہ تر پچھلی صفوں میں ہی میرے لئے جگہ نکلتی، دوسرے طلباء پہلی صفوں میں قبضہ کر لیتے، اسی لئے جہاں تک میرا خیال تھا، حضرت شیخ الہندؒ کی نظر بھی اس فقیر پر نہ پڑی ہوگی، البتہ کبھی کبھی کوئی ضروری بات دریافت کر لیا کرتا تھا، ممکن ہے اس کی وجہ سے خطاب کا موقعہ حضرت والا کو مل جاتا ہو، لیکن اسی پچاسی طلباء کی بھیڑ میں اس کی توقع کہ سوال وجواب اور وہ بھی معمولی طالب علمانہ انداز کے، ذاتی تعارف کا ذریعہ بن جائیں گے، یقیناً بے بنیاد ہی ہو سکتی ہے بہر حال یوں ہی دن گزرتے رہے۔

حضرت شیخ الہندؒ کا درس

حضرت شیخ الہندؒ کی شان، شاہ صاحبؒ کے درس سے مختلف تھی، حضرت شیخ الہندؒ دوہرا اوڑھے ہوئے اگر سرما کا موسم ہوتا اور شاید درس جس زمانے میں شروع ہوا تھا، جاڑوں ہی کا زمانہ تھا، سر پر دوپلی ٹوپی، بدن پر کھادی کا لمبا کرتا، کھادی ہی کا پائجامہ، اسی لباس میں ہاتھ میں لٹھیا لئے ہوئے زینہ سے تشریف لاتے، درس کے کمرے میں ایک گدّا جو لچکدار تاروں سے خاص طور پر اسی لئے بنایا گیا تھا کہ بواسیر کے مسوں کی وجہ سے عام قسم کے گدے پر آپ کو تکلیف ہوتی تھی، اسی گدّے پر بیٹھ جاتے تھے، دوہرے کے اندر محسوس ہوتا تھا کہ ان کی انگلیاں تسبیح کے دانوں کو پھیرنے میں مصروف ہیں، طالب علم حدیث پڑھتا جاتا اور آپ سنتے جاتے، دورۂ میں ترجمہ بزبان اردو کا قصہ ختم ہو جاتا تھا، اس لئے کہ ''مشکوٰۃ'' میں حدیث کا متن طلباء پہلے پڑھ چکے تھے، کہا جاتا ہے کہ دورۂ میں شریک ہونے والے طلباء ترجمہ کی ضرورت سے بے نیاز ہو جاتے تھے، اسی لئے بطور ''سرد'' کے ایک حدیث کے بعد دوسری حدیث، دوسری کے بعد تیسری حدیث گزرتی چلی جاتی، لیکن کبھی کبھی ''ہاں چلئے'' کے سوا حضرت شیخ الہندؒ کی زبان مبارک پر بمشکل کوئی لفظ آتا، گویا قطعی

ایک خاموش درس تھا، جب کوئی ایسی حدیث آجاتی جو بظاہر مفہوم کے لحاظ سے قطعی طور پر حنفی مذہب کے خلاف ہوتی اور پڑھنے والا طالب علم خود رُک کر دریافت کرتا، یا دوسرے طلباء پوچھتے کہ حضرت یہ حدیث تو امام ابوحنیفہؒ کے قطعاً خلاف ہے، جواب میں مسکراتے ہوئے بے ساختہ حضرت شیخ الہندؒ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ نکلتے ''خلاف تو ہے بھائی !میں کیا کروں؟ ہاں آگے چلیئے'' طالب علم عرض کرتا کہ حضرت آخر امام صاحبؒ کی طرف سے کوئی جواب اس کا دیا گیا ہے؟ تمہاری کتابوں میں کچھ لکھا ہوگا، پڑھ لینا، یہ جواب دے کر ٹال دیا جاتا، طالب علم مصر ہوتا کہ آپ اپنا خیال ظاہر کیجئے، فرماتے طلباء کا اصرار جب حد سے تجاوز کر جاتا، تب نہایت مجمل الفاظ میں کچھ اجمالی اشارات فرمادیتے، اس وقت ان اشاروں کی اہمیت محسوس نہ ہوتی تھی، لیکن کم از کم فقیر اپنی حس تک یہ کہہ سکتا ہے کہ زندگی میں بعد کو پڑھنے پڑھانے، لکھنے لکھانے کے طویل مواقع جو ملے، بغیر مبالغہ کے عرض کر رہا ہوں کہ شیخ الہندؒ کے ان اجمالی اشاروں کا وزن روز بروز دل میں کم ہونے کے بجائے بڑھتا ہی چلا گیا، ایک نہیں، خلافیات کے سلسلے میں بیسیوں مسائل میں آخری تحقیقی بات وہی ثابت ہوئی، جن کی طرف حضرت شیخ الہندؒ اجمالی اشارے فرمادیا کرتے تھے، خام علم والے طلباء پر ان پختہ باتوں کا اثر ابتداء میں کم ہوتا، وہ پھر اعتراض کرتے، حضرت شیخ الہندؒ کچھ زیادہ گہرے ہوجاتے اور یوں آہستہ آہستہ طالب علموں کو فکر و تحقیق کا خاص طریقے سے وہ عادی بناتے، لیکن باہر سے دیکھنے والا حضرت شیخ الہندؒ کے اس سیدھے سادھے طریقۂ درس سے اگر متاثر نہ ہوتا، تو جو رنگ تھا، ظاہرِ اقتضاء اس کا یہی ہوسکتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ کمال بے نفسی کے بغیر اس قسم کے درس کی ہمت عام مدرسوں میں شاید پیدا نہیں ہوسکتی، اس مناظراتی طریقۂ تدریس نے آخر کار مجھے اس فیصلہ تک پہنچادیا کہ پیر سال خوردہ حد سے زیادہ ثاقب ذہن کا مالک ہے۔ ان کی غیر معمولی وقّاد فطرت کا اندازہ بتدریج ہوتا رہا، لیکن پھر بھی ذاتی تعارف کی صورت پیدا نہ ہوسکی، لیکن اب خجالت مانع آجاتی ہے، خیال آتا ہے کہ اتنے دنوں سے حضرت سے مستفید ہورہا ہوں اور ملاقات کی توفیق نہ ہوئی، اب کس منہ سے سامنا کروں؟

ایک عجیب ہولناک کیفیت

انہی حالات میں تھا کہ اچانک میرے اندر ایک کیفیت شروع ہوگئی، عجیب کیفیت خصوصیت کے ساتھ زیادہ تر یہ کیفیت شیخ الہندؒ کے حلقۂ درس میں جہاں تک یاد آتا ہے، زیادہ شدت پذیر ہو جاتی۔ اس وقت تو اس کے ذکر سے بھی جی گھبراتا ہے، لیکن جب واقعات ہی لکھنے پر آمادہ ہوگیا ہوں، تو اس کا تذکرہ کیسے نہ کروں؟

ہونے یہ لگا کہ جوں ہی حدیث شروع ہوتی، اپنے ذہن میں الجھنوں کے طوفان کو پاتا، طرح طرح کے شبہات ہر حدیث میں ہوتے، یہ شبہے طالب علمانہ، یا مولویانہ نہ تھے، بلکہ مصیبت یہ تھی کہ ذات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہے۔ (العیاذ باللہ) ان خبیث اور گندے وساوس اور خیالات کا عموماً تعلق ہوتا، بدگمانیوں کی ایک آگ تھی، جو معلوم ہوتا تھا کہ میرے باطن میں بھڑک اٹھی ہے، دو گھنٹے تک عموماً ترمذی شریف کا یہ درس مسلسل جاری رہتا اور ایک سیاہ کار، سیاہ سینہ ان دو گھنٹوں کے اندر ان ہی شکوک وشبہات کی آتشیں لہروں میں جلتا بھنتا رہتا، ہر حدیث میرے لئے بدگمانی اور سوءِ ظن کا چقماق گویا بنتی چلی جاتی، دماغ صرف ہرزہ اندیشیوں اور یاوہ بافیوں کا کارخانہ بنا ہوا تھا، درس سے فارغ ہوکر جب اپنی فرودگاہ ہجرۂ قبر یہ میں آتا، تو تنہائی میں دیر تک اپنے نفس، دل ودماغ کے ان عجیب وغریب آثار کو سوچ سوچ کر کیا عرض کروں کہ کس طرح گھلتا چلا جاتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ قدیم فلسفہ کے ساتھ اخباروں اور رسالوں کے ذریعے موجودہ الحادی رجحانات سے گونہ واقف ہونے کے مواقع مجھے ضرور ملے تھے، لیکن بحمد اللہ ایسا منحوس وقت جہاں تک یاد پڑتا ہے، کبھی نہیں گزرا تھا کہ دین کی آخری بنیاد رسالت محمدیہ علی صاحبہا الف سلام وتحیۃ کے متعلق شک وشبہ کا کوئی کانٹا دل میں کبھی کھٹکا، چبھا ہو اور یہی پاک رشتہ ایمانی حدود سے بہرحال اپنی سیاہ کاریوں اور بداعمالیوں کے باوجود دور ہونے نہیں دیتا تھا، لیکن دل ودماغ پر اب جو دورہ پڑا تھا، محسوس ہو رہا تھا کہ دین کی مرکزی چٹان ہی سے پاؤں (العیاذ باللہ) پھسل رہا ہے، اُف! اس تاریکی اور اندھیری کا اب جب خیال آتا ہے، تو کانپ اٹھتا ہوں، گھبرا گھبرا کر کبھی تن تنہا جنگلوں اور کھیتوں کی طرف نکل جاتا، غلطاں

وپیچاں انہیں خیالات ووساوس میں ٹہلتا رہتا، باتیں ایسی تھیں کہ کسی سے ذکر کر کے دل کی بھڑاس بھی نہیں نکال سکتا تھا، گویا کہ ایک اندرونی آگ لگی ہوئی تھی، جس میں کروٹیں لیتا رہتا، خفقان اور دورے کی شدت روز بروز بڑھتی ہی چلی جاتی تھی، نمازوں میں سوچتا تو یہی سوچتا، دُعائیں یہی کرتا کہ اے پروردگار! یہ کیا حال ہے؟ میں دین کو درست کرنے کے لیے دارالعلوم میں حاضر ہوا تھا، لیکن بچا کھچا جو سرمایہ دین وایماں کا تھا، میرا الٹا چلا جاتا ہے، میں تو کہیں کا نہ رہا، یاد پڑتا ہے کہ کبھی کبھی تنہائی میں چیخ بھی نکل جاتی تھی، ایسا معلوم ہوتا کہ پیدا کرنے والے نے مجھے شاید پیدا ہی جہنم کے لیے کیا تھا، حالت جب خد سے زیادہ زبون ہونے لگی، تب ایک یہ خیال بھی سامنے آنے لگا کہ میں دارالعلوم کو چھوڑ کر چلا جاؤں، متعدد بار یہ فیصلہ دماغ میں آیا، لیکن فیصلہ نے فیصلہ کی صورت اختیار نہ کی۔

قدرتی دستگیری

بہر حال اسی زمانے میں ایک قدرتی دستگیری کی شکل سامنے آئی، جماعت دیوبند کے ایک امی رکن مشہور شخصیت حضرت امیر شاہ نور اللہ مرقدہ "مینڈھو" جہاں ان کا مستقل قیام تھا، وہیں سے اپنے دستور کے مطابق دارالعلوم میں اسی عرصہ میں تشریف فرما ہوئے، رات کو ایک دن مولانا مرتضیٰ حسن مرحوم کے بھتیجے "مولوی محمد حسن چاندپوری" جوا س زمانے میں ایک جوان رعنا تھے اور تازہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد بحیثیت معین المدرسین کے دارالعلوم کے تحتانی کلاسوں کی تعلیم کی خدمت انجام دیتے تھے، ہم عمری کی وجہ سے مولوی محمد حسن سے کافی رسم وراہ پیدا ہوگئی تھی، ان کو آریوں، عیسائیوں وغیرہ کی مناظرہ بازی کا شوق تھا، جس سے تھوڑی بہت دلچسپی اس زمانے میں فقیر کو بھی تھی، نودرہ میں مناظرہ کی مشقی مجلسیں جمعہ کی راتوں کو عموماً ہوا کرتی تھیں، مولانا مرتضیٰ حسن صاحب مرحوم صدارت اور حکم ہونے کے فرائض عموماً انجام دیتے تھے۔ مناظرہ کا ایک فریق مولانا محمد حسن کے مقابلہ میں عموماً فقیر ہی ہوا کرتا تھا۔ الغرض مختلف وجوہ سے ان کے کمرے میں میری بیٹھک رہتی تھی، یاد پڑتا ہے کہ مغرب کے بعد ایک دن ان کے حجرے میں کسی مسئلہ پر بلند آواز سے کچھ بکواس کر رہا تھا، میری آواز نے "امیر شاہ خان" کو متوجہ

کیا اور حجرے سے باہر ٹھٹھک کر دیر تک میری باتیں سنتے رہے اور پھر چلے گئے، دوسرے دن دریافت کیا کہ یہ نئے طالب علم کون ہیں، جو رات کو باتیں کر رہے تھے؟ لوگوں نے پتہ بتلایا، اب یاد نہیں ہے کہ مجھے بلوایا، یا میرے حجرے میں خود قدم فرما ہوئے، بڑی شفقت سے ملے، پھر پوچھنے لگے تم۔نے کہاں کہاں پڑھا ہے؟ اور کیا کیا پڑھا ہے؟ جو واقعہ تھا، عرض کر دیا گیا۔ چند ہی دنوں میں ان کی خصوصی توجہات کا مرکز بن گیا، بڑے پتے کی باتیں ان سے معلوم ہوتی تھیں، لیکن میرے دل کی آگ کا پانی ان کے پاس بھی نہ تھا، جب ان سے اُنس اتنا زیادہ بڑھ گیا، تو جن خیالات و کیفیات میں الٹ پلٹ رہا تھا، آخر پریشان ہوکر ایک دن تنہائی میں امیر شاہ کی خدمت میں انتہائی بے کسی کے ساتھ اپنی ذہنی آوارگی کی روداد سنا ہی دی۔

پندِ پیر دانا

اس سرد و گرم چشیدہ پیر دانا نے غور سے میرے درد کی داستان سنی، سب کچھ سن لینے کے بعد بولے کہ اپنے ان خیالات کا تذکرہ اپنے استاذ مولوی محمود حسن سے کیوں نہیں کرتے؟ میں نے آبدیدہ ہوکر عرض کیا کہ میری کور بختی نے ان کے دربار تک پہنچنے کا موقع میرے لئے باقی نہیں رکھا ہے۔ مجھے شرم آتی ہے کہ اتنے دن دیوبند میں گزر گئے اور حضرت کی خدمت میں حاضری کی توفیق میسر نہ آئی، اب سامنا کرتے ہوئے خجالت و ندامت محسوس ہوتی ہے۔ خاں صاحب نے اس پر تسلی و تشفی کے کلمات فرماتے ہوئے کہا کہ میں تم کو مولوی صاحب کی خدمت میں لے چلوں گا، ان سے ضرور ملو اور جو حال ہے، اس کو ان پر پیش کرو، وقت مقرر ہو گیا۔

حضرت شیخ الہندؒ کی خدمت میں حاضری

شاید عصر کے بعد کسی دن امیر شاہ خاں صاحب مرحوم اپنے ساتھ لے کر حضرت والا کی خدمت میں حاضر ہوئے، بان کے ایک پلنگ پر تشریف فرما تھے، سلام کیا، مصافحہ کا شرف حاصل ہوا، تب امیر شاہ خاںؒ نے فرمایا کہ یہ آپ کے شاگرد ہیں، دورۂ کے طالب علم ہیں، آپ کی خدمت میں کچھ عرض کرنے کے لیے حاضر ہوئے ہیں، ان سے یہ سن کر

حضرت نے فقیر کی طرف خطاب کر کے فرمایا: ''آپ تو حدیث کے درس میں آتے ہیں''۔ یہ پہلا فقرہ تھا جس سے معلوم ہوا کہ کم از کم حضرت والا کے لیے جیسا کہ میں سمجھے ہوئے تھا، یہ غریب قطعاً مجہول المطلق ہونے کی حیثیت تو نہیں رکھتا، اتنا بہر حال وہ بھی جانتے ہیں کہ ان کے حلقۂ درس کا ایک طالب علم میں بھی ہوں، پھر فرمایا کہ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟ شاید اس وقت خلوت کی درخواست میری طرف سے پیش ہوئی، جو منظور ہوگئی اور غالباً برآمدے کے بعد جو ہال حضرت کی نشست گاہ میں ہے، وہاں تشریف لے گئے اور جب کوئی نہ تھا، شاید امیر شاہ خاں صاحب بھی نہیں، تو بھرائی ہوئی آواز میں دُکھ کا افسانہ شروع کر دیا گیا، جو دل پر گزرتی ہی تھی، بے کم وکاست عرض کرتا گیا، سنتے رہے، خاموشی کے ساتھ سنتے رہے، داستان جو ختم ہوئی، تو وہی بات جواب تک زیادہ لمبی اور طویل نظر آتی تھی، شیطان کی آنت سے بھی زیادہ طویل، صرف ایک فقرے سے سکڑ گئی اور ہمیشہ کے لیے سکڑ گئی، ارشاد ہوا: مولوی صاحب آپ اتنے پریشان کیوں ہیں؟ اپنا یہ حال جب آپ کے لیے اتنا ناگوار ہے، تو یہ بے ایمانی کی نہیں، بلکہ آپ کے ایمان کی دلیل ہے۔ ایمان نہ ہوتا، تو ان حالات میں آپ اتنا پریشان ہی کیوں ہوتے؟ بعد کو یہ مضمون خود نبوت کے ارشادات میں بھی ملا، لیکن پہلی دفعہ حضرت شیخ الہندؒ کی زبان مبارک سے اس طرح نکلے کہ دل میں معلوم ہوتا تھا کہ کچھ تھا ہی نہیں، طمانیت اور بشاشت کی لہریں میرے چہرے پر کھیلنے لگیں، یہ دیکھ کر تب ارشاد ہوا کہ آپ نے کہاں کہاں اور کیا کیا پڑھا ہے؟ اپنی تعلیمی روداد سنا دی، زیادہ وقت قدیم فلسفہ اور منطق کے پڑھنے میں صرف ہوا تھا۔ یہ معلوم کر کے فرمانے لگے، جو کچھ آپ کچا پکا نگلتے چلے گئے ہیں، اب وہی کچھ باہر نکل رہا ہے، پریشان ہونے کی بات نہیں ہے۔ شاید بے اختیار گریہ کے ساتھ عرض رسا ہوا کہ حضرت میرے لئے خواہ جو کچھ بھی ہو، اب یہ حالت ناقابل برداشت ہے، میرے لئے اس قسم کے وساوس واوہام کسی حیثیت سے بھی ہوں ناقابل تحمل ہیں، میری زندگی خطرے میں ہے۔

زندہ کرامت

اب خواہ دُنیا مانے، یا نہ مانے، لیکن اپنے ذاتی تجربے کا میں کیا کروں؟ جواب میں

فرمایا گیا مولوی صاحب! جاؤ اب کوئی شبہ اور کسی قسم کا شک تم کو نہ ہوگا۔ یہ، یا اسی کے ہم معنی الفاظ تھے، آج سے تقریباً چالیس سال پہلے اللہ کے ایک برگزیدہ بندے کی مبارک زبان سے یہ بات نکلی۔ خاکسار، اس کا دماغ، اس کا دل، اس کی زندہ شہادت ہے کہ اس طویل عرصہ میں بحمد اللہ پھر کسی قرآنی آیت، یا کسی نصِ نبوی ﷺ میں کسی قسم کا کوئی شبہ اب تک تو پیدا نہیں ہوا، عموماً یہی ہوتا ہے کہ کوئی ایسی چیز سامنے آتی بھی، تو معاً اس کے حل کے مختلف پہلو دماغ میں آجاتے ہیں اور یہ نہ ہوا، تو اجمالاً ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کا جواب موجود ہے، خواہ اس کی تفصیل کی قدرت اس وقت سر دست نہ پائی جاتی، ہو گویا کہ کوئی کیل ٹھونک دی گئی ہو کہ وہی دل جو لرزاں اور تپاں رہتا تھا، کچھ ایسا بیٹھ گیا کہ خواہ کچھ بھی گزرے، وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلتا۔ اسی لئے سیدنا حضرت شیخ الہندؒ کی ایک زندہ کرامت خود اپنے آپ کو، اپنے دل و دماغ کے، اپنے ذہنی رجحانات و میلانات کو سمجھتا ہوں۔ میں کیا تھا اور کیا ہو گیا؟ بعد کو حالات نے مجھ کو جو کچھ بھی بنا دیا ہو، لیکن اس وقت جو صورت پیش آئی تھی، کہہ سکتا تھا:

ذرہ بودیم آفتاب شودیم
سنگ خارا بودیم آب شدیم

ذاتی تعارف کا بند دروازہ اس کے بعد حضرت شیخ الہندؒ سے بھی کھل گیا اور علاوہ درسگاہ کے حضرت والا کی خانگی صحبتوں میں شرکت کی سعادت بھی اس کے بعد بحمد اللہ میسر آنے لگی۔

حضرت شیخ الہندؒ کا ارشاد مبارک، یعنی: "جاؤ، اب کسی قسم کا وسوسہ نہیں ہوگا" تقریباً چالیس سال پہلے کی بات ہے، صحیح الفاظ یہی تھے، یا اس کے قریب قریب لیکن مقصد و مفہوم یہی تھا، وہ دن تھا اور آج کا دن ہے، اس عرصہ میں کہاں کہاں جانا پڑا، کن کن محفلوں میں شریک ہونے کے مواقع پیش آتے رہے، کیا کیا نہیں سنا، کیا کیا نہیں پڑھا، اونچوں سے بھی ملا اور نیچوں سے بھی میل ملاپ رہا، بگڑے ہوؤں سے مڈبھیڑ ہوئی، سلجھے ہوؤں سے بھی ربط ضبط رہا، لیکن ان کی" یہ کرامت اب تک زندہ ہے کہ وساوس وخطرات کے سوا جس کے اندر شاید کچھ نہ تھا، کم از کم اسلامی دین کے عقائد و اعمال، قرآنی

آیات اور محمد ﷺ کی رسالت ونبوت کی حدتک ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دل بھی وہی قرآن وحدیث پڑھتا تھا، مگر وسوسوں کی چنگاریوں کے ساتھ پڑھتا تھا اور وہی قرآن اب بھی پڑھتا ہوں، حدیثیں بھی نظر سے گزرتی رہتی ہیں، لیکن بیان کر سکے، یا نہ کر سکے، تاہم محسوس اس کو یہی ہوتا ہے کہ جو کچھ کہا گیا، اس کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

اس اعجازی اثر کے ساتھ حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہ وجزاہ عنا خیر الجزاء کی مجلس مبارک سے واپس ہوا۔

بدلا ہوا رنگ

دوسرے دن حلقۂ درس میں حسب دستور حاضر ہوا، حاضری کا یہ رنگ گذشتہ حاضریوں کے رنگ سے مختلف تھا، ہر نیا دن اس کے بعد جو آتا جاتا تھا، اس میں یہ بدلا ہوا رنگ پختہ سے پختہ تر ہونے لگا، اب ان کی ہر بات کانوں سے گزرتی، دل میں بیٹھی چلی جاتی تھی، درس میں جیسا کہ عرض کر چکا ہوں حضرت والا اپنی طرف سے بہت کم کہا کرتے تھے، طالب علم ہی جب پوچھتا اور پوچھنے میں اصرار کی حدتک اس کا استفساری لہجہ پہنچ جاتا، تب جواب دیا کرتے اور اس میں بھی مناظرہ کا عادی طلباء کو بنایا جاتا، اب سمجھ میں آتا کہ طالب علم خود ہی اپنے سوال کو حل کرے، بحث کے اس طریقے سے چاہا جاتا تھا کہ اس کا ملکہ اور سلیقہ اس میں خود پیدا ہو، خود فکر کا عادی ہو۔ خلافیات میں چالیس برس گزرنے کے بعد سوال وجواب کے وہ سلسلے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب تک دل ودماغ میں تروتازہ ہیں، ان کی بتائی ہوئی باتیں اور ان کے سکھائے ہوئے پینترے اپنی آئندہ تعلیمی وتدریسی زندگی میں ہمیشہ دستگیری کرتے رہے، علاوہ تمام مسائل مباحث کے کبھی کبھی ایسے عمیق نکتے سننے میں آجاتے تھے کہ آج بھی ان کو سوچ کر سر دھنتا ہوں۔

محبت نبوی ﷺ میں نفسانیت

بخاری شریف کا سبق ہو رہا تھا، مشہور حدیث گزری کہ: ((لا یؤمن احدکم حتیٰ اکون احب الیہ من والدہ وولدہ والناس اجمعین)). " کوئی شخص اس وقت تک مؤمن نہیں ہوسکتا، جب تک میں اس کے والد اس کی اولاد اور تمام لوگوں سے بڑھ کر اس

کے نزدیک محبوب نہ ہو جاؤں''۔(بخاری ، کتاب الایمان) فقیر ہی نے عرض کیا کہ بحمداللہ عام مسلمان بھی سرکار کائنات ﷺ کے متعلق محبت کی اس دولت سے سرفراز ہیں، جس کی دلیل یہ ہے کہ ماں باپ کی توہین کو تو مسلمان ایک حد تک برداشت کر لیتا ہے، زیادہ سے زیادہ گالیوں کے جواب میں وہ بھی گالیوں پر اتر آتا ہے، لیکن رسالتِ مآب ﷺ کی ہلکی سی سبکی بھی مسلمانوں کو اس حد تک مشتعل کر دیتی ہے کہ ہوش وحواس کھو بیٹھتے ہیں، آئے دن کا مشاہدہ ہے کہ لوگ جان پر کھیل گئے۔اس پر حضرتؒ نے فرمایا کہ بے شک ہوتا یہی ہے، جو تم نے کہا، لیکن ایسا کیوں ہوتا ہے؟ تہہ تک تمہاری نظر نہیں پہنچی، محبت کا اقتضا یہ ہے کہ محبوب کی مرضی کے آگے ہر چیز قربان کی جائے، لیکن عام مسلمانوں کا جو برتاؤ آنحضرت ﷺ کی مرضی مبارک کے ساتھ ہے، وہ بھی ہمارے تمہارے سامنے ہے، پیغمبر ﷺ نے ہم سے کیا کہا تھا اور ہم کیا کر رہے ہیں، اس سے کون ناواقف ہے؟ پھر سبکی آپ کی جو مسلمانوں کے لیے ناقابل برداشت بن جاتی ہے، اس کی وجہ سے محبت تو نہیں ہو سکتی۔خاکسار نے عرض کیا، تو آپ ہی فرمائیں کہ اس کی صحیح وجہ کیا ہے؟

نفسیات انسانی کے اس مبصر حاذق نے فرمایا کہ سوچو گے، تو درحقیقت آنحضرت ﷺ کی سبکی میں اپنی سبکی کا غیر شعوری احساس پوشیدہ ہوتا ہے، مسلمانوں کی خودی اور انانیت مجروح ہوتی ہے، ہم جسے اپنا پیغمبر اور رسول مانتے ہیں، تم اس کی اہانت نہیں کر سکتے، چوٹ درحقیقت اپنی اسی ''ہم'' پر پڑتی ہے، لیکن مغالطہ ہوتا ہے کہ پیغمبر ﷺ کی محبت نے ان کو انتقام پر آمادہ کیا ہے، نفس کا یہ دھوکہ ہے، اپنی جگہ ٹھنڈے دل سے جو غور کرے گا، اپنے طرزِ عمل کے تناقض کے اس نتیجے تک پہنچ سکتا ہے، بہرحال محبوب کی مرضی کی جسے پروانہ ہو ، اذان ہو رہی ہے اور لایعنی اور لاحاصل گپوں سے بھی جو اپنے آپ کو جدا کر کے مؤذن کی پکار پر نہیں دوڑتا، اسے انصاف سے کام لینا چاہئے کہ محبت کا دعویٰ اس کے منہ پر کس حد تک پھبتا ہے۔

(ماہنامہ الحسن، لاہور)

امام العصر علامہ سید انور شاہ کشمیریؒ کے درس میں

جب دار العلوم دیو بند میں دورۂ حدیث کے لیے داخلہ لیا، تو صحیح طور پر یاد نہیں رہا کہ ہفتہ، یا ہفتہ سے زیادہ دن گزرے کہ درس کا اعلان ہوا، معلوم ہوا کہ کل سے دورہ کے اسباق شروع ہوں گی، کتابیں جن کے اسباق شروع ہونے والے تھے، کتب خانہ سے برآمد کرلی گئی تھیں، صبح کی نماز کے بعد ہی معلوم ہوا کہ سب سے پہلے حضرت سیدنا الامام الکشمیری کے یہاں صحیح مسلم کا سبق شروع ہوگا، طلباء کا ہجوم تھا، انہی کے جھمیلے میں خاکسار بھی نودرہ کی چھت کے شمالی سمت پر جو ایک کمرہ تھا، اس میں حاضر ہوگیا، اتنی بڑی تعداد والی جماعت میں شریک ہوکر بیٹھنے کا یہ پہلا اتفاق تھا، خیال آتا ہے کہ صحیح مسلم کا اتفاقاً وہی نسخہ مجھے کتب خانہ سے ملا تھا، جو طول وعرض میں حدیث کی دوسری کتابوں کے مقابلہ میں غیر معمولی طور پر ممتاز تھا، لیکن کرتا کیا، اسی طویل وعریض کتاب کو لے کر کوٹھے پر چڑھ گیا، درس کے کمرے میں لکڑی کی چھوٹی چھوٹی تپائیاں رکھی ہوئی تھیں، طالب علموں نے انہیں تپائیوں پر قبضہ کر لیا، ایک تپائی میرے حصہ میں بھی آئی۔

خیال تھا کہ جیسے عام طور پر ہمارے مدارس کا دستور ہے، طلباء کتاب کی عبارت پڑھیں گے، اور حضرت شاہ صاحب پھر اس عبارت کا مطلب بتائیں گی، لیکن پہلی مرتبہ درس کے ایک نئے طریقے کے تجربہ کا موقع میرے لئے یہ تھا کہ بسم اللہ بھی کتاب کی شروع نہیں ہوئی تھی کہ علم کا ایک بحر بیکراں (بلا مبالغہ عرض کررہا ہوں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ) میرے دل ودماغ کے ساحلوں سے ٹکرانے لگا، ایسے اساتذہ (غفر اللہ لہم) سے پڑھنے کا موقع ملا تھا، جو کتاب کو شروع کراتے ہوئے غیر ضروری طور پر اس قسم کی عام باتوں کا تذکرہ عموماً کیا کرتے ہیں کہ مصنف نے خدا کی حمد سے کتاب کیوں شروع کی، اور اسی عام سوال کو اٹھا کر اس کا جو مقررہ جواب کتابوں میں لکھا ہے، لفظوں کے الٹ پھیر سے دہرانے کے عادی تھے، صلوٰۃ کی شرح، مختلف امور کی طرف اس لفظ کا انتساب، اس کے معانی میں کن تبدیلیوں کو پیدا کرتا ہے، الغرض مسلمان مصنفوں کی کتابوں کے دیباچہ کے عمومی اجزاء کے

متعلق سوال و جواب، ردوقدح کا موروثی سرمایہ، حواشی وشروح میں جو منتقل ہوتا چلا آرہا ہے، اسی کو غریب طالبعلموں پر پیش کر کے اپنی علمی وسعت کو ظاہر کرتے تھی، لیکن الامام الکشمیری نے قبل اس کے کہ کتاب کا کوئی لفظ بھی شروع ہوا ہو، ایک خاص قسم کی دلکش ترنم آمیز آواز میں تقریر شروع کی، کس کس موضوع سے اس تقریر کا تعلق تھا، تقریباً چالیس سال کے بعد اس کا دہرانا آسان نہیں ہے، لیکن بعض انقلابی تاثرات کا نشان حافظہ پر جہاں تک خیال کرتا ہوں، اب بھی باقی ہی۔

شاہ صاحب کے درس کے انقلابی تاثرات

جاننے والے جانتے ہیں کہ صحیح مسلم کی خصوصیت یہ ہے کہ بطور مقدمہ کے شروع کتاب میں امام مسلم نے حدیث کے بعض بنیادی کلیات اور اساسی اصول ونظریات کی طرف سیدھے سادھے الفاظ میں ایسے بلیغ وعمیق اشارے کئے ہیں، جن کے صحیح وزن کو فن سے ناواقف آدمی محسوس نہیں کرسکتا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ امام مسلم کے بعد یوں تو اصول حدیث میں بڑی چھوٹی بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں، لیکن باوجود اس کے امام مسلم کے مقدمہ میں اب بھی پانیوالے اس علم کے ایسے اہم نکات اور حقائق کو پاتے ہیں، یا پا سکتے ہیں، جو شاید دوسری کتابوں میں نہیں مل سکتی، حق تعالیٰ کے افضال بے پایاں میں ایک بڑا افضل اس شورہ بخت سیاہ کار کے ساتھ یہ بھی ہوا کہ حدیث ہی نہیں، بلکہ اصول حدیث کے ان چند اوراق کے پڑھنے ہی کا نہیں، بلکہ ان اوراق پر ایک امام کے عالمانہ خطبات کے سننے کا شرف اس بے بضاعت کے لئے آسان کیا گیا، پہلے ہی سبق میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ برسوں میں حاصل ہونے والے معلومات یکایک میرے سامنے آگئی، اس وقت تک میرا تاثر یہ تھا کہ قرآن کے سوا بجز گنی چنی روایتوں کے صاحبِ شریعت کی طرف قطعی یقین اور کامل اطمینان کے ساتھ کسی امر کا انتساب کیا جا سکتا، گویا دین کا اکثر حصہ صرف ظنی، اور یقین کی قوت سے محروم ہے، لیکن یہ پہلا دن تھا، جب میرے کانوں نے اسناد والے تواتر کے سوا، تواتر طبقہ، تواترِ عمل، تواترِ مشترک کی نئی قسموں کو سنا، سمجھایا گیا کہ چند روایتوں کے متعلق جس تواتر کا دعویٰ عام کتابوں میں کیا جاتا ہے، یہ دعویٰ صرف اسناد والے تواتر کی حد تک محدود ہے، ورنہ دین کا بڑا اہم حصہ

تواتر طبقہ، تواتر عمل اور تواتر قدر مشترک کی راہ سے منتقل ہوکر مسلمانوں کی پچھلی نسلوں میں اگلی نسلوں سے پہونچا ہے، اور تواتر کی ان تمام قسموں میں یقین آفرینی کی وہی نفسیاتی اور منطقی قوت ہے، جو قوت اسناد والے تواتر میں پائی جاتی ہے۔[1]

پہلا دن تھا جس میں قرآن کے بعد دین کا سارا بنیادی نظام میرے لئے قطعی و یقینی ہوگیا اور جیسے جیسے تمیز و شعور میں سن کے لحاظ سے اضافہ ہوا، بجائے گھٹنے کے میرا یہ تاثر گہرا ہوتا چلا گیا، خاکسار نے اپنی مختلف کتابوں اور مقالات میں امام کشمیری کی عطا کی ہوئی اس روشنی سے استفادہ کیا، مسلمانوں کے دینی اختلافات کی نوعیتوں میں تمیز کا سلیقہ اسی انوری تحقیق سے پیدا ہوا۔

نئی تعبیرات، نئے الفاظ

حضرت شاہ صاحب یوں تو فطرۃً ادیب تھے، اسی لئے اردو زبان جو ان کی مادری زبان نہ تھی، چاہتے تو اس زبان کے بہترین ادیب وخطیب کی شکل میں اپنے آپ کو نمایاں فرماسکتے تھے، لیکن مسلسل عربی کتابوں کے مطالعہ اور ادب عربی کی دوامی مزاولت کا اثر تھا کہ زبان مبارک پر عربی زبان کے الفاظ ہی زیادہ تر پڑھ گئے تھے، بلکہ طریقہ بیان بھی آپ کا عربی طرز بیان سے زیادہ متاثر تھا، اسی کا نتیجہ تھا کہ گو تعلیمی و تدریسی زبان آپ کی اردو تھی، لیکن عربی زبان کے ایسے الفاظ جو اردو میں عموماً مستعمل نہیں ہیں، اضطراراً آپ کی زبان مبارک سے مسلسل نکلتے رہتے تھے، تواتر کے مذکورہ بالا اقسام چہارگانہ کو بیان کرتے

---

[1]...... واقعہ یہ ہے کہ سند کی کثرت اور راویوں کے تعدد کی ضرورت عموماً انہی باتوں میں ہوتی ہے، جو روایات کی راہ سے منتقل ہوتی ہوں، لیکن (ایسی بات کہ شاہجہاں بادشاہ ہندوستان کا حکمران تھا، سکندر نے ہندوستان پر حملہ کیا تھا، اس قسم کے واقعات کے متعلق یہ تلاش کرنا کہ روایت کرنے والے ان کے کون ہیں، جنون کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اسی طرح اس قسم کی باتیں کہ مسلمانوں پر، مثلاً پانچ وقتوں کی نمازیں فرض ہیں، عرب میں الکعبہ نامی عمارت کا حج فرض ہے، سال میں رمضان کا مہینہ جب آئے، تو روزہ مسلمانوں کو رکھنا پڑتا ہے، یہ ایسی باتیں ہیں، جنہیں مسلمان ہی نہیں، جو مسلمان نہیں ہیں، ان کے نزدیک بھی اسلام کے یہ یقینی عناصر ہیں، یہی تواتر عمل کی مثالیں ہیں، اسی طرح حاتم کی سخاوت، رستم کی شجاعت کے جو قصے مشہور ہیں، ان قصوں کا یقینی ہونا ضروری نہیں، لیکن ان قصوں کے قدر مشترک کے ہونے میں کون شبہ کرسکتا ہے۔ حضرۃ الاستاد العثمانی مولانا شبیر احمد صاحب نے بھی صحیح مسلم میں تواتر کی ان قسموں کا ذکر کرکے اعتراف کیا ہے کہ پہلی دفعہ مولانا اور شاہ سے بات سننے میں آئی۔

ہوئے شاہ صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کی زبان مبارک سے پہلی دفعہ میں نے طبقہ بعد طبقہ کے عام الفاظ کے ساتھ جیلاً بعد جیل کے الفاظ سنے تھے، اس کی غرابت کا احساس اب بھی میرے حافظہ میں زندہ ہے، شاید اسی موقع پر ''الکافہ عن الکافہ'' یا ''الکواف عن الکواف'' ابن حزم کی مخصوص اصطلاح بھی سننے میں آئی۔

اسی قسم کے غیر مشہور، یا اردو زبان میں جو الفاظ عربی کے مروج نہ تھے، ان کے استعمال کرنے کی غرض ممکن ہے کہ یہ بھی ہو کہ عام مسلمانوں کو نہ سہی، لیکن عربی مدارس کے طلباء کا ان الفاظ سے مانوس ہونا، ان کی شان کے مناسب تھا اور شاہ صاحب شاید اس طریقہ سے طلباء کو ان عالمانہ اصطلاحات وتعبیرات سے مانوس بنانا بھی چاہتے تھے۔

مجھے یاد پڑتا ہے کہ ایک دفعہ شاہ صاحب نے ان غریب اصطلاحات کے استعمال کی توجیہ کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا تھا کہ بعض چیزیں دنیا میں ایسی ہیں، جن کا ذکر کنائے اور اشارے ہی میں کرنا، عام انسانی تہذیب کا اقتضاء ہے، پھر یہ نکتہ بھی ان ہی سے سننے میں آیا اور بالکل صحیح بات تھی کہ تراشنے والے ان چیزوں کی تعبیر کے لیے اچھے اچھے الفاظ تراش لیتے ہیں ''پائین خانہ'' مکان کے پچھلے حصے کو کہتے ہیں، پھر اس سے بیت الخلاء مراد لینے لگے، لیکن رفتہ رفتہ یہ لفظ پائخانہ کی شکل اختیار کر کے خود گندہ ہو گیا، فرماتے تھے کہ معانی کی گندگی رفتہ رفتہ الفاظ تک منتقل ہو کر پہونچ جاتی ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ تھوڑے تھوڑے دن بعد اس قسم کے الفاظ پر نظر ثانی کی جائے، اپنے اسی خیال کے مطابق عورتوں کے ایام کی تعبیر وہ ہمیشہ ''ایامِ طمث'' استعمال کرنے کے عادی تھے، کیونکہ ''حیض'' کا لفظ حالانکہ خود کنائی تعبیر ہے، لیکن کثرت استعمال نے اس کو بھی اس قابل نہیں رکھا کہ مہذب مجلسوں میں اس کے استعمال کو آئندہ جاری رکھا جائے۔

بہرحال پہلے دن کے درس میں علاوہ معانی کے نئے نئے عربی الفاظ کا ایک بڑا ذخیرہ میرے دماغ میں شاہ صاحب کے درس کے اندر جمع ہو گیا۔

زبان عربی میں ضبط تقریر

ان کے بیان کی خصوصیت کا ایک غیر شعوری اثر مجھ میں یہ پیدا ہو رہا تھا کہ عربی زبان میں اب تک کسی مطلب کے ادا کرنے کی ہمت مجھے نہ ہوئی تھی، لیکن سبق پڑھ کر جب قیام

گاہ پر آیا اور شاہ صاحب کے عطا کئے ہوئے گونا گوں معلومات کا جائزہ لینے لگا، تو یہ محسوس ہوا کہ اپنے کمزور حافظہ سے امید نہیں کہ ان بتائی ہوئی باتوں کو وہ یاد رکھے، اس لئے فیصلہ کیا کہ کل سے کاغذ پنسل ساتھ لیتا جاؤں گا اور ان کی تقریر کو قلم بند کروں گا اور آج جو کچھ سن کر آیا ہوں قبل اس کے کہ وہ مرے حافظہ سے نکل جائے، اسے لکھ لینا چاہئے۔ شاہ صاحب کی تقریر جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، اس کا اسلوب ہی ایسا تھا کہ بجائے اردو کے ان کے معلومات کا مجھے محسوس ہوا کہ عربی میں قلم بند کرنا شاید زیادہ آسان ہے، یہی سوچ کر جو کچھ آج سن کر آیا تھا، پنسل سے ان کو عربی عبارت میں نوٹ کرنے لگا اور پہلی دفعہ مجھے یہ اندازہ ہوا کہ غلط سلط سہی، لیکن ٹوٹی پھوٹی عربی میں مطالب کے قلم بند کرنے کا رواج نیا رواج نہ تھا، حضرت مولانا گنگوہی کی تقریر بعض لوگوں کے پاس مکتوبہ شکل میں پائی جاتی تھی، اسی طرح حضرت شیخ الہند کی بھی ترمذی والی تقریر متعدد بزرگوں کی مرتب کی ہوئی طلباء میں پھیلی ہوئی تھی، لیکن میں جہاں تک جانتا ہوں، حضرۃ الامام الکشمیری کی تقریروں کے قلمبند کرنے کا ارادہ شاید فقیر سے پہلے کسی صاحب نے نہ کیا تھا، یوں ہی عربی زبان میں حدیث کی تقریروں کی تعبیر کی روایت مجھ تک نہیں پہونچی تھی، خدا کا شکر ہے کہ اس فقیر کے بعد اس سے کہیں زیادہ لائق وفائق، قابل وفاضل، مستعد اور جفاکش محنتی طلبہ حضرت شاہ صاحب کے اردگرد جمع ہو گئے، جنہوں نے اپنی زندگی کا نصب العین ہی یہ قرار دیا کہ جس طرح بھی ممکن ہو، معارف انوریہ کے اس بحرِ بیکراں کو قیدِ تحریر میں لانے کی کوشش کی جائے۔ مولانا بدر عالم میرٹھی، اور مولانا محمد یوسف البنوری (متعنا الله بطولِ بقائهما) کے سوا پنجاب کے ایک بزرگ مولانا محمد چراغ جامع تقریر ترمذی، خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ان کے سوا سنن ابی داؤد اور ابن ماجہ کے متعلق بھی حضرت شاہ صاحب کے درسی افادات کے جمع کرنے کی توفیق خاکسار کے بعد مختلف افراد کو بخشی گئی، جہاں تک میں جانتا ہوں ان صاحبوں نے بھی بجائے اردو کے عربی زبان ہی کو تعبیر کے لیے اختیار فرمایا، جیسا کہ میں نے عرض کیا حضرت شاہ صاحب کے طرز بیان اور طریقہ تدریس کی نوعیت کچھ ایسی تھی کہ اردو سے زیادہ عربی زبان ہی میں ان کی تقریروں کا قلم بند کرنا آسان معلوم ہوتا تھا، ویسے نہیں ہے، یا ازیں قبیل اردو کے عام افعال کے سوا الفاظ کا بڑا ذخیرہ ان کی تقریروں میں

عربی کا ہی ہوتا تھا، کم از کم فقیر کا احساس تو یہی ہے اور اسی چیز نے خود مجھ میں یہ جسارت پیدا کی کہ پہلے عربی عبارت کے لکھنے کی مشق وعادت کا موقع حالانکہ اپنی تعلیمی زندگی میں نہ ملا تھا، لیکن الامام الکشمیری کے صفِ نعال میں شریک ہوجانے کا اثر تھا کہ روزانہ تین تین چار چار ورق، بلکہ کبھی اس سے بھی زیادہ برجستہ قلم عربی میں ان کی تقریروں کو لکھ لیا کرتا تھا۔

نوشتۂ درس کی گمشدگی

اس کا افسوس ہے کہ ظلم کرنے والوں نے مجھ پر ظلم کیا اور زندگی کے اس مسودہ کو جو جان سے زیادہ عزیز تھا، کسی صاحب نے اس سے مجھے محروم کر دیا، جب اس کا خیال آتا ہے، تو بے ساختہ حضرت مجددؒ کے مکتوباتِ شریفہ کا مشہور شعر

آنچہ ازمن گم شدہ گراز سلیماں گم شدے
ہم سلیماں ہم پری ہم اہرمن بگریستے

(جو کچھ مجھ سے گم ہوا ہے، اگر وہ سلیمان سے گم ہوا ہوتا، تو سلیمان بھی، پری بھی اور دیو بھی سب رو پڑتے) یاد آتا ہے۔

میرے پاس زمانے تک کئی سو صفحات کی یہ تقریر موجود تھی، جلد بندھوائی گئی تھی، حضر سفر میں ساتھ رہتی تھی، اچانک ایک دن تلاش کرنے پر معلوم ہوا کہ کسی نے اڑا لی (فقیر کے رفقائے درس میں سے دو صاحب، ایک تو بخارا کے ملا عبدالحکیم اور دوسرے دربھنگہ کے مولانا عبدالرحیم دونوں التزاماً میری مرتبہ تقریر کو روزانہ نقل کرلیا کرتے تھے اور ان دونوں کے پاس بھی مجلد شکل میں یہ تقریر موجود تھی، بخاری صاحب بیچارے کے متعلق تو یہ بھی معلوم نہیں کہ کہاں ہیں، اس دنیا میں ہیں بھی، یا عالم آخرت کی طرف منتقل ہوگئے، اکثر فرمایا کرتے تھے کہ جب بخارا جاؤں گا، تو یہی تقریر تیری یاد کو تازہ رکھے گی، بڑے نیک شریف بزرگ تھے۔ "گندر پلاؤ" بھی بڑی نوش ہ کر خاص فقیر کے لئے پکاتے تھے، بڑا لذیذ پلاؤ ہوتا تھا اور یہ بھی معلوم نہیں کہ مولانا عبدالرحیم صاحب کے پاس بھی وہ تقریر محفوظ ہے، یا نہیں، شاید ستارالعیوب کا لطفِ خفی بھی اُس تقریر کے گم ہونے میں کارفرما ہو، کیوں کہ لکھنے کی حد تک فقیر نے لکھ ضرور لیا تھا، لیکن معنوی اور لفظی غلطیوں کے انبار کے سوا جہاں تک میرا اندازہ ہے، شاید وہ نوشتہ اور کچھ نہ تھا اور نہ ایسی کے سوا کچھ اور ہوسکتا تھا، کون کہہ سکتا ہے کہ اپنی

رسوائی اس کے باقی رہ جانے کی صورت میں کیسی اور کہاں تک پہونچتی۔

سچ تو یہ ہے کہ فقیر کے بعد ترمذی اور بخاری شریف کی املائی شرح ''فیض الباری'' مرتبہ مولانا بدر عالم میرٹھی اور اس کے ساتھ مجلس علمی ڈابھیل حضرت شاہ صاحب کے دوسرے افادات کو شائع کر کے محفوظ نہ کر دیتی، تو خدا ہی جانتا ہے کہ اپنی اس ٹوٹی پھوٹی، شکستہ اور پراگندہ تقریر کے گم ہو جانے کا اثر مجھ پر کیا مرتّب ہوتا، لیکن حق تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ مشہور قرآنی قانون:

فاما الزبد فيذهب جفآء و اما ما ينفع الناس فيمكث في الارض (الرعد)

لیکن جھاگ، سو سوکھ کر ختم ہو گیا اور لوگوں کو جس سے نفع پہنچتا ہے، وہ ٹھہر گیا زمین میں۔

کی عملی تفسیر اس باب میں میرے سامنے آ گئی، جو چیز مٹنے اور گم ہونے کی مستحق تھی، وہ گم ہو گئی، لیکن واقعی منافع للناس کی جن چیزوں میں ضمانت تھی، قدرت کی طرف سے اس کے باقی رکھنے کا ایک استوار و محکم نظم کر دیا گیا، جس وقت خاکسار نے اپنی املائی ہوئی تقریر کو قلم بند کرنا شروع کیا تھا، اس زمانے میں اس کا خیال بھی نہیں کیا جا سکتا تھا، حق تعالیٰ نے اپنے بعض خاص مخلص بندوں[1] کے دل میں معارف انوریہ کی صحیح قدر و قیمت کا

---

[1]...... یہ فقیر کے کرم فرما میزبان کریم مولانا محمد موسیٰ الجوہانسبرغی الافریقی ثم الباکستانی ہیں۔ شاید اپنے نام کا اظہار ان پر اب بھی گراں گزرے، لیکن ''واللہ مخرج ما کنتم تکتمون'' کے لاہوتی قانون کو وہ کیسے مقابلہ کر سکتے ہیں، حدیث بھی تو ہے: (لو ان رجلاً عمل عملاً فی صخرة صماء لاباب فيها ولا كوة، خرج عمله الى الناس كائناً ما كان) (رواہ احمد والحاکم وصححہ) پھر یہ تو عمل مخفاہا ومجلسہا کا عمل ہے، راز نہاں بن کر کیسے رہ سکتا ہے....؟ حقیقت تو یہ ہے کہ الامام الکشمیری کا حلقہ تلامذہ اگرچہ کافی وسیع وعریض ہے، لیکن سمتاً وہدیاً ودلاً بلکہ شکلاً وصورۃً یا زیادہ رئیاً ان سے قریب مولانا محمد بن عیسیٰ کو میں نے پایا، فنائیت کی یہ کیفیت دوسروں میں کم از کم مجھے تو نہ ملی، ''نعم المال الصالح للعبد الصالح'' کی شرح بھی جوہانسبرگ کے التاجر الامین ہی کے قالب میں میرے سامنے پہلی دفعہ پیش ہوئی، ان کی ذرہ نوازیوں کو میں بھلا نہیں سکتا۔ مہمانی کا شرف چند دنوں کے لئے اس فقیر کو جب حاصل ہوا تھا، تو انہیں کو نہیں، ان کے گھر کے ارکان، بلکہ نوکروں اور ملازموں میں بھی اکرام ضیف کے بہترین سلیقہ کا تجربہ ہوا تھا۔ فیض الباری، بخاری کی شرح کشمیری اور اس کے طفیل میں امام زیلعی کی تخریج ہدایہ دونوں کتابیں فقیر تک مولانائے موصوف کے بدل ونوال کے توسط سے پہنچیں۔ فجزاہ اللہ عنا خیر الجزاء۔

احساس پیدا کیا، بخاری کی املائی شرح فیض الباری کے مسودے کو لے کر ایک صاحب مصر بھیجے گئے اور مصر میں قیام کر کے اس عزیز الوجود گرامی منزلت کتاب کو بہترین کاغذ پر روشن اور مجلی ٹائپ کے حروف میں طبع کرا کے واپس آئے، شاہ صاحبؒ کے وہی افاداتِ قیمہ جن کے متعلق اندیشہ تھا کہ دارالعلوم دیوبند کے احاطہ ہی میں خدانخواستہ گم ہو کر ختم ہو جائیں گے، چاہنے والے نے جب چاہا، تو اسلامی دنیا کے مشارق الارض و مغاربہا کے آخری حدود تک ان کو پہنچا دیا اور کون کہہ سکتا ہے کہ مسلمانوں کی آئندہ کتنی نسلیں سرزمین ہند کے ان علمی انکشافات سے مستفید اور تمتع پذیر ہوتی رہیں گی۔ قابل رشک ہیں وہ لوگ جنہیں اس علمی مہم کی مختلف منزلوں میں حصہ لینے کی توفیق بخشی گئی، تاہم میرا یہ مظنّہ اگر صحیح ہے کہ اپنی ساری کوتاہ نصیبوں کے ساتھ حضرت شاہ صاحب کی درسی تقریروں کی قلمبندی کے سلسلے میں تقدم اور سبقت کی نعمت سے ابتداءً وہی دیوانہ سرفراز ہوا تھا، جس کا جنون اس علمی امانت کے بار کا متحمل نہ ہو سکا، تو ارادی نہ سہی، اضطراری سعادت سے چاہیئے تو یہی کہ اسے بھی محروم نہ ٹھہرایا جائے، جب ورقا غیض ایکہ (بکائن کی شاخ پر کوکو کرنیوالی فاختہ) کے فضل تقدم کا اعتراف کرتے ہوئے عرب کے شاعر نے کہا تھا اور چڑیا تک کے متعلق انسانوں نے اقرار کیا:

ولکن بکت قبلی فهیج لی البکاء بکاها فقلت الفضل للمتقدم

"لیکن فاختہ مجھ سے پہلے رو پڑی، اس کے رونے سے مجھ پر گریہ طاری ہوا، اس لئے میں نے مان لیا کہ برتری اسی کو حاصل ہوئی جس نے سبقت کی"۔

شاید کہنے والا کہہ سکتا ہے:

میں جو رویا تو رو پڑی دنیا
شور سے اپنے شور ہے برپا

بہرحال بقولِ شخصے۔

عشق سے ہوں گے جن کے دل آباد
قیس مرحوم کو کریں گے یاد!

اور میں ممنون ہوں کہ بخاری کی املائی شرح فیض الباری کے مقدمہ میں صحیح مسلم کی گمشدہ میری املائی تقریر کا ذکر کر دیا گیا ہے، جزاہم اللہ عنی خیر الجزاء۔

(آپ بیتی سے ماخوذ مضمون)

استاد محترم حضرت مولانا شبّیر احمد عثمانی علیہ الرحمۃ

دار العلوم کے اساتذہ میں سے تیسرے استاذ جن سے خاکسار کو غیر معمولی استفادہ کے موقع میسر آئے، وہ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب کی ذاتِ بابرکت ہے، دار العلوم ہی میں نہیں، بلکہ زندگی میں جن بزرگوں کے تلمّذ کا شرف فقیر کو مختلف ادوارِ حیات میں حاصل ہوتا رہا ہے، ان میں جہاں تک سوچتا ہوں، شاید سب سے زیادہ میرے نوعمر استاذ مولانا عثمانی قدس سرہ تھے۔ جس زمانے میں ان کے حلقۂ درس میں شریک ہوا، مولانا کی عمر غالباً اس وقت تیس، پینتیس سال کے درمیان تھی، بمشکل مجھ سے آٹھ دس سال عمر میں وہ بڑے ہوں گے، لیکن یہ خدا کی دین تھی کہ اس عمر میں وہ دار العلوم کے صفِ اول کے اساتذہ میں شریک ہو چکے تھے اور دورۂ حدیث کی اہم ترین کتاب "سنن ابی داؤد" کا درس انہیں سے متعلق تھا۔

یوں تو مولانا عثمانی کے نام سے دار العلوم میں حاضر ہونے سے پہلے بھی کچھ نہ کچھ آشنا ہو چکا تھا، ٹونک میں بعض طلباء دار العلوم سے ہو کر پہنچتے تھے، ان کے علم و فضل کا ذکر غیر معمولی امتیاز کے ساتھ کرتے تھے، اس خصوصیت کے ساتھ کہ دینی علوم کے علاوہ عقلیات میں، انہیں طالب علموں سے معلوم ہوا تھا کہ مولانا غیر معمولی شہرت حاصل کر رہے ہیں۔ یہ بھی جانتا تھا کہ باوجود نوعمری کے مدرسہ فتح پوری میں صدر مدرس کے عہدے کے لیے بھی ان کا انتخاب ہوا تھا اور دلّی جیسی مرکزی آبادی میں چند ہی دنوں میں مولانا کی تقریر وتحریر کا دائرہ وسیع ہوتا چلا گیا۔

میری نظر سے "القاسم" کے بعض شمارے بھی گزرے تھے، جن میں مولانا عثمانی کے بعض مقالات شائع ہوئے تھے، تحریر میں ان کا رنگ عام مولویوں سے نیا تھا، شاید ایک حد تک یہ کہنا صحیح ہے کہ دیوبندی حلقے کے علماء میں مولانا شبیر احمد عثمانی پہلے بزرگ تھے، جن کی

انشاء وتحریر میں عصری تقاضوں کی رعایت پائی جاتی تھی۔

سنن ابی داؤد کا پہلا درس

بہر حال دار العلوم میں داخل ہونے سے پہلے میری معلومات مولانا کے متعلق بس انہی حدود تک محدود تھیں، دفتر سے جو اطلاع دورہ کے اسباق کے متعلق شائع ہوئی تھی، اس سے معلوم ہوا کہ "سننِ ابوداؤد" پڑھنے کے لیے مولانا شبیر احمد عثمانی کے درس میں حاضر ہونا پڑے گا، وقت ظہر کے بعد کا تھا، طالب علموں کے ساتھ خاکسار بھی اس حلقہ میں جا کر بیٹھ گیا، نودرہ کے جنوبی حصے میں دیکھا کہ ایک نوجوان طالب علموں کے درمیان بیٹھا ہوا ہے، یہ یاد نہیں کہ کوئی حدیث شروع ہوئی تھی، یا نہیں کہ ایک طویل تمہیدی خطبہ مولانا نے شروع کیا، ان کے بولنے کا طرز حد سے زیادہ سنجیدہ، خطاب کا طریقہ غیر معمولی طور پر دل آویز تھا، چند ہی لمحات کے بعد محسوس ہوا کہ کچھ نئی باتیں کان میں پڑ رہی ہیں۔

قاسمی نظریات ومعارف

اس وقت تک سیّدنا الامام الکبیر حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کی کسی کتاب، یا تحریر کے پڑھنے کا موقع نہیں ملا تھا، حضرت مولانا عثمانی نے جیسا کہ بعد میں پتہ چلا کہ اپنی خداداد ذکاوت وذہانت کی مدد سے قاسمی نظریات ومعارف کو گویا دینی تفہیم کا ایک مستقل نظام ہی بنالیا تھا، حضرت نانوتوی کے خصوصی افکار کو عصری تعبیروں میں پیش کرنے کی غیر معمولی مہارت ان کو حاصل تھی، نئی باتیں درحقیقت وہی تھیں، جن کے متعلق مجھے اعتراف کرنا چاہئے کہ حضرت مولانا عثمانی سے پہلے میں نے کسی سے نہ سنی تھیں اور نہ کسی کتاب، یا مضمون میں اس کا سراغ ملا تھا، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی کے درس کا یہ حصہ میرے لئے حد سے زیادہ دلچسپ اور لذیذ ثابت ہوا، مولانا جس طریقے سے ان چیزوں کو ادا کرتے تھے، ان میں بڑی حلاوت اور شیرینی تھی، جہاں تک خیال آتا ہے حلقۂ درس میں طالب علموں کی تعداد اسّی، پچاسی، سے متجاوز تھی، ان ہی کے مجمعے میں گھسا ہوا گوشہ میں بیٹھ کر مولانا کی باتیں سنا کرتا تھا، یہ باتیں ایسی دلنشیں ہوتی تھیں اور کچھ ایسے منطقی تسلسل کے ساتھ مولانا ان کو بیان کرتے تھے کہ ان کو نوٹ کرنے کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی تھی، وہ

فرماتے جاتے تھے اور حافظہ میں خود بہ خود ان کی جگہ بنتی جاتی تھی، شاید ایک ہفتہ، یا اس سے کچھ زیادہ مدت گزری ہوگی، یوں ہی طلباء کے ساتھ مولانا کے حلقۂ درس میں آکر بیٹھا کرتا تھا، ذاتی طور پر مولانا سے تعارف کی کوئی صورت پیش نہ آئی تھی۔

ذاتی تعارف

میرا خیال یہی تھا کہ طلبہ کے اتنے بڑے مجمع میں وجہ ہی کیا ہو سکتی ہے کہ مجھ جیسے ایک بے کس مپرس طالب علم پر امتیازی نظر مولانا کی پڑے گی، اب میں نہیں کہہ سکتا کہ ان کی تقریر کی سماعت میں غیر معمولی انہماک نے ان کو متنبہ کیا، یا ممکن ہے درس میں ایک دو بات استفادۂ خاکسار نے جو دریافت کی تھیں، اس کا نتیجہ تھا، بہر حال اسباب سے آج تک ناواقف ہوں، لیکن اسی عرصہ میں ایک واقعہ عجیب پیش آیا۔

ہمارے دوست مولوی احسان اللہ تاجور مرحوم، جو بعد میں اردو زبان کے ممتاز شعراء میں شمار کئے گئے، شمس العلماء کے خطاب سے بھی حکومت نے سرفراز کیا تھا، یہ بھی اسی زمانے میں دارالعلوم میں تھے، ان کا دورۂ ختم ہو چکا تھا، گویا فارغ التحصیل ہو چکے تھے اور آئندہ مستقبل کا پروگرام بنا رہے تھے، شعر وشاعری کا ذوق طالب علمی ہی سے رکھتے تھے، طالب علموں میں ان کے اشعار کا اچھا خاصا چرچا اسی زمانے میں پھیلا ہوا تھا، ادبی ذوق کے اشتراک کی وجہ سے مجھ میں اور ان میں مراسم ابتداء ہی سے قائم ہو گئے تھے۔

بہر حال یہی بیچارے تاجور مرحوم ایک دن میرے پاس آئے اور بولے کہ آج میں مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تھا، انہوں نے فرمایا کہ دورۂ کے طالب علموں میں مناظر احسن نامی جو طالب علم ہیں، ان تک میرا پیغام پہنچا دو کہ میں ان سے ذاتی طور پر ملنا چاہتا ہوں، تاجور مرحوم سے میں یہ سنتا جاتا تھا اور حیران تھا کہ اس سے زیادہ کر طالب علموں کے رجسٹر حاضری میں اس فقیر کا بھی نام تھا اور حاضری کے وقت دوسروں کے ساتھ میرا بھی نام پکارا جاتا تھا، کسی قسم کا کوئی تعارف مولانا سے میرا نہیں ہے، پھر انہوں نے اپنی خصوصیت کے ساتھ کیوں اس خاکسار کو یاد فرمایا؟ غالباً مغرب کا وقت تھا، رات ہو چکی تھی، میں صبح کا منتظر رہا۔

درِ دولت پر حاضری

دوسرے روز تاجور مرحوم سے مولانا کے درِدولت کا پتہ دریافت کر کے غالبًا کسی ملنے والے طالب علم کی رہنمائی میں خدمتِ والا میں حاضر ہوا، مولانا کو دیکھا کہ متبسّم ہیں، سلام کر کے بیٹھ گیا، خود ہی فرمایا کہ زمرہ کے سبق میں تم بھی آتے ہو، اگر چہ زیادہ دن نہیں گزرے ہیں۔ رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کسی سے آدمی کو محبت ہو، تو اس کو مطلع کر دے، میں نے اسی لئے آپ کو طلب کیا تھا، تا کہ رسول ﷺ کی اس حدیث کے مطابق آپ کو مطلع کردوں، اپنے دل میں آپ کی محبت پاتا ہوں۔

اپنی ہیچ میرزی، کس مپرسی، جہل ونادانی کو دیکھتے ہوئے مولانا غفراللہ لہ کی زبان مبارک سے یہ باتیں سنتا جاتا تھا اور بے ساختہ آنکھوں سے آنسو نکلتے آتے تھے، کچھ اتنا مبہوت تھا کہ جواب میں شاید کچھ عرض نہ کرسکا، شاید عدم حاضری کی تقصیر کی معافی چاہی گئی، کچھ دیر بیٹھ کر واپس مدرسہ چلا آیا۔

مولانا شبیر احمد عثمانی کی زندگی میں انقلاب

اب مولانا سے براہِ راست ذاتی واقفیت پیدا ہو چکی تھی، درس ان کا جاری تھا، درس کیا تھا ان کے خطبات تھے، جن کا سلسلہ تقریباً ایک مہینہ کے قریب جاری رہا، اصل کتاب کی چند ہی حدیثیں پڑھی ہوں گی کہ اچانک حضرت کی زندگی میں ایک نیا انقلاب شروع ہوا۔

ہوا یہ کہ مولانا کا یہ درس جاری تھا، خاکسار بھی کبھی درِدولت پر حاضر ہو جاتا تھا، میرے ساتھ بہار ہی کے ایک اور طالب علم مولانا نور الہدیٰ دربھنگہ ضلع کے رہنے والے تھے، انہوں نے کانپور کے مدرسہ الٰہیات میں بھی کچھ تعلیم حاصل کی تھی، جہاں تقریر وتحریر کی مشق کا ان کو بھی موقع ملا تھا اور اردو ادب کا اچھا مذاق رکھتے تھے، عمر بھی کافی تھی، دارالعلوم میں حدیث کی تکمیل کے لیے آئے تھے، وطنی اور مذاقی وحدت کی وجہ سے ہم دونوں میں خصوصی تعلقات قائم ہو گئے تھے، مولانا عثمانی کی خدمت میں ہم دونوں عموماً ساتھ ہی حاضر ہوا کرتے تھے، اب پورے طور پر یہ یاد نہیں رہا کہ ہم دونوں کو بلا کر مولانا نے کیا فرمایا، یا یہ واقعہ بعد کا ہے۔ بہر حال مولانا کے درس کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ سلسلہ اس کا بیچ بیچ میں

زیادہ تر ناسازئی طبع کی وجہ سے ٹوٹ ٹوٹ جاتا تھا، مہینہ میں ایک دو دن کا ناغہ اس زمانے میں ایک عام سی بات تھی۔اسی عرصہ میں یہ صورت پیش آئی کہ ناغہ کا سلسلہ کچھ دراز ہو گیا، مولانا کی صحت اچھی نہیں رہتی تھی، عیادت کے لیے ہم دونوں جو پہنچے، تو گو کہ کچھ کچھ جسمانی شکایت کے آثار بھی پائے جاتے تھے، لیکن ہم دونوں کو دیکھ کر اٹھ بیٹھے اور عجیب وغریب تقریر کی، جس کی پہلے سے قطعاً توقع نہ تھی۔

بجنسہٖ تو الفاظ کا نقل کرنا تو ناممکن ہے، لیکن خلاصہ یہی تھا کہ تعلیم کے موجودہ طریقے پر شدید تنقید کرتے ہوئے فرمانے لگے کہ یہ کیا طریقہ ہے؟ پست وبلند، کس وناکس ہر قسم کے طالب علموں کو درس کے حلقے میں شرکت کی اجازت دے دی جاتی ہے، عمومیت اور اکثریت آج کل کے طلباء کی ایسی ہے، جو صحیح معنوں میں دس فیصد بھی اپنے اساتذہ کی تقریروں سے مستفید ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتی ہے، بہت دنوں سے اس صورت حال پر غور کر رہا ہوں، اب تو میرے تحمل اور برداشت سے باہر ہو چکی ہے اور میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ اس بھیڑیا دھسان والے حلقۂ درس سے اپنے تعلق کو منقطع کرلوں اور چند خاص طالب علموں کو پڑھانے کے لیے انتخاب کروں، کچھ ایسے لب ولہجہ میں مولانا تقریر کر رہے تھے، جس سے صاف یہ ظاہر ہوتا تھا کہ مولانا مدرسہ سے ملازمت کے رشتے کو منقطع کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں، میں حیران تھا کہ یہ کیا فرما رہے ہیں؟ جو کچھ کہتے رہے، چپ چاپ سنتا رہا، آخر میں جب ہم دونوں اٹھنے لگے، تو فرمایا کہ میں نے پورے حلقۂ درس میں سے صرف دو طالب علموں کا انتخاب کیا ہے، ایک یہی فقیر اور دوسرے مولوی نور الہدیٰ، ہم دونوں کو حکم دیا گیا کہ کل سے کتاب لے کر تم دونوں میرے گھر آجایا کرنا، میرے لئے ان سینکڑوں طلبہ میں صرف یہی دو طالب علم کافی ہیں۔

اسی سلسلہ میں حضرت نانوتوی کے اس تعلیمی نظریہ کا بھی مولانا نے ذکر کیا تھا کہ علم کی اشاعت کی دو مستقل شکلیں ہیں، ایک کمّاً، دوسری کیفاً، کمّاً یہ کہ اہل علم کو زیادہ سے زیادہ سے تعداد میں پھیلانے کی صورت یہی جو مدرسوں میں اختیار کی جاتی ہے، لیکن علم کی کیفیت میں اگر ترقی مقصود ہو، تو بجائے جماعتی تعلیم کے چند خاص طالب علموں کو پڑھانا چاہئے اور شخصی طور پر ان کی تربیت وپرداخت میں کوشش کی جائے۔فرماتے کہ حضرت نانوتوی نے

اسی اصول کے تحت خود مدرسہ میں کبھی نہیں پڑھایا، بلکہ اپنے لئے چند طلباء کو انتخاب کرلیا تھا، انہیں کو آپ نے اپنا طالب علم بنا رکھا تھا، جن میں حضرت شیخ الہند، مولانا احمد حسن امروہی اور مولانا فخر الحسن گنگوہی، وغیرہم حضرات تھے۔

مشکلات میں غیبی امداد

الغرض تدریسی زندگی میں ایک نیا انقلابی دور تھا، جسکا آغاز بدقسمتی سے اسی زمانے میں ہوا، جب یہ فقیر دورۂ میں شریک ہوا اور حضرت والا کے زیر تعلیم تھا، بدقسمتی سے اس لئے کہہ رہا ہوں کیونکہ آگے یہ قصّہ بڑھا اور بہت زیادہ بڑھا، مولانا نے باضابطہ مدرسہ میں استعفیٰ داخل کردیا، ان کے بڑے بھائی مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کی طرف سے جو نائب مہتمم تھے، بہت کچھ فہمائش کی کوششیں کی گئیں، خود بھی کیں اور دوسروں سے بھی کروائیں، لیکن جو فیصلہ مولانا کرچکے تھے، اسی پر ڈٹے اور جمے رہے۔

ہم لوگوں کے لیے مشکل یہ تھی کہ مولانا کے حکم کی تعمیل سے گریز بھی مشکل تھا، ان کے ارشاد کے مطابق کتاب لے کر گھر پر حاضر ہوتے رہے، لیکن چند اسباق سے زیادہ انفرادی درس کا یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا، مدرسہ کی طرف سے ابوداؤد کا درس حضرت مولانا میاں سید اصغر حسینؒ کے سپرد کردیا گیا تھا، ہم بھی اسی درس میں جاکر شریک ہوگئے اور یوں ہماری کتاب ختم ہوئی، ورنہ ابوداؤد میں یہاں تک خطرہ پیش آگیا تھا کہ ہمارا دورۂ نامکمل ہی رہ جاتا۔

مولانا کے معاش کا واحد ذریعہ ہی جامعہ کی تنخواہ تھی، اس سے دست بردار ہونے کے بعد اب کیا بتایا جائے کہ کیا صورت پیش آئی، مولانا صاحبِ اولاد تو نہ تھے، لیکن بہر حال گھر میں ان کی بیوی صاحبہ تھیں، خانہ داری کا نظم ان کے لیے سخت دشوار ہوگیا، لیکن با ایں ہمہ مولانا یہی طے کئے ہوئے تھے کہ مدرسہ کی جس ملازمت کو چھوڑ چکا ہوں، اس کو دوبارہ اختیار نہیں کروں گا اور جب تک دار العلوم میں فقیر کا قیام رہا، مدرسہ کی ملازمت کے تعلق سے وہ آزاد ہی رہے، یہ زمانہ مولانا پر بڑی آزمائش کا تھا، تاہم کسی نہ کسی طرح وقت گزرتا ہی رہا، ضرورتیں پوری ہوتی ہی رہیں، ان کی سوانح عمری میں چاہئے تو یہی تھا کہ زندگی کی اس خاص منزل کے حالات جاننے والوں سے دریافت کرکے درج کئے جاتے۔

آپ کی زوجہ محترمہ[1] مدظلہ اسے مولانا محمد ابراہیم[2] صاحب بلیاوی اور مولانا عمادالدین[3] صاحب انصاری، جن سے اس زمانے میں مولانا کے گہرے دوستانہ تعلقات قائم تھے، وہی بتا سکتے ہیں کہ کن کن شکلوں میں غیبی امداد آپ کے سامنے آئی۔

فتح الملہم کی ابتداء

اسی زمانے میں مولانا کے قلب مبارک میں صحیح مسلم شریف کی شرح کا خیال پیدا ہوا، ابتدائی کام شروع بھی کر دیا تھا، تھوڑی بہت خدمت فقیر کو بھی اس سلسلے میں دینی پڑی تھی۔ قصہ مختصر، جو کچھ ہو، مولانا عثمانی سے اس میں شک نہیں کہ کتابی تلمذ کی نوعیت اگرچہ سننِ ابی داؤد کے چند اوراق ہی تک محدود رہی، لیکن حکمت قاسمی سے صرف روشناس ہی ہونے کا موقع ہی مولانا کے ذریعے نہیں ملا، بلکہ کہہ سکتا ہوں کہ باضابطہ علم کے اس خاص شعبے کی تعلیم مولانا ہی سے اس فقیر کو میسّر آئی، اس باب میں میرے بلاشرکت غیرے واحد معلم اور استاذ ہیں (نورا للہ ضریحہ، وجعل الجنۃ مثواہ) دارالعلوم کے احاطہ سے باہر حیدرآباد وغیرہ میں مولانا سے تعلق قائم رہے، لیکن مضمون چونکہ دارالعلوم کی حد تک محدود ہے، اس لئے خارج از دارالعلوم کی سرگزشتوں کے ذکر کا یہاں موقع نہیں ہے۔

دارالعلوم کا ہر تنکا پیام اصلاح تھا

واقعہ یہ ہے کہ مستفید ہونے کی حد تک اس کج راو کج فہم کے لیے دارالعلوم کا تنکا تنکا اصلاح درترمیم کا پیغام بنا ہوا تھا، اللہ اللہ دارالعلوم کی مقدس و پاک کی لمبی لمبی صفوں کی وہ نمازیں، جن میں خدا ہی جانتا ہے کہ اللہ کے کیسے کیسے راست باز، مخلص، وفادار بندے شریک تھے، زمین پر وہ پہچانے نہ جاتے ہوں، پھٹے پرانے کپڑے، بال الجھے ہوئے، ان سے باتیں کیجئے، تو وہ فقرے بھی بیچارے صحیح طور پر ادا کرنے کی قدرت نہ رکھتے تھے، لیکن میرے تجربات ومشاہدات مجھ پر ثابت کرتے چلے تھے کہ اللہ کے پیغمبر رسول ﷺ شاید انہی جیسوں کی نشاندہی کرتے ہوئے فرمایا کرتے تھے کہ (رب اشعث اغبر مدفوع بالابواب لو اقسم علی، لابرہ) او کما قال، چہروں پر گرد پڑی ہوئی، بال بکھرے

---

[1]......[1]۔[2]۔[3] تینوں حضرات جوارِ رحمت میں پہنچ چکے ہیں۔

ہوئے، انہیں دروازوں پر دھکے دیئے جانے والوں میں ایسے نفوس بھی ہیں کہ خدا کی قسم کھا کر کوئی بات کہہ دیں، تو حق تعالیٰ ان کی قسم پوری فرماتا ہے، گلیوں اور بازاروں میں جب نکلتے تو ان پر انگلیاں نہیں اٹھتی تھیں، لیکن ان کا حال ہی ایسا تھا کہ زمین والے نہ سہی، مگر

حوریاں رقص کناں نعرۂ مستانہ زدند

کا منظر آسمانوں پر اگر قائم ہو جاتا ہو، تو اس پر متعجب نہ ہونا چاہئے، اپنے درس کے ان رفقاء کا اب بھی جب خیال آجاتا ہے، تو آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا جاتی ہیں، کچھ نہیں معلوم کہ وہ لوگ کہاں گئے اور کہاں رہے؟ لیکن آج بھی مل جائیں، تو جی چاہتا ہے کہ دیر تک ان کے قدموں کو چومتا رہوں، ان کے پاک قدموں کی خاک کو سر پر ملوں، آنکھوں میں اس کا سرمہ لگاؤں، الغرض دارالعلوم کا سارا ماحول میرا معلّم واستاذ بنا ہوا تھا۔

مولی حجّام

اور تو اور اس زمانے میں ایک بوڑھا نائی تھا، جو اپنے کند استرے سے غریب طلباء کے نازک بالوں پر ظلم توڑا کرتا تھا، اس کا اصل نام کیا تھا، اس کا تو علم نہ ہو سکا، لیکن عام طور پر ''مولی'' بروزن چولی کے عرفی نام سے پکارا جاتا تھا، یہ مولی حجام، حجامت اور اصلاح سازی کے کام سے زیادہ مدرسہ کے طلباء کی باسی بچی کھچی روٹیوں کی حجامت سے تعلق رکھتا تھا، صبح ہوئی اور میاں مولی ہر کمرے کے سامنے کھڑے ہو کر پکار رہے ہیں: ''میاں رات کی کچھ دھری پڑی رہ گئیں ہوں، تو وہ روٹیاں دے دینا''۔ دینے والے دیا کرتے تھے، خدا جانے یہ واقعہ تھا بھی، یا نہیں، لیکن مشہور یہی تھا کہ میاں مولی دارالعلوم جیسے دینی ادارے سے تعلق رکھنے کے باوجود نماز سے کوئی تعلق نہیں رکھتے، عمر ستر سے بظاہر متجاوز رہی ہوگی، قدرۃً طلباء نے یہ مشغلہ بنا لیا تھا کہ جہاں بچی کھچی رات کی باسی روٹیوں کے لیے میاں مولی نے کسی حجرے میں منہ ڈال کر اپنی سفید طویل وعریض سفید ڈاڑھی ہلانی شروع کی کہ ہر طرف سے بآواز بلند ہوتی، مولی تم نماز نہیں پڑھتے؟ اس سوال کا جواب جب تک مولی غریب سے حاصل نہ کر لیا جاتا، وہ لوگ اس بیچارے کو روٹی نہ دیتے، لیکن اس اعتراض کا بھلا مولی حجام کیا جواب دے سکتا تھا، پھر بھی رہتا تھا مولویوں ہی میں، جواب میں اس نے

یہ ترکیب نکالی تھی کہ پوچھا جا رہا ہے اس سے نماز کیوں نہیں پڑھتا، تو جواب میں کہتا کہ آموں میں ابھی بور کہاں آئے ہیں، طالب علم کہتے کہ بھئی تم نماز کیوں نہیں پڑھتے؟ تو وہ جواب میں کہتا کہ برسات کے آنے میں کچھ وقفہ ہے، بازاروں میں سنگھاڑے آگئے ناشپاتیاں بکنے لگیں۔ الغرض سوال سے جن باتوں کا کسی قسم کا کوئی تعلق نہ ہوتا، مسلسل یکے بعد دیگرے ان ہی جوابوں کو پیش کرتا چلا جاتا اور اتنی متانت اور سنجیدگی کے ساتھ پیش کرتا کہ لب پر مجال کیا کہ ہلکی سی مسکراہٹ بھی آجائے، لوگ اس کے بے جوڑ جوابوں سے تنگ آنے کے بعد روٹی کے خشک ٹکڑے جو کہیں پڑے دھرے ہوتے، اس کے حوالے کردیتے۔

جملہء مولیہ

ہم لوگوں کے حلقے میں مولی حجام کے اس خاص طریقۂ جواب کی بنیاد پر ایک خاص علمی اصطلاح ہی مروج ہوگئی تھی، بحث ومباحثہ میں جہاں کسی کی طرف سے کوئی ایسا جواب پیش ہوا، جس کا سوال سے زیادہ تعلق نہ ہوتا، تو کہہ دیا جاتا کہ آپ ''جملہ مولیہ'' استعمال کر رہے ہیں، گویا اصطلاح ہی مقرر ہوگئی تھی کہ وہ جواب جس کا سوال سے چنداں تعلق نظر نہ آئے، جملوں اور فقروں کی دنیا میں وہ ''جملہ مولیہ'' یا ''فقرہ مولیہ'' بن جاتا، نو وارد طلباء اس جملہ مولیہ کا مطلب پوچھتے کہ یہ کیا بلا ہے، جملوں کے اقسام میں اس خاص قسم، یعنی: جملہ مولیہ کا ذکر تو کسی نے آج تک نہیں کیا، تب کہا جاتا کہ ٹھہر جائیے، مولی حجام آپ کو اس کا جواب دے گا، وہ آتا حسب دستور نماز کیوں نہیں پڑھتے؟ کے جواب میں آسمان وزمین کی سنانے لگتا اور مولی حجام کے آنے تک انتظار کی زحمت جو برداشت کرنے پر آمادہ نہ ہوتے، تو ان کو سمجھا دیا جاتا کہ چاول سفید ہوتے ہیں، اس لئے سمجھنا چاہئے کہ دنیا گول ہے، جیسے دلیل اور دعویٰ کی اس ترتیب میں کوئی ربط نہیں، اسی طرح ہر غیر مربوط کلام اور فقرے کا نام ''جملہ مولیہ'' ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جملہ مولیہ کی اصطلاح کی بدولت بعض اوقات طویل طویل تقریروں کی زحمت سے ہم لوگ بچ جایا کرتے تھے کہ یہ تو جملہ مولیہ ہوا، لمبی باتوں کی جگہ یہ کہنا کافی

ہوجاتا تھا، اصطلاح کے جاننے والے فوراً متنبہ ہوجاتے اور کلام میں ترتیب پیدا کرنے کی کوشش کرتے۔

ظاہر ہے کہ دارالعلوم کے اس تعلیمی ادارے میں پہنچ کر مولی حجام تک کا وجود جب معلّمی کا فرض انجام دیتا تھا اور کیسی معلّمی ؟ کہ آج بھی جملہ مولیہ یا فقرہ مولیہ کی جگہ چاہتا ہوں کوئی ایسی اصطلاح ہاتھ آجائے، جس سے وہی کام لیا جاسکتا ہو جو جملہ مولیہ سے دارالعلوم کے احاطے میں لیا جاتا تھا، کم از کم میری سمجھ میں تو ایسی اصطلاح اب تک نہیں آئی ہے، اپنے مخاطب کو جس آسانی کے ساتھ اپنا مطلب جملہ مولیہ کہہ کر سمجھا لیا جاتا تھا، شاید اتنی سہولت کے ساتھ اس منشا کو کسی دوسرے لفظ سے ہم آج بھی سمجھانے پر قادر نہیں ہیں، گویا یوں سمجھنا چاہیئے کہ ہماری تعلیمی زندگی میں دارالعلوم کے حجام مولی میاں کا بھی ساتھ تھا، فقیر بعد میں جب کبھی دارالعلوم حاضر ہوتا، تو مولی میاں کو ضرور تلاش کرتا، لیکن بیچارے کا وقت ہم لوگوں کے بعد جلد پورا ہوگیا۔ **اللّٰھم اغفرله وارحمه.**

(دارالعلوم میں بیتے ہوئے دن)

مضمون حضرۃ الاستاذ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی

مدرس دارالعلوم دیوبند

عشق و محبت کی بحث میں تم نے مجنون و لیلیٰ کے تذکرے پڑھے، قیس و فرہاد کی داستانیں سنیں اور یہ تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ رات کے وقت جب شمع روشن ہوتی ہے، تو ہزاروں پروانے اپنی چھوٹی چھوٹی ہستیوں کو کس اشتیاق اور بے تابی کے ساتھ شمع کی لو پر نثار کرتے اور تن من کو جلا ڈالتے ہیں، لیکن تم کو غالباً کبھی ایسے پروانوں کو دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا ہوگا، جنہوں نے شمع کی آگ میں اپنے کو اس لئے جلا ہو کہ وہ جلنے سے بچ جائیں اور اس لئے فنا کیا ہو کہ وہ پھر کبھی فنا نہ ہوں، چمن میں خاموش پھولوں کے اردگرد سینکڑوں دفعہ بلبلوں کے چہچہے سنے ہوں گے، پر ایسا ایک واقعہ بھی نہ سنا ہوگا کہ شاہد گل تو خود چہچہا رہا ہو اور شور مچانے والی بلبلیں ساکت وصامت رہ کر اس کے ایک ایک لفظ کو چن رہی ہوں۔

پس آؤ کہ تم کو حجاز کی سرزمین میں کے نور سے روشن کی ہوئی وہ شمع محمد دکھلائیں، جس پر لاکھوں پروانوں نے اپنی ہستیوں کو محض اس لئے جلا ڈالا کہ وہ خدا کی سب سے بڑی دہکتی ہوئی آگ کی لپٹ سے محفوظ ہو جائیں اور اپنی چند روزہ حیات کو اس کے قدموں پر اس لئے قربان کر دیا کہ ان کو دائمی زندگی حاصل ہو۔

عرب کے خشک ریگستانوں اور بے آب وگیاہ پہاڑوں میں (خدا کی قدرت دیکھو کہ) ایک غنچے میں چٹک پیدا ہوئی اور ایک ایسا پھول کھلا، جس کی مست کر دینے والی مہک کے سامنے مشک و گلاب کی بھی حقیقت نہ رہ گئی اور جب بلبلوں کے دماغوں میں اس کی مدہوش کر دینے والی خوشبو پہنچی، تو انہوں نے جمع ہو کر خوب شور مچانا شروع کیا، اس پر چمنستان نبوت کا وہ گل سرسبد گویا ہوا اور اپنے نغمۂ طرب افزا سے سب کی زبانیں خاموش کر دیں، پھر کیا تھا بلبلیں اس کا لحن داؤدی سننے کے لئے گردنیں جھکا جھکا کر اور پر سمیٹ سمیٹ کر بیٹھ گئیں اور جو لفظ بھی اس کی زبان سے نکلا، اس کو اٹھا لیا اور جو کلمہ بھی سنا، اس کو

فوراً دل کی تختی پر لکھ لیا۔

میرے اس بیان کو تم محض شاعریت مت سمجھو، بلکہ اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پڑھو اور آپ کے ساتھ ان کے شغف اور تعلق کا اندازہ لگاؤ، تو تم کو صاف معلوم ہو جائے گا کہ وہ آپ کے اصحاب بھی تھے اور شاگرد بھی، عاشق جاں نثار بھی تھے اور درم ناخریدہ غلام بھی، مؤدب بھی تھے اور شاگرد بھی اور بے تکلف بھی، آپ کو اپنا محبوب بھی سمجھتے تھے اور بادشاہ بھی، نبی بھی مانتے تھے، پدر بزرگوار بھی، پھر ایسی حالت میں یہ کیونکر ہو سکتا تھا کہ وہ آپ کے آثار اور روایت میں سے کسی ایک کو بھی ضائع کر دیتے، یا ان کے نشر و اشاعت میں ادنیٰ بے اعتنائی کو کام میں لاتے، صرف ابو ہریرہ، عبداللہ بن عمرو بن العاص، عبادلہ ثلاثہ اور عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم اجمعین کی روایات کا تتبع ہی ہم کو یہ جتلانے کے لیے کافی ہے کہ آپ ﷺ نے شاید تیس برس کے عرصے میں کوئی سانس نہیں لی اور ایک قدم نہیں اٹھایا اور کبھی لبوں کو حرکت نہیں دی، مگر آپ کے اصحاب نے اس کو پورے اہتمام کے ساتھ قلم بند کر لیا اور یا کاغذ کے اوراق سے بھی زیادہ پائیدار یادداشت میں محفوظ رکھا اور یہ اس لیے کہ انہوں نے زندگی کے ہر شعبہ میں آپ ہی کی ذات بابرکت کو اسوۂ حسنہ ٹھہرا لیا تھا اور دین و دنیا کے ہر ایک کام میں وہ آپ ہی کے اقوال واحوال کو (جن پر (ان ھو الا وحی یوحیٰ) کی مہر ہو چکی تھی) دلیل راہ مان چکے تھے۔

بعدہ انہوں نے تمام دنیا کو اسی ایک مقصد (علی بصیرۃ انا و من اتبعنی) کی طرف دعوت دی، جس کے لبیک کہنے کے لیے مشارق و مغارب سے لوگ امنڈ پڑے اور کسی صحابی سے ایک حدیث سن لینے کو انہوں نے کل دنیا اور مافیہا سے زیادہ قیمتی سمجھا اور پھر ان لوگوں کی راہِ طلب میں نہ سمندر کی موجیں حائل ہو سکیں اور نہ پہاڑوں کی بھاری بھاری چٹانیں، جنگل و بیابان قطع کرتے ہوئے اور پہاڑوں کو پھلانگتے ہوئے وہاں پہنچے، جہاں کہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار مبارک سے آنکھیں روشن کرنے والے موجود تھے۔ مکہ، مدینہ، کوفہ، بصرہ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پڑھنے پڑھانے والوں سے بھر گیا اور کل دشت و جبل نعرۂ حدیث سے گونج اٹھے، اسی طرح یہ سلسلہ خلفاً عن سلفٍ چلا اور بیسیوں علوم خاص فنِ حدیث کے لیے مدون ہو گئے، یہاں تک کہ ثریا تک پرواز

کرنے والوں عجمیوں کی ایک جماعت نے روایات اور الفاظ حدیث کا ایک چھانا اور تایا ہوا صحیح وصاف ذخیرہ جس میں وضاعین اور کذابین کے بطالت انگیز مکائد کی ذرہ برابر بھی آمیزش نہ تھی، ہمارے ہاتھوں میں قیامت تک کے لیے چھوڑ دیا اور ایک دوسرے گروہ نے (جو ((لعلمه الذین یستنبطونه منهم)) میں شامل تھا) ان احادیث کے اسرار و معارف اور اصول وفروع منضبط کر کے سینکڑوں علوم اسلامیہ کی بنیاد ڈالی۔ انہوں نے یہ بخوبی ثابت کر دکھایا کہ نہ تو دنیا کا کوئی فلسفہ ان تعلیمات کا مقابلہ کرسکتا ہے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پیروؤں کو دی ہیں اور نہ مصریوں کا ابلہ فریب تمدن اور نہ حکمتِ یونان کی عظام رمیم (گلی سڑی ہڈیاں)

فریب رائے عزیزاں چراخورم کہ مرا
حدیثِ سیدِ کونین برزبان باقیست

اس زمانے کے ملوک وسلاطین کی توجہ اور حوصلہ افزائی بھی داد دینے کے قابل ہے کہ انہوں نے علمائے حدیث کے آگے زانوئے تلمذتہ کیا، خود محدث بنے، اوروں کو اس طرف رغبت دلائی، حتی کہ دمشق اور قاہرہ وغیرہ میں خاص دارالحدیث کے نام سے عمارتیں بنوا کر آئندہ نسلوں کے لیے نیک مثالیں قائم کیں، گویا اس طرح وہ امانت جو قلم نے بطون اوراق میں جمع کی تھی، مدراس کے کمروں کے سپرد کی گئی۔

تاریخ کی ضخیم جلدیں اس چھوٹے سے اشتہار میں نہیں سما سکتیں، جن سے تم کو یہ معلوم ہوتا کہ اب سے چند صدی پہلے کس طرح مسلمانوں کی غفلت اور کم ہمتی، یا سہل انگاری سے بالخصوص ہندوستان میں علم حدیث (اور صحیح معنوں میں علم حدیث) قریباً ناپید رہا اور پھر کس طرح دہلی کے ایک حکیم امت نے مدینہ منورہ سے ایک نہر کاٹ کر نئی روانی اور حیرت انگیز آب وتاب کے ساتھ ہندوستان کی بنجر زمین میں جاری کی اور پھر کس صورت سے اس کے حقیقی وارثوں نے اس کو خشک ہونے سے بچایا۔

میرے نزدیک آپ کو تاریخ کے سارے دفتر کو الٹ پلٹ کرنے کی ضرورت نہیں، دیوبند میں آجاؤ اور قاسمی، رشیدی، بلکہ ولی اللٰہی دارالعلوم کو دیکھ لو، وہ خود فن حدیث وفقہ کی ایک مجسم تاریخ ہے، کیونکہ اسی نے آج اس کساد بازاری کے زمانے میں اس متاع گرانمایہ

کو رواج دیا، جس کو مسلمان اپنی بد قسمتی سے کھو بیٹھے تھے، یہاں پہنچ کر کس طرح آج بھی اعناق، مطایا کو قطع کر کے طالبین حدیث کے جوق در جوق مختلف اقطار و اکناف سے چلے آ رہے ہیں اور کس طرح امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے ہم وطن آج دیوبند کے دارالعلوم سے ان کے قدیم ترکہ کو بخارہ پہنچانے میں سرگرم ہیں اور کس طرح اس نہر کے چند قطرے مدینہ طیبہ پہنچ کر اپنے اصلی سرچشمہ میں جا ملے ہیں۔

مشتاقان حدیث اور عاشقانِ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ہجوم کو دیکھ کر منتظمین دارالعلوم بھی تنگ مکانی سے گھبرا اٹھے اور تقریباً چھ سال ہوئے کہ انہوں نے تاسیس دارالحدث کے متعلق آواز بلند کی، مسلمانوں کے ہر طبقے نے اس کو سنا اور ایسے قبول عام کے ساتھ سنا کہ جس کی نظیر کم از کم میری نگاہ سے تاریخ میں نہیں گزری۔ میں نے کسی دارالحدیث، بلکہ کسی درسگاہ کی نسبت نہیں پڑھا کہ اس میں جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام، ائمہ مجتہدین اور مشائخ عظام رضی اللہ عنہم کی طرف سے ہزاروں آدمیوں نے چندے بھیجے ہوں اور ایسی مبشرات بیان کی ہوں، جو دارالحدیث دیوبند کی نسبت بیان کی گئیں، زیادہ تفصیل کا یہ موقع نہیں، لیکن میں اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جو دارالحدیث عہد ماضی میں بنائے گئے، ان کے بانی سلاطین اور فرمانروا تھے اور اس کے محرک وساعی عموماً فقراء اور متوسط الحال لوگوں کی ایک جماعت ہے۔

بہر حال چھ سال ہوئے یہ غلغلہ اٹھا اور ایک نہایت معقول رقم جس کی تفصیل کسی دوسری اشاعت میں معلوم ہو سکے گی، چند یوم میں بغیر کسی معتد بہ مادی کشش کے اس مد میں پہنچ گئی، اس کے بعد یکا یک وہ پھر خاموشی سے بدل گیا، جس کی بہت سی وجوہ عوام نے طبعاً اختراع کر لیں، لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ ایک سرکاری گندے نالے کے حائل ہونے کی وجہ سے بڑے عرصے تک یہ مقدس کام رکا رہا۔

پیہم مساعی کے بعد خداوند تعالیٰ نے گورنمنٹ عالیہ کو اس طرف متوجہ کیا اور موجودہ ہز آنر نواب لفٹیننٹ گورنر بہادر کی قابل شکریہ عنایات خاصہ سے دارالعلوم کے اربابِ حل و عقد اس مشکل پر غالب آئے، یہاں تک کہ پاکی نے ناپاکی کو دور کر دیا اور آفتاب قدس کی شعاعوں کو نجاست کے چھینٹے گندہ نہ بنا سکے اور ((اما لزبد فیذھب جفاء و اما ما ینفع

الناس فیمکث فی الارض)) کی مثل پوری صادق ہوئی۔ والحمد للہ علیٰ ذالک

اب جماعتِ اسلام اور اخوان صدق وصفا کی اطلاع کے لئے یہ اعلان شائع کیا جاتا ہے کہ بحمد اللہ دار الحدیث کی عالیشان بنیادیں جو دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں، بھری گئیں اور عمارت کا نقشہ زمین پر قائم ہو گیا اور نہایت سرعت کے ساتھ کام جاری ہے، لیکن یہ سرعت جب ہی قائم رہ سکتی ہے، جب کہ ہماری قوم زائد از زائد توجہ سے کام لے، کیونکہ یہ لاکھ سوا لاکھ روپیہ کا تخمینہ اولاً خدا کے فضل و رحمت اور ثانیاً مسلمانوں کی اعلیٰ درجہ کی توجہ سے انجام پا سکتا ہے، مسلمانان ہندوستان کی ہمت و سعی نے کام کر دکھایا اور رسول اللہ صلی الہ علیہ وسلم اور آپ کی امت کے اولیاء و علماء کی یہ رفیع المنزلت یادگار سرزمین ہند پر قائم ہو گئی، تو انشاء اللہ العزیز یہ ایک ایسی یادگار ہو گی، جو دنیا میں تا بدیر مسلمانوں کی عظمت و وقعت کو زندہ رکھے گی اور آخرت میں ذخائر حسنات ان کے ساتھ ہوں گے۔

خداوند رب العزت کے فضل و کرم سے جس کی مہربانی ہمیشہ اپنے تمام بندوں پر مبذول رہتی ہے، یقین ہے کہ اگر ہم سب اس کے سامنے گردن جھکا کر اور خالص اس کے افضال پر بھروسہ کر کے اور اپنی غفلت شعاریوں کو چھوڑ کر کوشش کریں گے، تو وہ ضرور اپنی رحمت کی بارش ہم پر کرے گا، جس سے امیدوں کی تمام کھیتیاں لہلہا اٹھیں گی اور کوئی مشکل ایسی نہ رہے گی، جو آسانی سے نہ بدل جائے گی۔

فضل اللہ کا کس حال میں شامل نہ رہا
ایک دم بھی وہ کبھی لطف سے غافل نہ رہا
حال اپنا ہی کسی کام کے قابل نہیں رہا
ورنہ یہ سخت غلط ہے کہ وہ مائل نہ رہا
اے کہ خواہی بجہاں اشرف و ممتاز آئی
می نشاند کہ زپندار بہ پرواز آئی

پس اے خدائے قدیر۔

مو بمود عقدۂ دشوار ہیں آساں کرد
سر بسر درد کی تصویریں درماں کردے

خوگر گریۂ اندوہ کو خنداں کردے
تجھ میں قدرت ہے کہ کانٹے کو گلستاں کردے
شد فراموش جہاں قصہ پارینۂ ما
باز نقدے برواج آرز گنجینہ ما

(القاسم ربیع الثانی ۱۳۳۵ھ، صفحہ ۵ سے ۹ تک)

رقمزدہ

شبیر احمد عثمانی عفا اللہ عنہ

مدرس دار العلوم دیوبند

مورخہ ۲۴ محرم الحرام ۱۳۳۵ھ

دار الحدیث سے متعلق علامہ کا یہ مضمون، حدیث کی عظمت، دار الحدیث کی تاریخی شوکت اور زبان کی طلاقت کا پتہ دیتا ہے، آپ کے اس مضمون کا خاطر خواہ اثر ہوا، القاسم کے اوراق سے اس کے ردعمل اور تعاون کا پتہ چلتا ہے، اس کے بعد علامہ نے اس سلسلے میں اور کوئی قدم اٹھایا، یا نہیں، نظر سے نہیں گزرا، البتہ تعمیر کا سلسلہ جاری رہا، حتی کہ پورے طور پر اس کی تکمیل ۱۳۴۹ھ مطابق ۱۹۳۱ء میں ہوئی، جس کا طول اڑسٹھ فٹ اور عرض پینتیس فٹ ہے اور جس کا نقشہ سید عاشق حسین صاحب ریاست انجینئر بہاولپور نے بنایا، مجھے تو اس سلسلے میں یہ کہنا تھا کہ القاسم کے اوراق میں دار العلوم کی علمی اور عملی خدمات میں علامہ عثمانی کے حالات جا بجا ملتے ہیں اور اسی سلسلے کی ایک کڑی دار الحدیث کے لئے علمی اقدام مضمون کی صورت میں اور عملی قدم خورجہ پہنچنے اور اس کے مالی امداد کے لیے اٹھایا۔

(ماخوذ حیات عثمانی)

میری محسن کتابیں اور ابتدائی حالات

مولانا مناظر احسن گیلانی
صدر شعبہ اسلامیات، جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد دکن

مولانا مناظر احسن گیلانی بہار کی مردخیز سرزمین سے تعلق رکھتے تھے، ۹ ربیع الاول ۱۳۱۰ھ کو اپنے ننھیال استھانواں میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم اپنے آبائی وطن گیلان میں اپنے چچا حکیم سید ابوالنصر مرحوم سے پائی، ۱۳۲۴ھ میں مشہور معقولی عالم مولانا برکات احمد صاحب مرحوم کے ہاں ٹونک گئے اور سات سال تک معقولات کی چھوٹی بڑی کتابیں ان سے پڑھیں۔

پھر علوم اسلامیہ کے مرکز ''دارالعلوم دیوبند'' میں داخلہ لیا۔ ۱۳۳۲ھ میں دورۂ حدیث میں شریک ہوکر دارالعلوم سے کتبِ حدیث کی سند حاصل کی، دارالعلوم میں آپ نے جن نابغۂ روزگار شخصیات سے استفادہ کیا، ان میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن، علامہ انور شاہ کشمیری اور مولانا شبیر احمد عثمانی (رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم) ہیں۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد دارالعلوم سے نکلنے والے علمی رسائل ''القاسم'' اور ''الرشید'' میں مدیر کی حیثیت سے کچھ عرصہ کام کیا، ان رسالوں میں علمی و تحقیقی مضامین لکھ کر آپ نے علمی حلقوں میں نمایاں مقام حاصل کیا۔ ''سوانحِ ابو ذر غفاری'' اور ''کائنات روحانی'' دونوں کتابیں اسی دور کی یادگار ہیں۔

دارالعلوم کے مہتمم مولانا حافظ محمد احمد کی سفارش پر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن میں شعبہ اسلامیات میں آپ کا تقرّر ہوا اور جلد ہی آپ اس شعبہ کے صدر بنا دیئے گئے۔ تقریباً پچیس برس تک حیدرآباد میں علمی خدمات سرانجام دیں، اس دوران ہزاروں تشنگانِ علوم کو آپ نے سیراب کیا۔ ''النبی الخاتم'' ''الدین القیم'' ''تدوینِ حدیث'' ''ہزار سال پہلے'' ''نظام تعلیم و تربیت'' اسی زمانے کے آپ کے علمی شاہکار ہیں۔ اس کے علاوہ

سینکڑوں مقالات ومضامین آپ کی قلم سے نکلے اور ملک کے بلند پایہ رسائل وجرائد میں شائع ہوئے۔ آپ کی سب سے آخری تصنیف ''سوانح قاسمی'' ہے، جو مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ، بانی دارالعلوم دیوبند کے حالات وکمالات پر مکمل ومفصل تالیف ہے، آپ کی تصنیفات میں خطیبوں کا جوش وبرجستگی، عشاق کی مستی ووارفتگی، عقل وجذب کی لطیف آمیزش، معمولی اور مشہور واقعات سے لطیف نکتے اور عجیب نتیجے نکالتے چلے جانا اور اس سرعت وکثرت اور البیلے انداز میں کہ پڑھنے والا مصنف سے شکایت کرنے لگتا ہے کہ:

دامانِ نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار

یہ صرف علم وانشاء پردازی کی کرشمہ سازیاں نہیں، بلکہ اُن کے اندر سوزِ دروں اور خونِ جگر بھی شامل ہے اور واقع یہی ہے کہ:

رنگ ہو، یا خشت وسنگ چنگ ہو، یا حرف وصوت
معجزۂ فن کی ہے ، خونِ جگر سے نمود

حکیم الاسلام قاری محمد طیب قاسمی تحریر فرماتے ہیں کہ:

''حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم مشاہیر فضلائے دارالعلوم میں سے تھے، صاحب طرز مصنف، ذہن وذکاء اور طباعی میں منفرد تھے۔ تحصیل علوم سے فراغت کے بعد دارالعلوم کے رسالہ ''القاسم'' کے ایڈیٹر منتخب کئے گئے اور عرصۂ دراز تک قلمی خدمات سے ہندوستان کے علمی حلقوں کو مستفید کرتے رہے۔ اس کے بعد حافظ محمد احمد قاسمی رحمۃ اللہ علیہ کی سفارش پر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ اس دوران بہت سی مفید اور علمی تصانیف آپ کے قلم سے نکلیں، جن میں ''کائناتِ روحانی'' ''سوانح ابوذر غفاری'' ''النبی الخاتم'' ''اسلامی معاشیات'' ''امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی'' وغیرہ آپ کی مخصوص ومشہور تصانیف ہیں، آخر زندگی میں احقر کی فرمائش پر ''سوانح قاسمی'' تین جلدوں میں مرتب کی، جو آپ کی تصانیف میں ایک شاہکار تصنیف ہے، اس کے بارے میں جب احقر نے ان سے فرمائش کی، تو بہت خوشی اور اُمنگ سے اُسے قبول کرتے ہوئے کہا کہ: ''میری علمی زندگی کی ابتداء ''القاسم'' ہی سے ہوئی تھی اور انتہاء بھی شاید ''القاسم'' یعنی: حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی ہی پر ہوگی'' چنانچہ یہی ہوا کہ سوانح قاسم کی چوتھی جلد آپ نے شروع

کی، پانچ صفحے لکھنے پائے تھے کہ عمر فانی نے جواب دے دیا اور "القاسم" پر انتہاء ہوگئی"۔

(تاریخ دار العلوم دیوبند)

آپ کے شیخ ومربی حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ان الفاظ سے کہ:

"مناظر احسن کے سارے مناظر احسن ہیں"۔

آپ کے علمی وروحانی مقام بلند کا اندازہ ہوتا ہے۔

قیام پاکستان کے بعد شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثانی کی دعوت پر پاکستان تشریف لائے اور اسلامی آئین کی ترتیب وتدوین میں حصہ لیا اور مسودۂ آئین کی تیاری کے بعد واپس وطن تشریف لے گئے، ایک عرصہ تک بیمار رہے، طویل علالت کے بعد اپنے وطن "گیلان" ہی میں ۲۵ شوال ۱۳۷۵ھ بمطابق ۵ جون ۱۹۵۶ء کو وفات ہوئی۔

مرگِ مجنون پہ عقل گم ہے میر
کیا دیوانے نے موت پائی ہے

ابتدائی تعلیم

خاکسار کا خاندان چند پشتوں سے مولویوں کا خاندان ہے، میرے جد امجد مولانا محمد احسن گیلانی مرحوم صوبہ بہار کے مشہور معقولی مدرس تھے، والد مرحوم تو نہیں، لیکن میرے عمِّ مغفور مولانا حکیم حافظ سید ابوالنصر گیلانی رحمۃ اللہ علیہ درس نظامیہ کے عالم تھے، درس و تدریس کا مشغلہ تو ان کا کم تھا، لیکن مطالعہ میں مسلسل منہمک رہتے تھے، اس زمانہ کے عام مولویوں کے اعتبار سے ان کا مطالعہ کا دائرہ کار وسیع تھا، عربی، فارسی کے ساتھ ساتھ اردو کی علمی کتابوں کا پڑھ لینا اپنی کسرِ شان نہیں سمجھتے تھے، اس لیے مولانا شبلی، سرسید، حالی، ڈپٹی نذیر احمد وغیرہ جیسے لوگوں کی کتابوں تک کا مطالعہ بہ شوق کرتے تھے، اگرچہ ان لوگوں کے مستغربانہ میلانات سے متفق نہیں تھے، میں نے ان ہی کے آغوش تربیت میں آنکھیں کھولیں، چونکہ خود "لاولد" تھے، اس لیے بجائے بیٹے کے مجھے مانتے اور چاہتے تھے، تین ہی سال کی عمر میں جب الفاظ کے تلفظ پر زبان گونہ قادر ہو چکی تھی، سینکڑوں فارسی کے الفاظ

مجھے یاد کرادیے تھے، یہ واقعہ ہے کہ ایک زمانہ تک کتے کو "سگ" کے سوا میں نہیں جانتا تھا کہ کچھ اور بھی کہتے ہیں، بعض دفعہ گھر کی عورتوں کو میری اس فارسی دانی سے کافی مشقت میں مبتلا ہونا پڑا،[1] اسی زمانہ میں دادا مرحوم کے ایک پنجابی شاگرد ملا عبداللہ مرحوم میرے گاؤں میں توطّن پذیر ہوگئے تھے اور مختلف مؤثرات کے تحت دہلی جاکر مولانا نذیر حسین مرحوم کے حلقہ میں پہنچ کر حنفی مسلک، کو چھوڑ کر عمل بالحدیث، یا غیر مقلدیت کا مسلک اختیار کرلیا تھا، چچا مرحوم سخت غالی حنفی تھے، ملا عبداللہ سے، حالانکہ انہوں نے کچھ پڑھا بھی تھا، لیکن مقلدیت وغیر مقلدیت کی بحث میں اُلجھ کر دونوں میں مختلف کلی اور جزئی مسائل کے متعلق رات دن مباحث کا بازار گرم رہتا تھا، خصوصاً طلاق ثلثہ مجلس واحد مغلظہ ہے، یا رجعی، اس نزاع میں تو رسالہ بازیوں تک کی نوبت آئی، طرفین سے متعدد رسالے تھوڑے تھوڑے وقفہ سے شائع ہوتے رہتے تھے، میں نے جب ہوش سنبھالا اور چچا مرحوم ہی سے مکتبی تعلیم کا آغاز ہوا، تو میرا علمی ماحول یہی تھا، ابن حجرؒ، ابن قیمؒ، ابن تیمیہؒ، شوکانیؒ ان باتوں کی بار بار تکرار سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم ان ہی لوگوں میں پیدا ہوئے ہیں اور جب ان لوگوں کی یہ حالت تھی، تو پھر بخاریؒ، مسلمؒ، امام ابوحنیفہؒ، ابو یوسفؒ، ابوہریرہؓ، ابن عمرؓ کے متعلق اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ کیا حال ہوگا....؟! اس مکتبی دور میں مجھ پر سب سے زیادہ کس کتاب کا اثر پڑا، وہ عجیب ہے، فطرتاً میں سخت بدشوق بچوں میں شمار ہوتا تھا، چچا مرحوم نے مار مار کر میری کھال تک بعض دفعہ ادھیڑ دی، لیکن پڑھنے کی چوری سے کبھی باز نہ آتا تھا، اتفاقاً ایک اردو کی کتاب جس کے ابتدائی صفحات غائب تھے، کہیں گھر میں مل گئی، یہ کسی انگریزی کتاب کا ترجمہ تھا، اب بھی نہیں معلوم کہ اس کا نام کیا تھا، لیکن اس کا اثر اب تک زندہ ہے، قصہ کی کتاب تھی، پورا قصہ تو اب یاد نہیں رہا، اتنا یاد رہ گیا ہے کہ ایک پادری اپنے باغ میں رہتا تھا، بچوں کو کچھ پڑھاتا بھی تھا اور نجاری وغیرہ، جیسی بعض صنعتیں بھی سکھاتا تھا،

---

[1]:..... اپنی ننھیال موضوع استھانواں میں تھا، عورتیں کسی تقریب میں باہر گئی ہوئی تھیں، اکیلا میں ہی گھر میں تھا، یا اور کوئی کھلائی بھی ہو، بہرحال میں نے باورچی خانہ میں کتے کو جاتے دیکھا، عورتیں جب آ گئیں، تو میں نے اپنی تائی صاحبہ کو مخاطب کرکے کہنا شروع کیا: "سگ آیا تھا، بھات کھا گیا"۔ وہ بیچاری حیران کہ ساگ بھات کو کھا گیا، کیا مطلب ہے؟ والدہ مرحومہ میری اصطلاحوں سے واقف تھیں، جب وہ آئیں، تب مسئلہ حل ہوا۔ ۱۲

طلبہ کو اپنے باغ کے میوے رس بھری وغیرہ کھلاتا تھا، بچوں میں ہری اور ٹامی دو خاص کیریکٹر کے لڑکے تھے، ان میں ہری سعادت کا اور ٹومی شقاوت کا نمونہ تھا، ہری کے جو حالات اس کتاب میں درج تھے، ان سے غیر شعوری طور پر میرا دل متاثر ہوا اور اس کی زندگی کا جو نقشہ پیش کیا گیا تھا، ایسا محسوس ہوا کہ کاش! یہی زندگی مجھے بھی میسر آتی اور اب مجھ پر کچھ پڑھنے کا شوق گدگدی لینے لگا، لیکن چچا مرحوم کی بدگمانیوں کا شکار تھا، پٹائی کا سلسلہ مسلسل جاری تھا اور اب اس کے بعد میرے لئے یہ مار دھاڑ بجائے نفع کے باعث نقصان بنتی چلی جا رہی ہے، اسی عرصہ میں چند دوستوں نے مجھے ''داستان امیر حمزہ'' دکھائی، اس کی دلچسپیوں نے مجھے ہوش ربا کے طلسم میں گرفتار کر دیا، مجھ پر تو جو گزرنی تھی، گزر گئی، لیکن عمر اس وقت غالباً دس گیارہ سال کی ہوگی، جب اس مرض میں گرفتار ہوا، گاؤں کے ایک رئیس بابو ظہور محسن مرحوم کو بھی قصہ کہانیوں کی کتابوں سے حد اغراق تک دلچسپی تھی، میری بدقسمتی تھی کہ انہوں نے ''نول کشور پریس'' کے ان سارے خرافات کو جن کا ''داستان امیر حمزہ'' سے تعلق ہے، منگوالیا تھا۔ ''کوچک باختر بالا باختر'' ''ہفت پیکر'' ''نور افشاں'' ''ایرج نامہ'' اور خدا جانے کیا کیا....؟ اب تو سب کے نام بھی یاد نہیں، ہر ایک کتاب تک میری رسائی بآسانی ہو رہی تھی، متعلقہ مکتبی اسباق سب بالائے طاق ہو گئے، صرف ان ہی داستانوں میں غرق ہو گیا، چچا صاحب کو میرے اس انہماک کا احساس ہوا، کچھ نگرانی کرنے لگے، یہ واقعہ ہے کہ بیت الخلاء میں کتاب کو چھپا کر رکھ آتا اور پھر قضاء ضرورت کے حیلہ سے اسی بدبو کدہ میں بیٹھا ان کتابوں کا مطالعہ کرتا رہتا، رات بھر میں نے مدتوں یوں گزاری کہ صبح ہو گئی اور میں ہوں، میری یہ داستان ہے! خیر، یہ تو چنداں مضر بات نہ تھی، اس سے زیادہ اس کتاب نے ہم پر حملہ کیا اور طبیعت ان واقعات کی نقل اپنی زندگی میں اتارنے کی کوشش کرنے لگی، جن سے کتاب مملو ہے، کیا کیا لکھو کہ پھر اس راہ میں مجھ پر کیا گزری، حد یہ ہے کہ عیاری جو اس کتاب کا مخصوص حصہ ہے اور مکر و فریب، دھوکہ چالاکی بھی اس کا خلاصہ ہے، میں نے مدتوں بطور فضائل کے خود اس کی مشق کی اور اپنے ہمجولیوں میں جو غریب اس کتاب سے ناواقف تھے، ان کا امام بن کر مختلف طریقوں سے ان عیاریوں کی عملی مشق میں مصروف ہو گیا، وہ تو خدا کا فضل ہوا کہ پرواز بہ مقدار عمر تھی، گاؤں کے باغ اور کھیت میری اور میرے

شاگردوں کی عیاریوں کی جولانگاہ تھے، غریب دیہاتیوں کو طرح طرح سے ستایا کرتا اور ان کی چیزوں کو برباد کر کے خوش ہوتا کہ عیاری خوب کامیاب رہی، ابھی شباب اور شبابیات سے بیگانہ تھا، اگرچہ بتدریج ان کے آثار چپکے چپکے ابھر رہے تھے اور شاید میری بربادی یقینی تھی، اگر ٹھیک عنفوان شباب ہی میں قدرت مجھے اپنے دیہاتی ساتھیوں سے الگ نہ کر لیتی۔

پہلے انگریزی تعلیم کا چچا کو خیال تھا، بھاگل پور اسکول میں نام لکھانے کے لیے بھیجا بھی گیا، انگریزی کی ابتدائی ایک دو کتابیں دیہات ہی میں ختم ہو چکی تھیں، لیکن کسی لطیفۂ غیبی نے میری رفاقت کی، ایسے قدرتی موانع پیش آئے کہ یکایک میری تعلیم کا پروگرام بدل گیا اور اچانک اس طلسمی قید سے نکل کر قدرت نے مجھے بہارے سینکڑوں میل دور راجپوتانہ کے ریگستانوں میں پہنچا دیا، یعنی :ریاست ٹونک کے مشہور منطقی و معقول عالم حضرت مولانا برکات احمد بہادری رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں رشتہ داری کے تعلق سے چچا مرحوم نے پہنچا دیا، پھر میں نہیں کہہ سکتا کہ کن نامعلوم اسباب کے تحت ماحول کے اس انقلاب نے میرے دل ودماغ کو بدل دیا، ہوش ربا کی داستان کا قصہ ختم ہو گیا، جو جادو اس کتاب نے مجھے پر چلایا تھا، اس کے اثر سے خود بخود شفایاب ہو گیا، اب میرا شمار مولانا مرحوم کے شوقین محنتی ذہین طلبہ میں ہونے لگا، حالانکہ چچا مرحوم کے زدوکوب نے مجھے یہ یقین دلا دیا تھا کہ میں سخت کوڑھ مغز واقع ہوا ہوں، ورنہ صبح وشام اتنی مار کیوں کھاتا، اس سلسلہ میں ’’داستان امیر حمزہ‘‘ کے عیبوں کے ساتھ اس کے ایک ہنر کا بھی ذکر نہ کرنا، ناشکری بھی اور شاید گونہ حق پوشی بھی ہوگی، داستان کے اس طویل سلسلہ کا اگر تجزیہ کیا جائے، تو کل تین اجزاء پر ساری کتابیں مشتمل نظر آئیں گی:

۱۔ایک تو وہی عمرو عیار اور ان کے تلامذہ کے عیارانہ کرتب۔

۲۔امیر حمزہ اور ان کے احفاد و اولاد در اولاد، بلکہ عیاروں کے حسن وعشق کے افسانے۔

۳۔فرضی کفار کے مقابلہ میں فرضی مسلمانوں کا فاتحانہ استیلاء۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ پہلے جز کے ساحرانہ نتائج کا تو میں شکار ہی ہو گیا، خود بھی ہوا اور کتنوں کو اس فراک کا نخچیر بنایا، خود تو خیر کم سنی کی وجہ سے صرف باغوں اور کھیتوں تک

محدود رہا، لیکن میرے ایک ہمجولی میاں معین الدین عرف منا گیلان ہی میں میرے بعد کچھ دن رہے اور اب تقریباً بیس پچیس سال سے مفقود الخبر ہیں، بعضوں سے معلوم ہوا کہ ڈھاکہ کے علاقہ میں پہنچ کر ان پر جذب طاری ہو گیا اور اب ان کا شمار اس علاقہ کے مستجاب الدعوات فقراء میں ہے، ان بیچارے کو ٹونک سے واپسی کے بعد پایا کہ گاؤں کی مرغیوں اور بکریوں پر اپنی عیاریوں کی مشق کر رہے ہیں، ''داستان امیر حمزہ'' کے شروع میں عمرِ عیار کی طرف مرغی پکڑنے کی جو عیاری منسوب کی گئی ہے، یہ اسی کی تجلی تھی جو اس بیچارے کے عمل میں آ کر جلوہ گر ہوئی تھی، رہا دوسرا جز، تو اس وقت ان واقعات سے متاثر ہونے کی پوری صلاحیت ہی نہیں پیدا ہوئی تھی، البتہ تیسرے جز کا اگر بظاہر عملی طور پر مجھ پر کچھ اثر تھا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ غیر شعوری طور پر میری طبیعت نے اس کا اثر کچھ ضرور جذب کیا تھا اور کفر کے مقابلوں میں اسلام کے اعتلاء وسر بلندی کے جذبہ سے میرا دماغ اگر کبھی خالی نہ رہا، تو جہاں تک میں سمجھتا ہوں، اس میں اس داستان کے اس جز کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور ہے۔ اگر چہ اسی زمانہ میں چچا مرحوم کے اصرار سے واقدی کی فتوح الشام ومصر وغیرہ کا بھی میں نے مطالعہ کیا تھا اور گو آغاز جبراً ہوا تھا، لیکن آخر میں چچا مرحوم کی مرضی کے مطابق کسی چیز کو شوق سے کچھ دن میں پڑھا، تو واقدی کی یہی کتابیں تھیں اور اس جذبہ میں ان کتابوں کی تائید بھی ضرور شریک ہے۔ یہ بات کہ اردو ادب کے اس طویل سلسلہ کے مطالعہ نے میری ادبی قابلیت پر کچھ اثر ڈالا، یا نہیں؟ میرے نزدیک اس کا جواب نفی میں ہے کہ اس زمانہ میں لکھنے پڑھنے کا مجھ میں کسی قسم کا کوئی سلیقہ پیدا نہیں ہوا تھا اور تھوڑا بہت اگر تھا، تو وہ چچا مرحوم کی جبری تعلیم کا اثر تھا۔

اس ہوش ربائی داستان سرائی میں طوالت سے میں نے قصداً کام لیا ہے، کیونکہ اپنے ان ہی ذاتی تجربات کی بنیاد پر میں ان مسموم ادبی کتابوں اور رسالوں کو نوخیز بچوں اور نوجوانوں کے لیے ''سم قاتل'' قرار دیتا ہوں، جو حشراتی کیڑوں کی طرح آج آسمان و زمین سے ہر ہر گھر میں برس رہے ہیں، بچوں سے آگے بڑھ کر بچیوں تک کی تباہی و بربادی میں بے پناہ طوفانوں کا کام کر رہے ہیں، نسلیں برباد ہو رہی ہیں اور گھرانے اجڑ رہے ہیں، مگر اس شکل میں کہ ان کاغذی سانپوں اور بچھوؤں سے ماں باپ بخوشی اپنے بچوں کو ڈسا

رہے ہیں، حکومت مدد کر رہی ہے، قوم کے لیڈر ایجوکیشن اور خدا جانے کن کن مشنوں سے زہر کے یہ پیالے قوم کے نونہالوں کو بلیغ تقریروں اور فصیح اسپچوں کے ذریعے پلا رہے ہیں۔ فانا للہ وانا الیہ راجعون کہ تباہی کے اس طوفان کے انسداد کے سارے وسائل ختم ہو چکے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ ہونے والا ہے، وہ ہو کر رہے گا۔

ماقدر اللہ فسوف یکون، واذا اراد اللہ بقوم سوءً فلا مرد لہ وما لہ من وال

بہر حال یہ میری جاہلیت کا دورہ تھا، جو ٹونک پہنچنے کے ساتھ ہی ختم ہو گیا، اب واقعی علوم وفنون کا شوق مجھ پر مسلط تھا، شوق کی یہ حد تھی کہ باوجود مطبوع ہونے کے میں نے شدت ذوق میں منطق کی بعض کتابیں خود اپنے قلم سے لکھ لکھ کر پڑھیں اور ان ہی دنوں میں ایسا غوجی قلمی پر اپنے استاد کی تقریروں کو اردو میں بطور حاشیہ کے لکھتا جاتا تھا، جواب تک میرے کتب خانہ میں بطور یادگار کے محفوظ ہے، مولانا برکات احمد پر مولانا عبدالحق خیر آبادی کے رشید شاگردوں میں ہونے کی وجہ سے خیر آبادی اسکول کے اثرات غالب تھے، منطق و فلسفہ ان ہی دونوں علوم کا ان کے حلقۂ درس میں غلبہ تھا، مجھ پر بھی ان ہی کا تسلط قدرتی طور پر ہونا چاہئے تھا، سو ہوا، لیکن اسی کے ساتھ یہ چچا مرحوم کی ترکیب تھی کہ خطوط میں بعض خاص علمی وادبی رسائل واخبار کے مطالعہ کی تاکید فرماتے رہتے اور گو برکاتی ماحول اس مذاق سے قطعاً نا آشنا، بلکہ مخالف تھا، لیکن اس عرصہ میں میرا یہ مشغلہ برابر جاری رہا۔

(الرشید دیوبند)

کرشن کے ساتھ آریوں کی عداوت پر ایک نظر

جولائی ۱۷ء کے خطیب میں بذیل انتقاوات کتاب ''کرشن بیتی'' پر ایک بسیط مضمون درج ہے، میں نے چونکہ اس کتاب کو خود نہیں دیکھا ہے، اس لیے بالفعل اس کے متعلق ہم کوئی رائے نہیں دے سکتے، اسی طرح ناقد کے خیالات کی بھی نہ تصدیق کر سکتے ہیں اور نہ تکذیب کہ یہ سب باتیں کتاب کے معائنہ پر موقوف ہیں، بلکہ اسوقت سرِ دست میں اس طلسم کدہ حیرت کو توڑنا چاہتا ہوں، جس میں گرفتار ہو کر ایک موقع پر مضمون نگار کے قلم سے ذیل کے الفاظ نکل پڑے ہیں:

''آریہ سماجی تحریک خدا معلوم کیوں ان کو (کرشن) مذہبی پیشوا تسلیم نہیں کرتی اور مقدس گیتا کو انکی تصنیف نہیں مانتی، ہمیں نہیں معلوم کہ وہ کس تاریخی دلائل کی بناء پر اس مشہور و مسلم واقعہ سے انکار کرتے ہیں''۔

خوش اعتقاد مضمون نگار نے امید باندھی ہے کہ لالہ لاجپت رائے کی کتابوں میں ممکن ہے کہ اس تردّد، انتشار کی تسلی موجود ہو، لیکن لالہ لاجپت رائے کے گلے سے جس میں دیانندی مالا پڑا ہوا ہے، میں نہیں سمجھتا کہ وہ ایسی آواز سننے کے کیوں منتظر ہیں، آپ یقین کیجئے کہ دنیا کا کوئی آریہ اس حرف کو کبھی زبان پر نہیں لا سکتا، جس نے اسے بھاگوت، گیتا کی اہانت اور اس کے مقرر ''کرشن'' کی تذلیل پر مجبور کیا۔ ہاں!

خواہی کہ روشنت شود احوال سر عشق
از شمع پرس قصہ ز باد صبا پرس

گرچہ یہ ایک فسانہ طویل ہے اور مجھے اس کی تفصیل میں کم از کم ''بودہ مت'' اور اصل ''برہمی مذہب'' اس کے بعد براہمہ و متبعین بودہ کی باہمی جنگ آزمائیوں کا اور اخیر میں ان تمام تدبیروں کی تمام داستان دہرانی پڑے گی، جس کا نتیجہ آج ''سناتن دہرم'' کی صورت میں آپ کے سامنے ہے، لیکن مختصراً اتنا تو آپ سن ہی لیں۔

ہندو لٹریچر کے مطالعہ اور تفتیش کے بعد نہ صرف مجھ پر، بلکہ ہر ایک تشنہ تحقیق پر یہ راز واضح ہوتا ہے کہ توحید اور خالص توحید پر اس کی بناء تھی، نہ اس میں مادہ کا ذکر تھا اور نہ دیوتاؤں کا، نہ بھوتوں کا پوجا تھا اور نہ درختوں کے آگے سجود، کچھ بھی نہیں تھا، اگر اس وقت میں درپے تفصیل ہوتا، تو اس کی شہادتیں، دید اور اس کے علاوہ اور اپنشدوں، شاستروں، پروانوں سے آپ کے سامنے ان گنجان جنگلوں سے نکال کر پیش کرتا، جس میں بمشکل اس کا پتہ چلتا ہے۔

اس کے بعد یکا یک جدت پسند زمانے نے اس میں بھی نئے نئے شاخسانے پیدا کئے اور اس میں ہندوؤں کی تخصیص نہیں، شیطان کا عمل، ہر ایک ملت ومشرب میں بیّن طور پر موجود ہے، عیسائیت، یہودیت کو جانے دیجئے، خود آپ کا اسلام آج شرک والحاد کے بیشوں میں اس طرح مستور ہے کہ بغیر توفیق خداوندی کے، اصل توحید کو ذہین سے ذہین آدمی نہیں پاسکتا، تیرہ سو برس کے اندر مختلف دماغوں میں گھس کر ابلیس نے جتنے روڑے توحید مطلوب کے راستوں میں بچھا دیئے ہیں، تقریباً ناممکن ہوگیا ہے کہ بغیر اعانت الٰہی کے ہم اسے اٹھا سکتے ہیں۔

خدا کی تائید تھی کہ قرآن مجید میں تحریف لفظی نہ ہوسکی، ورنہ معنوی تحریفیں کر کر کے مشرکین اسلام نے قرآن کی کس آیت سے روحوں کے آگے انسانوں کو نہیں جھکوایا؟ نہ صرف روحوں، بلکہ بانس کے چھلکوں اور مٹی کے ڈھیروں کے سامنے موحد اعظم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متبعین کو مدعاؤں اور التجاؤں کے ساتھ آنکھوں میں آنسو بھر لانے کا عادی نہیں بنایا؟ جائیے اور صرف ہندوستان میں پشاور سے لے کر برہما کے ہر شہر اور ہر گاؤں میں ان ابلیسی اعمال کے مظاہروں کو ملاحظہ فرما کر اسلام اور حقیقی اسلام کے لئے ماتم کیجئے اور ان جبہ و دستار پر تعجب کیجئے کہ جس کے پیچ و دامن میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ معلم التوحید سید الدنیا والدین حضرت محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی الفت موجزن ہے۔ وما یومن اکثرھم الا وھم مشرکون

خیر یہ تو اپنی خانی باتیں ہیں، اس کے لیے ہم کب تک روئیں گے اور صرف رونے سے کیا ہوتا ہے؟ کہ ہمارا رونا تو زیادہ سے زیادہ گھنٹہ دو گھنٹے تک محدود ہوگا اور عرفی نے تو

گریہ صد سال کا انجام کو بھی نا کافی بتایا ہے۔فھل من مدّکر.

بہر کیف بحث اس میں تھی کہ اس کے بعد ہندوؤں میں رشیوں اور منیوں کا زور ہوا، ہندوستان کی شرک پرور ہوا اور کچھ عزت و جاہ نے، کچھ فلسفہ نے اور اخیر میں اسی نے جس نے ان باتوں کا بیڑہ آسمانوں پر اٹھایا تھا، یکا یک مورت اور تصاویر کو مختلف مصالح سمجھا کر یہاں کا معبود بنایا، ایک زمانہ اس پر گذرا، حتیٰ کہ (مگدھ) بہار کا مشہور مصلح، جس کو غلطی سے لوگ دہریہ اور منکر خدا کہتے ہیں بودھا اٹھا، کس جذبہ سے متاثر ہو کر اٹھا، ہمیں معلوم نہیں، لیکن اپنی محدود معلومات کی بناء پر (جو مجھے بودھ مت کے متعلق ہیں) کہہ سکتا ہوں کہ اس نے پھر توحید کی تعلیم دینی شروع کی۔

''اشوکی'' سلطنت نے اس کا مذہب اختیار کیا اور بت فروش برہمنوں کے لئیے قیامت آئی، خدا کا غضب بھڑکا اور وہ برباد کئے گئے، اس پر بھی ایک زمانہ گذرا اور پھر شیطان کی قوت کو نشو ونما شروع ہوئی، ادھر بودہی علماء نے بھی کلمات بودھ کو تختہ مشق بنانا شروع کیا، جس کا نتیجہ سب کو معلوم ہے اور اب تک آنکھوں کے سامنے ہے کہ وہی گنیش اور مہادیو مع اجزائیہ ہندوستان کے گھر گھر میں گڑے ہوئے تھے، ہر طاق اور ہر آنگن میں تلسی کے پیڑ کے نیچے مربع اور یا نصف کروی شکل کے اجسام، انسانی عقول و جذبات پر حاکم تھے اور اب تک ہیں، اس کے بعد اسلام آیا، صوفیاء اور علماء نے ابتداء ابتداء میں کوششیں کیں اور کامیاب ہوئے، کیونکہ اس وقت یہاں صرف کفر ہی کفر تھا، لیکن یکا یک اسلامی سلطنت کو وسعت ہوتی رہی اور مختلف جہات و امصار کے مسلمان ہندوستان میں سیلاب کی طرح بہہ کر آنے لگے، یہ وہ مسلمان تھے، جو روحوں کی پرستش، اور بانسوں کے چھلکوں کی تعظیم اور مٹی کے ڈھیر کے آگے پیکر اعتقاد بن کر کھڑے ہونے کے عادی ہو چکے تھے۔

جس گاؤں، جس قصبہ میں آئے، اپنے باپ دادا کی اگر وہ بزرگ ہوئے، ورنہ یونہی فرضی قبروں کے آگے عبادت و التجا دعا کرنے لگے، جسے آنحضرت نے مخ العبادۃ (مغز عبادت) فرمایا تھا، ان کے آگے نذر گذرانی، پھول چڑھائے، چادریں ڈالیں۔

مبلغین دم بخود تھے کہ اب ہندوؤں کو کیا سمجھایا جائے، جبکہ مسلمانوں کا یہ حال ہو۔ ہم اگر کسی ہندو سے کہتے ہیں کہ اپنے مٹی کے بت کے آگے نہ جھکو، تو اس اعتراض کا کیا

جواب ہوگا کہ آپ کی قوم تعزیہ کی لکڑیوں کے آگے کیوں جھکتی ہے، پکی قبروں پر سر، آنکھ، ناک، منہ کیوں رگڑتے ہیں؟ بصد خاکساری ان سے اپنے مدعا کو کیوں طلب کرتی ہے؟ آخر عبادت کی حقیقت اور کیا ہے؟ نتیجہ یہ ہوا کہ اشاعت وتبلیغ کا کام بند ہو گیا اور موحدین خود اپنی جماعت کی اصلاح میں مشغول ہوئے، لیکن سیلاب نہ تھما اور چند دنوں کے بعد دنیا پرستی نے خود ان کی اولادوں کو ان تمام اشراک وبدع کا حامی بنادیا ورضو ابالحیوۃ الدنیا واطمئنوا بہا، حالانکہ وماامروا الا لیعبدو اللہ مخلصین لہ الدین، حتیٰ کہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ کفار عرب جو ڈوبتے جہازوں پر موحد بن جاتے تھے، ان سے بھی ان کا حال ابتر ہوا اور سمندروں، طوفانوں، بلاؤں میں بھی مبتلا ہو کر ان کا دین خالص نہیں ہوتا، ''یاغوث، یا خواجہ'' کہنے سے ان کا ڈھیٹ دل وہاں بھی نہیں کانپتا۔

﴿ان ھی الا اسماء سمیتموھا انتم واباؤکم ما انزل اللہ بھا من سلطان﴾

''نہیں ہیں یہ، لیکن چند فرضی نام جسے تم نے اور تمہارے باپوں نے رکھ لئے ہیں، خدا نے کوئی دلیل ان پر نہیں نازل فرمائی''۔

یہ ایک نہایت طوفان بدتمیزی کا زمانہ تھا، قرآن کے پڑھنے والے، یا اس کے مقاصد پر مطلع ہونے والے بعض لوگ بے چین بھی ہوئے اور ہندوستان کے پچیس چھبیس کروڑ نفوس کو دیکھ کر انہیں رحم بھی آیا، لیکن کچھ نہ کر سکے، مسلمانوں کی عملی نظائر مواعظ، خطب کے اثرات کو کھو چکے تھے، ہاں! پچھلے دنوں چند لوگوں نے اپنی عملی تدبیر پر بھروسہ کر کے اسوۂ انبیاء کے خلاف چھپ کر توحید کی اشاعت کرنی چاہئے، جن میں سے خاص طور پر کبیر داس، بابا نانک تلسی داس، بطن غالب قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے مسلمانوں سے بھی اپنے کو الگ بتایا، تاکہ ان عملی بت پرستی سے ان پر اعتراض نہ ہو اور صلح کل کا مشرب رکھ کر زردار نظموں میں چاہا تھا کہ لوگ موحد ہوں، لیکن یہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والتسلیم کا طریقہ نہ تھا کہ ان کو صرف تبلیغ کا حکم ہے اور ہدایت ورشد کے معاملہ خدا کے ذمہ سونپ دینے کا امر ہے، مگر انہوں نے اپنی پالیسی پر اعتماد کیا، جس کا نتیجہ ہے کہ فوائد کے جگہ سینکڑوں نقصانات پیدا ہوئے، چونکہ یہ خدا کا بنایا ہوا راستہ نہ تھا، شیطان کول کھول کر ان میں بیٹھا اور سینے جگری کے ساتھ آدم کی

راہیں ماریں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا:

﴿فان عليك البلاغ و علينا الحساب﴾

''تجھ پر (اے محمد) صرف پہنچادینا فرض ہے، حساب میرے ذمہ ہے''۔

﴿فذكر انما انت مذكر لست عليهم بمسيطر الا من تولى و كفر فيعذب الله عذاب الاكبر﴾

''پس نصیحت کر (سمجھا) تو ان پر داروغہ نہیں، لیکن جس نے پیٹھ پھیری اور کفر کیا، اسے خدا بڑے عذاب دیگا''۔

پس کامیابی اسی میں تھی اور جو اس کے خلاف ہوئے، ان کے حالات غیر مخفی ہیں۔ یہ دور بھی ختم ہوا، انگریزوں کی سلطنت آئی، اس وقت مولانا امام الہمام الراشد الموحد حضرت محمد اسمٰعیل الدہلوی الشہید رحمۃ اللہ علیہ کے دل میں توحید کا دریا امڈا اور چڑھا، دہلی سے کلکتہ تک اس نے شور برپا کردیا، طوفان اٹھایا، ہندو اور مسلمانوں میں ہلچل مچ گئی، لیکن آہ! کہ اس نیک نیت، وارث الانبیاء والرسل صلوات اللہ علیہم وسلامہ، کو ایک اسلامی معاملے میں خدا کی راہ میں قربان ہونا پڑا، اس نے اپنے وجود کو اپنے پیارے مالک واحد، فرد، صمد کے قدموں پر بھینٹ چڑھا دیا اور ایک حد تک وہ آواز جو نہایت بلند آہنگی اور انتہائی اولوالعزمی کے ساتھ اٹھائی گئی تھی، دھیمی پڑ گئی، ان کے متبعین جزئیات میں جھگڑنے لگے اور اس ''الطاعات'' یعنی: توحید کی تبلیغ واشاعت کی جانب سے دل غافل ہوگئے، الا ماشاء اللہ کہ ان کی زبانیں اس وقت بھی نہ تھکی تھیں اور ان کے قلم اس وقت بھی جاری تھے، یہی ہنگامہ تھا، جس نے سوامی دیانند سرستی کے دل میں تحقیق مذہب کی بنیاد ڈالی، اور گھر سے بے گھر ہوکر نکلے، لیکن نسلی روایات نے ان کو قرآن پڑھانے والوں کے پاس آنے نہ دیا، ہندوؤں میں بھٹکتے رہے اور راستہ نہ پایا، حتیٰ کہ اخیر میں گھبرا کر کوہ ہمالیہ کی برفستانوں کی طرف چلے، ارادہ تھا کہ سورگ سیڑھی (زنیہ بہشت، جو ہندو روایات میں مشہور ہے) پر اپنی جان دے دوں اور دے دیتے، تو بہتر تھا کہ ایک نیا فتنہ تو نہ اٹھتا، لیکن اس نے جو یہاں انسانوں کے بہکانے کے لیے مختلف ترکیبوں سے کام کر رہا ہے، ان کو سمجھا کر اوتار اور اپنے اعمال کا ایک آلہ بنالیا، وہ متھرا

گئے، یہاں ایک قدیم ہندو مذہب کے عالم سورد اس ونڈی بھی رہتے تھے، ان کی شاگردی قبول کی، ونڈی جی صاحب کو بنارس کے مشرک برہمنوں سے کسی ذاتی معاملہ میں کشیدگی پیدا ہوگئی تھی، سوامی دیانند جی کو چونکہ متاخرین کے کلام سے سخت نفرت تھی، انہوں نے ونڈی جی سے متقدمین کی کتابوں کے پڑھنے کی درخواست کی، ہمارا خیال ہے کہ ونڈی جی نے ان کو ہندوستان کے مشہور ترہتی فیلسوف ومنطقی، گوتم رشی کی مشہور کتاب ''نیائی شاستر'' پڑھائی، یا نہ پڑھایا ہو کہ کمیاب ہے، تو پھر اس کے اصول پر جو کتابیں موجود ہیں، ان کی تعلیم دی۔

ونڈی جی کی اس میں دانشمندی یہ تھی کہ سوامی دانند کے خیالات توحید کی طرف مائل تھے، بتوں، مورتوں کے پوجا کی کوئی دلیل ان کو نہیں ملتی تھی، ویدوں میں بھی اس کے متعلق مختلف احکام جن میں زیادہ تر ان کی اہانت کی طرف مشعر ہیں، مملو تھے،

چونکہ گوتم نے اپنے شاستر میں مادہ، روح، خدا کو انادی ثابت کیا ہے اور اس پر دلائل قائم کیے ہیں، جو سطحی دماغوں میں آسانی کے ساتھ جم جاتی ہیں، اس لیے دیانند توحید جو اسلامی موجوں کا نتیجہ تھی، ڈھ گئی اور موحد کی جگہ اب مثلث ہو گئے، ونڈی نے برہمنوں کی مخالفت کی بھی تعلیم دی تھی، آخر اٹھے اور گوتم کے خیالات کے اشاعت میں مشغول ہوئے بتوں کو توڑ دیا، دیوتاؤں کے پوجا سے ہندوں کو روکا، لیکن خود شرک کے اعلیٰ فرد کے ساتھ موصوف ہو کر اور یہ خاتم تھا بیچارے اس دیانند کا، جس کو سیدھا راستہ نہ مل سکا، حالانکہ قرآن اسے بخوبی بتا سکتا تھا۔

بھاگوت گیتا، جسے کرشن کے ملفوظات کہنے چاہیں، یا کرشن کا وہ لیکچر سمجھنا چاہئے ، جو اس نے کورک شوتر کے میدان میں جہاد پر ارجن کو ابھارنے کے لیے کی تھی، گو اس پوری تقریر کا راوی ''دہرتراشٹر'' (جو کورون کا ابوالا جداد تھا) کا ایک معمولی غلام سنجے نامی ہے اور اس کے جامع ہندوستان کے مشہور فلسفی ویدانت کے موجد ''دیاس جی'' ہیں۔ جس سے روایت کا پہلو بہت کمزور ہو جاتا ہے اور اغلب ہے کہ اس میں بہت کچھ تحریفات وتغیر ہوئے ہیں، جیسا کہ بنگال کے مشہور مصنف بابوا کھے کمار دت صاحب، اور بمبئی کے فاضل پنڈت کاشی ناتھ ترسک تیلنگ کا بھی خیال ہے، لیکن پھر بھی کچھ باتیں رہ گئی ہیں۔ جس میں سچائی

اور صداقت کی جھلک پائی جاتی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کرشن ضرور انبیاء علیہم السلام کی تعلیم سے بہرہ ور تھا، یا خود اسے کوئی آسمانی نسبت[1] ہو۔

بھاگوت کے اکثر ادھیاؤں میں توحید خالص کا دعویٰ کیا گیا ہے، نہ صرف مادہ، بلکہ ماورای ذات الٰہی سب کو حادث اور فنا پذیر اور مخلوق بتایا ہے، جنت، دوزخ کے صاف صاف اقرار موجود ہیں۔

دید میں کرشن سے پہلے جن رشیوں نے اپنی اپنی رایوں کا اضافہ کیا ہے، اس کی طرف بھی اشارہ ہے، یہی وہ باتیں ہیں جن سے کرشن کو اریوں کی نظروں سے گرادیا، حتیٰ کہ کرشن ایک عیاش شریر[2] حبشی غلام ثابت کیا جاتا ہے، آخر آریوں کے مذہب کی بناء تو کل دو باتوں پر ہے:

۱۔ مادہ، روح، خدا الگ الگ واجب اور موجود لذاتہ ہے۔

۲۔ مکتی (نجات) تناسخ کے ذریعہ سے ہوتی ہے، جنت و دوزخ کوئی چیز نہیں اور بس۔

اگر آریہ اپنے دونوں عقیدوں سے باز آجائیں، جیسا کہ کرشن اور اس کے شاگرد ارجن کا عقیدہ تھا، تو پھر قرآن کے کیوں کر منکر ہو سکتے ہیں، اصول میں ہمارا ان سے اختلاف پھر کیا رہ جائے گا....؟

ذیل میں ان ادھیاؤں سے ان تمام نمبروں کا اردو ترجمہ درج کرتا ہوں، جس میں گذشتہ دعووں کی شہادت موجود ہے۔

ادھیا ۹، جس کا نام راج ودّیا (افضل العلوم) راج گھیہ یوگ (افضل الاسرار والمعارف) ہے، اس میں کرشن ارجن کو مخاطب کرتے ہوئے حسب ادعایۂ آسمانی آواز پہنچاتا ہے۔

۱۔ ''کل اجسام کا قیام میرے سبب ہے، نہ کہ میرا قیام ان کے سبب، میں اس عالم پر پوشیدہ[3] طور سے محیط ہوں''۔

---

[1]:..... گو اس وقت جو مجموعہ بھاگوت کا ہے، اس کے اعتبار سے وہ ایک فلسفی اور خود غرض، نکتہ آفرین متصوف معلوم ہوتا ہے، والعلم عند اللہ۔

[2]:..... عیاش وغیرہ جو باتیں ہیں، وہ تو رادھا اور گوپیوں کے قصص سے ماخوذ ہے اور حبشی شودر صرف اس لیے کہا جاتا ہے کہ کرشن کے معنے ''کالے'' کے ہیں اور شاید کرشن کا رنگ بھی کالا تھا۔۱۲

[3]:..... یعنی: جس کو عقل بشر ہی نہیں سمجھ سکتی ۱۲

۲۔ ''تو میری[1] اس قدرت کاملہ کو دیکھ! کہ نہ تو موجودات کا میری ذات میں قیام ہے اور نہ میری ذات باوجود موجودات کے ظہور دینے کے اور موجود کرنے کے موجودات میں مقیم ہے''۔

۳۔ میں منزل مقصود، پروردگار، مالک، شاہد، قیوم، ماویٰ، مرجع، رب، خلق، وفنا کا مرکز اور غیر فانی تخم ہوں''۔

اس ادھیاء میں اسی قسم کی موحدانہ تعلیم ہے، جس میں کہیں کہیں حلول واتحاد کا شبہ ہوتا ہے، لیکن جبکہ منتر نمبر (۲) اس کی صراحۃً نفی ہے۔

تو ان سب کو اسی پر عمل کرنا چاہئے، اخیر میں یہ ادھیاء اس جملہ پر ختم ہو جاتا ہے:

''مجھ میں دل لگا، میری پرستش کر اور میری ہی بندگی کر، تو اس طریقہ سے اپنی ہستی کو میرے حوالہ کر کے مجھ سے ملے گا''۔

تو دیکھو! اس میں ''گوتم'' کے فلسفہ کی کب گنجائش ہے۔

﴿فسبحان الله الذی بیده ملکوت کل شیء والیه ترجعون﴾

پس پاک ذات ہے جس کے ہاتھ آسمان وزمین کی بادشاہت ہے اور اسی کی طرف تم لوگ لوٹنے والے ہو''۔

اور صرف اسی پر کیوں بس ہو، تمام عالم کے فنا ہونے کی خبر سن کر کرشن ان لفظوں میں دیتا ہے:

''اس عالم ظاہری سے بالاتر وہ ہستی بحث ہے، جو پوشیدہ اور لازوال ہے اور جو کل موجودات کے فنا ہونے پر بھی فنا نہیں ہوتا''۔ ادھیا آٹھ نمبر ۲۰

بتاؤ کہ روح و مادہ کو غیر فانی کہنے والے اگر اس منتر کو دیکھ کر بیچارے کرشن کو حبشی زادہ نہ کہیں تو اور کیا کہیں...؟

قرآن بھی:

﴿کل من علیها فان ویبقیٰ وجه ربك ذوالجلال

---

[1]...... چونکہ پہلے نمبر سے حلول اور اتحاد کا شبہ ہوتا تھا، اس لیے اس میں فوراً اس کی نفی کی گئی ۱۲۔

والاکرام﴾

''جو کچھ زمین پر ہے، سب فنا ہونے والے ہیں اور صرف ذوالجلال والاکرام کی ذات رہنے والی ہے''۔

''تو سمجھ کہ تمام مخلوقات اسی کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں، میں کل عالم کی پیدائش اور فنا کا مرکز ہوں''۔

قرآن بھی اپنے ہر ورق میں:

﴿تبٰرك الذی بیده الملك وهو علی كل شیء قدیر﴾

''مبارک ہے وہ جس کے ہاتھ میں بادشاہت ہے، اور وہ ہر چیز پر قادر ہے''۔

﴿هل من خالق غیر الله﴾

''کیا خدا کے علاوہ اور بھی کوئی پیدا کرنے والا ہے''۔

فرماتا ہے، یہ چند جستہ جستہ منتر ہیں، جو میں نے بھاگوت سے بالاختصار نقل کئے ہیں، ورنہ اس کے پڑھنے والے جانتے ہیں کہ بجز چند مقامات کے جن کی صحیح ادبی تاویل ہوسکتی ہے اور تمام بھاگوت اسی سے مملو ہے، بلکہ گوتم کے فلسفہ پرستوں نے وید میں جہاں جہاں اس کی تثلیث کو مختلط کیا ہے، اس کی طرف بھی کرشن ہی نے اشارہ کیا ہے اور بتایا کہ وید محرّف ہوچکی، صحیح توحید کا ملنا اس میں ممکن نہیں، دوسری ادہیا جس کا نام سانکھ یوگ (یعنی: علم وعرفان ہے) اس کا پینتالیسواں منتر ہے۔

''ویدوں میں تثلیث[1] ہے، ارجن! تو اس تثلیث سے برتر ہو اور دوئی چھوڑ دے، ایک حالت توحیدی، وقیومی، اختیار کر''۔

پھر جو لوگ آج وید کی تحریف کے منکر ہیں، کیا پوچھتے ہو! کہ ان کے دل پر کرشن کے اس منتر سے کیا صدمہ پہنچا ہوگا، قرآن مجید نے بھی یہی کہا:

﴿لقد كفر الذین قالوا ان الله ثالث ثلثه وما من اله الا اله واحد﴾

---

[1]...... یعنی: مادہ، روح، خدا تین انادیوں اور واجبوں کا خیال پایا جاتا ہے، جیسا کہ آج کل کے آریہ کہتے ہیں، بہرکیف اگر ہے، تو بقول کرشن وہ قابل چھوڑنے کے ہے۔۱۲

"کافر ہوئے جنہوں نے کہا کہ خدا تین کا تیسرا ہے، حالانکہ ایک معبود کے علاوہ اور کوئی معبود نہیں"۔

کرشن اس کے بعد ارجن سے بہشت کا وعدہ کرتا ہے اور جہنم سے ڈراتا ہے، گرچہ بھاگوت میں کہیں کہیں تناسخ کا اشارہ بصد کاوش وغور ملتا ہے، جیسا کہ ہمارے بعض آریہ حضرات قرآن مجید سے تناسخ نکلنا چاہتے ہیں، لیکن اس کی جو کچھ حقیقت ہے، وہ خود ایک سناتن دھرمی قدیم خیال کے جید فاضل اور ہندوؤں کے جلیل پنڈت رای بہادر جانکی ناتھ مدن کشمیری، سوامن مدگلیہ، گوتر جنہوں نے بھاگوت کا ایک ٹیکا (تفسیر) بھی لکھا ہے، وہ اپنے ٹیکے میں لکھتے ہیں:

"عوام کے جو خیالات اس کے (روح) پیدا ہونے اور ایک جسم سے دوسرے جسم میں منتقل ہونے کی نسبت ہیں، وہ واقعات پر مبنی نہیں ہیں اور ان کے علم کی حقیقت سے ناواقفیت ظاہر کرتی ہے۔

بعض[1] متقدمین نے اپنی تصریحات میں آواگون، یعنی: تناسخ کے مسئلہ کو ناسمجھوں کی بدافعالی سے بچانے کے لئے بیم ورجا کے پیرایہ میں بیان کیا ہے اور اسکو بیم ورجا کے کلام سے زیادہ وقعت نہیں دیتے"۔

اس کے بعد اسی پنڈت کے الفاظ ہیں:

"آجکل آواگون کے معنے عام طور پر یہ لئے جاتے ہیں کہ جان ایک قالب کو چھوڑ کر دوسرے قالب میں پیدا ہوتی ہے اور جسم سابق کے فعلوں کا نتیجہ وہاں پاتی ہے، مگر اس خیال کے ثبوت میں کوئی کافی دلیل نہیں دی جاتی اور جو دلائل پیش کئے جاتے ہیں، وہ غور وفکر کرنے پر پایہ ثبوت سے گر جاتے ہیں"۔

(دیکھو ٹیکا مذکور ص: ۲۴۰ مطبوعہ متھرا پریس)

اس مضمون سے ذیل کے نتائج پیدا ہوتے ہیں:

۱۔ تناسخ وید کا کوئی مسئلہ نہیں، بلکہ بعض متقدمین کی اختراع ہے (جس کی تفصیل میں نے اپنے مضمون "تناسخ" میں پورے طور پر کی ہے)

---

[1]:...... تناسخ کے متعلق میں نے "القاسم" کے گذشتہ نمبروں میں جو کچھ لکھا ہے، دیکھو! ایک پنڈت ہندو میری اس رائے کی اصابت کن شاندار لفظوں میں کرتا ہے۔۱۲

۲۔آریوں کے پاس اس پر کوئی دلیل نہیں اور جو ہیں، نا قابل اعتبار ہیں۔
۳۔بجز عوام کے خواص پنڈت، تناسخ کے مسئلہ کے منکر ہیں۔
۴۔قدیم ہندو رشی اپنے بعض اعراض کے لیے نئے نئے مسئلے تراش کر اس پر مذہبی رنگ چڑھا کر پھیلانے کے عادی تھے۔

بہر کیف اب میں بھاگوت کے ان نصوصات کی طرف متوجہ ہوتا ہوں، جس میں صاف صاف لفظوں میں اس عقیدہ کو بیان کیا گیا ہے، سولہویں ادھیاء کے سولہویں منتر کا ترجمہ یہ ہے:

''جو طرح طرح کے واہمات میں سرگرداں اور غفلت کے جال میں پھنسے ہوئے ہیں، وہ جو عیش وعشرت میں مصروف رہتے ہیں، وے ناپاک دوزخ میں پڑتے ہیں''۔

﴿ویتجنبها الاشقی الذی یصلی النار الکبری﴾

''بد بخت (قرآن سے) پرہیز کرتا ہے، جو بڑی آگ میں دھکے دیا جائے گا''۔

کا ترجمہ ہے، پھر جو لوگ شریروں کے لیے سور اور کوؤں کا جسم مانتے ہیں، اگر بھاگوت اور کرشن سے بیزار نہ ہوں، تو اور کیا ہوں، ارجن نے جس وقت پانڈوں کی فوج پر نظر ڈالی، جو خود اس کے بھائیوں، استادوں، دادون، خسر، سالے سے بھری ہوئی تھی، تو اس کا جی بھر آیا اور کرشن سے مخاطب ہو کر جو اس وقت جہاد پر آمادہ کر رہا تھا، کہتا ہے:

''اے کرشن! خاندان کی ہلاکت سے خاندان کی قدیم نیک افعالی جاتی رہتی ہے، اور نیک افعالی کے غارت ہونے سے بدافعالی ضرور کل خاندان میں پھیل جاتی ہے، اے کرشن! افعال ذمیمہ کے پھیل جانے سے خاندان کی عورتیں ضرور بدافعال ہو جاتی ہیں اور بدافعال عورتوں سے اولاد ناجائز پیدا ہوتی ہے''۔

اور اولاد ناجائز خاندان کے قتل کرنے والوں کو اور ان کی اولاد کو دوزخ میں پہنچاتی ہے، اس کے بعد ارجن کا دل اور زیادہ کانپا اور اسنے کہا: ''اے جناردن! میں نے سنا ہے کہ ان لوگوں کو جن کے خاندان سے نیکی جاتی رہتی ہے، ضرور دوزخ میں مقام ہوتا ہے؟''۔

ارجن کے ان خیالات سے ذیل کے نتائج بآسانی نکل آتے ہیں:

(ا) ارجن خود دوزخ کا قائل تھا۔

(۲) اس کے زمانے میں تناسخ کی سزا کا علم بھی کسی کو نہ تھا۔

(۳) کرشن اس کی اس گفتگو پر دوزخ کی تردید نہیں کرتا، بلکہ جو کچھ کہتا ہے، وہ یہ ہے:

''اے ارجن! اپنے فرائض پر بھی نظر کر کے تجھے جنگ سے نہ ڈرنا چاہئے، حق و صداقت کے لیے جنگ سے بہتر سپاہی کے لیے اور کوئی چیز نہیں''۔

''بلا کوشش بہشت کا دروازہ کھلا ہوا ہے، ملتا ہے، ارجن تجھ جیسا صاحب قسمت سپاہی ایسا موقع جنگ کے لیے پاتے ہیں، ارجن! اگر مارا جائے گا، بہشت پائے گا اور فتحیاب تو سلطنت پائے گا، اے ارجن! جنگ کی ٹھان کر کھڑا ہو''۔

(دوسری ادھیاء کے مختلف منتر)

قرآن بھی ان لوگوں کو جنہیں وہ کفر و شرک کے مٹانے کے لیے جنگ پر آمادہ کرنا چاہتا ہے، یہی سکھاتا ہے:

﴿ان نتربص منكم الا احدىٰ الحسنين﴾

''ہم تم سے (اے کفار) دو نیکیوں میں سے ایک کے منتظر ہیں''۔ (یعنی: بہشت، یا فتح)

ان تمام مباحث سے میری غرض صرف اس حیرت کا ازالہ ہے، جو نامہ نگار خطیب کو آریوں کی جانب سے پیدا ہوئی، کیا اس کے بعد بھی آریوں کا بغض، کرشن اور اس کی گیتا سے قابل تعجب ہے؟

کیا لالہ لاجپت رائے اس دغل قلبی کو کبھی ظاہر کر سکتے ہیں؟

﴿وما تخفى صدورهم اكبر﴾

''اور جو کچھ ان کے سینے چھپائے ہوئے ہیں، وہ اس سے بھی بڑی ہیں''۔

بھاگوت میں طبع کے بعد تحریف کی گنجائش بھی نہیں رہی، اب بجز اس کے کہ اس کی توہین کریں اور کوئی چارہ نہیں۔

﴿بل اتبع الذين ظلموا اهواء هم﴾

''بلکہ ظلم کرنے والوں نے اپنی خواہشوں کی پیروی بغیر کسی علم کے کی ہے''۔

خاتمہ میں اس ابتدائی دیباچہ کا وہ ٹکڑہ بھی نقل کرنا مناسب سمجھتا ہوں، جسے بھاگوت

کے پڑھانے والے ابتداء درس میں پڑھایا کرتے تھے، جس میں نہ صرف بہشت، بلکہ طوبیٰ جو اس کا مشہور درخت ہے، اس کا نام موجود ہے، بھاگوت کے پڑھانے والے ابتدا میں کرشن پر سلام بھیجتے تھے، ان کے الفاظ یہ ہوتے تھے:

''شری کرشن مہاراج کو نمسکار (سلام) جو کہ بمنزلہ درخت طوبیٰ ہیں الخ''

اخیر میں ہم اس پر بھی تنبیہ کر دینا چاہتے ہیں کہ کہیں ہماری ان باتوں سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں کرشن کو پیغمبر، یا بھاگوت کو وحی آسمانی سمجھتا ہوں، یاد رکھو ہمیں اس سے کوئی بحث نہیں، ہمارے لئے قرآن حکیم و مجید کافی ہے اور اس وقت تمام عالم کو اس سے چارہ نہیں، دنیا کی کوئی کتاب توحید کی صحیح روشنی صاف لفظوں میں قرآن کے علاوہ اس زمانہ میں کسی میں کہیں بھی نہیں پہنچ سکتی۔

﴿ان هذا القرآن يهدى للتى هى اقوم﴾

''بلاشبہ یہ قرآن نہایت مضبوط راستے کی ہدایت کرتا ہے''۔

کرشن کے جتنے معارف توحید ہیں، ایسی باتیں مسلمانوں کے معمولی معمولی علماء کی کتابوں میں اس سے زیادہ تفصیل سے موجود ہیں، تو کیا اس سے ان کی کتابیں وحی آسمانی ہو جائیں گی اور وہ پیغمبر ہو جائیں گے؟

﴿فلا وربك لا يو منون حتى يحكمو ك فيما شجر بينهم ثم لا يجدوا فى انفسهم حرجا مما قضيت ويسلموا تسليما﴾

''ہرگز نہیں، قسم ہے تیرے رب کی (اے محمد!) وہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے، حتی کہ جن باتوں میں وہ جھگڑ رہے ہیں، اس میں تمہیں فیصلہ کرنے والا مقرر کریں، پھر اپنے اندر اس فیصلہ سے جو تو نے کیا ہو، کسی قسم کی خلش نہ پائیں اور ڈال دیں اپنی گردنیں (اس فیصلہ پر) خوب اچھی طرح''۔

وهاأدنى خويدم الدين القيم و الصراط الأقوم

سید مناظر احسن غفر اللہ لہ ونصرہ علی أعداء الدين

ويشدا زره بالكتاب المبين والمؤمنين الخالصين

(ماہنامہ الرشید دیوبند)



مناظرہ

جس مناظرہ کو اب ہم شروع کرتے ہیں، یہ ایک مشہور مناظرہ ہے اور ایک ایسے مسئلہ پر ہوا کہ جس کی مدت سے چھان بین ہو رہی تھی۔ حضراتِ محققین میں سے جو شخص جس نتیجہ پر پہنچتا تھا، وہ اپنی تحقیق سے فوراً سب کو مطلع کرتا تھا اور دوسرے حضرات نہایت صفائی اور اخلاص کی ساتھ یا تو اس پر ردّ و قدح کرتے اور یا اس کی موافقت کرتے تھے۔ اسی جہاں بین کے زمانہ میں اتفاقاً ابواسحاق شیرازی اور ابوعبداللہ[1] محمد بن علی بن محمد دامغانی کسی ایک مجلس میں مجتمع ہو گئے۔

قاعدہ ہے کہ جب کسی مسئلہ میں تحقیق کا باب کھلا ہوا ہوتا ہے، دلائل و براہین قائم کئے جاتے ہیں۔ ان پر منوع اور نقوض کا ورود ہوتا رہتا ہے، تو اس زمانہ میں عوام کی زبان پر بھی وہی مسئلہ ہوتا ہے اور خواہ وہ کسی قسم کی قابلیت رکھتے ہوں، یا نہ رکھتے ہوں، ان کو اپنی رائے زنی سے کام ہوتا ہے اور اگر کسی مجمع میں وہ اہل علم کا مجمع دیکھ لیتے ہیں، تو اسی مجمع میں اس مسئلہ کو بطور استفادہ کے پیش کر دیتے ہیں، تاکہ جواب ملنے پر جو اہل علم اس کے مخالف ہوں، اس کا رد کر دیں اور بغیر کسی شرط وقیدِ وقت کے مناظرہ شروع ہو جائے۔

ہمارے زمانہ میں تو عوام کی زیرکی یہاں تک بڑھ گئی ہے کہ وہ ایسے علماء کو کہ جن کی تحقیق کسی مسئلہ میں مختلف ہوتی ہے، اپنے یہاں ضیافت میں مدعو کر دیتے ہیں، نہ ان مولوی

---

[1]:...... آپ احناف کے مشہور محقق ائمہ میں سے ہیں، بغداد کی مسند قضا کو بھی آپ سے زینت حاصل ہو چکی ہے، آپ کی پیدائش ۳۹۸ھ میں ہوئی اور ۴۷۸ھ میں بغداد میں وفات پائی۔ بعض ۴۰۰ھ میں ولادت اور ۴۷۸ھ میں وفات بیان کرتے ہیں۔ آپ کے علم وفضل کا حال ممکن ہے کہ ہم کسی اگلی اشاعت میں لکھیں، مگر اس وقت صرف نمونہ کے طور پر اس قدر عرض کرنا کافی سمجھتے ہیں کہ قاضی ابوالطیب کا قول آپ کے بارے میں یہ ہے:

"الد امغانی اعرف بمذهب الشافعی من کثیر من اصحابنا".

"دامغانی امام شافعیؒ کے مذہب کو شوافع میں سے اکثر سے زیادہ جانتے ہیں"۔

جب باوجود حنفی ہونے کے مذہب کی تحقیق کا یہ حال تھا کہ خود شوافع سے بھی زیادہ ماہر تھے، تو خود اپنے مذہب کی تحقیق ظاہر ہے کہ کیا قوت رکھتی ہوگی۔ ۱۲

صاحب کو خبر ہوتی ہے کہ فلاں مولوی صاحب بھی تشریف لاویں گے، نہ ان کو اُن کی خبر۔ اس اجتماع کے بعد اسی مختلف فیہا مسئلہ کو بطور سوال پیش کر کے مناظرہ شروع کرا دیتے ہیں۔

مسئلہ یہ تھا کہ سلطنت اسلامی میں جو محصول کفار سے (یعنی: جزیہ) وصول کیا جاتا ہے، اگر وہ شخص کہ جس سے محصول وصول کیا جاتا ہے، مسلمان ہو جائے، تو گذشتہ زمانہ کا محصول جو اس پر واجب ہو چکا تھا، اب مسلمان ہونے کے بعد اس سے وصول کیا جا سکتا ہے، یا نہیں؟ مثلاً زید ایک کافر شخص تھا کہ جو اسلامی سلطنت میں رہا کرتا تھا، سال بھر کا جزیہ اس پر واجب الادا ہو چکا تھا، اس کے بعد وہ مسلمان ہو گیا، سال بھر کا جزیہ جو کہ کفر کی حالت میں اس پر واجب ہو چکا تھا، اب اسلام کی حالت میں وصول کیا جا سکتا ہے، یا نہیں؟

اکابرِ امت کی آراء اس میں مختلف تھیں۔ ایک جماعت کی تحقیق تھی کہ اسلام کے بعد بھی محصول واجب الادا رہے گا اور اس نئے اسلام کا اثر کفر کی حالت کے جزیہ پر کچھ نہ پڑے گا۔ دوسرا فریق کہتا تھا کہ مسلمان سے جزیہ لئے جانے کے کوئی معنی ہی نہیں، اس لیے خواہ وہ جزیہ کے وجوب سے پہلے مسلمان ہوا ہو، یا وجوب کے بعد، کسی صورت میں اس سے زمانہ گذشتہ کا واجب شدہ جزیہ وصول نہیں کیا جا سکتا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی مذہب ہے کہ زمانہ گذشتہ کا واجب شدہ جزیہ مسلمان ہونے کے بعد ساقط نہیں ہوتا ہے۔

مختصر یہ کہ جب دونوں حضرات ایک جگہ جمع ہو گئے، تو وہیں کسی شخص نے اس مسئلہ کے متعلق سوال کیا۔ امام ابو اسحاق شیرازی رحمۃ اللہ علیہ نے بلا تکلف فرمایا کہ میں اس کی پوری تحقیق کر چکا ہوں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب اس میں صحیح ہے۔ سائل نے اس جواب پر اکتفا نہ کیا، بلکہ باادب یہ بھی عرض کیا کہ اس پر دلیل کیا ہے؟ کیا آج کل یہ ممکن ہے کہ کوئی مستفتی کسی مفتی سے فتویٰ کی دلیل کا مطالبہ کرے اور مفتی اس کو اس گستاخی کی کامل سزا نہ دے...؟

لیکن امام ابو اسحاق شیرازیؒ نے سائل کو رجز کیا، نہ اس پر ناراض ہوئے، بلکہ نہایت متانت سے اس جواب کی دلیل بیان کی اور فرمایا کہ کافر پر دو طرح کے خراج واجب ہوتے ہیں۔ ایک کا تعلق خود اس کافر کی ذات سے ہے، دوسرے کا تعلق اس کی زمین سے ہے۔ پہلا جسے "خراج الراس" کہنا بیجا نہیں ہے، جزیہ کہا جاتا ہے۔ دوسرا جس کو "خراج الارض"

کہنا چاہئے ،خراج سے موسوم ہے۔ ان دونوں خراجوں میں سے ایک خراج، یعنی: خراج الارض کی نسبت مخالفین اور موافقین سب کی یہی رائے ہے کہ اگر اس کا وجوب حالت کفر میں ہو چکا ہے، تو اگر چہ وہ مالکِ زمین کفر چھوڑ کر مسلمان بھی ہو جاوے، تب بھی یہ خراج اس سے وصول کیا جاوے گا اور اس کے ذمہ سے ساقط نہ ہو سکے گا۔ جب دونوں خراج برابر درجہ کے ہیں اور ایک کے متعلق سب کی رائے عدمِ سقوط بعد الوجوب کی ہے، تو پھر دوسرے خراج، یعنی: جزیہ کے متعلق باوجود مساوات کے یہی حکم کیوں نہیں دیا جاتا؟ تھوڑے سے غور کے بعد یہ بات باآسانی معلوم ہوسکتی ہے کہ جب دونوں مساوی ہیں، تو ان کے حکم میں تفریق کی وجہ معقول وجہ نہیں ہوسکتی۔

شیخ عبداللہؒ نے اس تمام تقریر کو کامل غور وخوض کیساتھ سن کر فرمایا کہ "مگر جناب مجھ کو اس پر کئی شکوک ہیں"۔

اول: تو یہ کہ اس میں کون سا عقلی، یا نقلی امتناع ہے کہ خراج کی دو قسموں میں سے ایک قسم میں بعض ایسی شرطیں لگی ہوئی ہوں کہ جو اس کے مقابل دوسری قسم میں موجود ہوں۔ میرے نزدیک اس کو تسلیم کرنے کی کوئی وجہ ہی نہیں کہ جب دو چیزیں ایک چیز کی قسمیں ہوں، تو جو شرائط ایک میں ہوں گی، انہیں شروط سے دوسری قسم بھی مفید ہوگی اور صرف یہی نہیں کہ میرے پاس اس کی کوئی معقول وجہ موجود نہیں، بلکہ غور کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اس کے خلاف پر دلیل موجود ہے، یعنی: دلیل سے یہ بات ثابت ہے کہ دو چیزیں ایک ہی چیز کی قسمیں ہوتی ہیں، مگر ایک چیز میں بعض ایسی شرطیں ہوتی ہیں کہ جو دوسری میں نہیں پائی جاتی ہیں۔

مثلاً: زکوۃ کی دو قسمیں ہیں، ایک زکوۃِ فطر (صدقہ الفطر) دوسری زکوۃِ مال اور یہ سب کو معلوم ہے کہ باوجود یہ کہ دونوں قسمیں ایک ہی چیز کی ہیں، لیکن زکوۃِ مال میں نصاب کی شرط ہے اور زکوۃ فطر میں شرط نہیں۔

ثانی: یہ کہ ممکن ہے کہ دو حق اس قسم کے ہوں کہ ان کا تعلق کفر کے ساتھ ہو، لیکن ان میں سے ایک تو ایسا ضعیف التعلق ہو کہ اسلام کی وجہ سے ساقط ہو جاتا ہو اور دوسرا حق ایسا نہ ہو کہ وجوب کے بعد کسی صورت سے ساقط ہو بھی نہیں سکتا ہے۔ مجھ کو ضرورت ہے کہ میں اپنی اس تقریر کی توضیح مثال کے ذریعے کروں، تاکہ میرا مدعا ذہن نشین ہو جائے۔ اس لئے

مثال عرض ہے کہ بنی نوع انسانی کو باوجود معظم ومشرف ہونے کے غلام بنالینا، یاقتل کردینا دوحق ہیں، جن کا تعلق کفر کیساتھ ہے، لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ ان میں سے ایک کا سقوط اسلام کی وجہ سے ہوجاتا ہے، یعنی: اگر کوئی کافر مسلمان ہوجائے، تو اس کو قتل نہیں کیا جاسکتا ہے، لیکن غلام بنائے رکھنا بعد مسلمان ہونے کے بھی جائز ہے۔ بعینہ یہاں پر بھی اس طرح ہے کہ دوحق (جزیہ اور خراج) بشرطِ کفر واجب ہوتے ہیں، لیکن ایک اسلام کی وجہ سے ساقط ہوجاتا ہے، دوسرا نہیں۔

ثالث: یہ کہ آپ نے اس جزیہ کو خراج ارض پر قیاس کیا ہے، دیکھنا یہ ہے کہ مقیس اور مقیس علیہ میں مساوات ہے، یا فتراق۔ سرسری نظر میں اگرچہ مساوات معلوم ہوتی ہے، مگر غور کے ساتھ تحقیق کرنے کے بعد یہی امر محقق ہوتا ہے کہ دونوں میں افتراق ہوتا ہے، نہ کہ مساوات، اس لیے کہ خراج الارض مالک زمین پر محض اس وجہ سے واجب ہوتا ہے کہ مالک زمین کو اس امر کی قدرت حاصل ہے کہ وہ اس زمین سے نفع اٹھا سکے، اسی قدرت پر وجوب ِخراج کا مدار ہے۔ اگر یہ قدرت مالکِ زمین کو حاصل ہے، تو خراج واجب ہوکر رہے گا، خواہ اس نے زراعت کی ہو، یا نہ کی ہو اور اگر اس کو قدرت ہی حاصل نہ ہوئی، تو خراج بھی واجب نہ ہوگا اور یہ قدرت کے وجوب خراج کا عدماً و وجوداً مدار ہے، ایک ایسا سبب ہے کہ اس کی وجہ سے حالتِ اسلام میں بھی اہل اسلام پر حق واجب ہوجاتا ہے، جیسا کہ زمین کی پیداوار میں سے عشر۔ اس سبب کی اس حقیقت پر غور کرنے سے یہ بات صاف ظاہر ہوجاتی ہے کہ یہ سبب کسی مسلمان پر ابتداءً وجوبِ حق کا سبب بھی بن سکتا ہے، پھر اگر اس سبب کی وجہ سے وہ حق جو کہ پہلے سے ثابت اور واجب ہوچکا تھا، اب اپنے حال پر باقی رہے، تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے، اس لیے خراج ارض میں تو خواہ کافر ہو، یا مسلم ایک حکم میں دونوں کا داخل نہ ہونا قابل تعجب ہے، نہ خارج از قیاس۔

لیکن مبحوث عنہا صورت میں یہ بات نہیں ہے، اس واسطے کہ وجوبِ جزیہ کے سبب کا تعلق صرف کفر کی حالت کے ساتھ ہی کوئی نظیر ایسی نہیں ہے کہ جو اس امر کو ثابت کرسکے کہ اسلام میں بھی کسی پر کوئی ایسا حق ثابت ہوا ہو کہ جس کا تعلق وجوبِ جزیہ کے سبب سے ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ وجوبِ جزیہ کا سبب اسلام کے بالکل منافی ہے۔ بناءً علیہ اگر

حالت اسلام میں وہ حق ساقط ہو جائے جو کہ حالت کفر میں کسی ایسے سبب سے واجب ہوا ہے کہ اسلام کے بالکل منافی ہے، تو اس میں کون سا استبعاد ہے...؟

امام ابواسحاقؒ! آپ کے پہلے ایک اعتراض کے متعلق میں تین جواب دے سکتا ہوں۔

ا۔ یہ مثال میرے عرض کئے ہوئے کی دلیل ہو سکتی ہے۔ آپ کے مدعا کے اثبات سے تو اس کو کچھ تعلق ہی نہیں، پھر آپ نے یہ خیال کیونکر قائم کرلیا کہ اس مثال سے آپ فائدہ اٹھا سکتے ہیں؟ اس واسطے کہ جب یہ امر طے شدہ ہے کہ زکوۃِ فطر اور زکوۃِ مال دونوں کا سبب وجوب اسلام ہے اور یہ بھی محقق ہے کہ کفر زکوۃِ فطر اور زکوۃِ مال دونوں کے منافی ہے، تو یہ بھی یقیناً واجب التسلیم ہے کہ ان دونوں کے ساقط کرنے میں بھی کفر مؤثرِ تام اور کامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کسی شخص پر زکوۃ فطر واجب ہو چکی ہے اور واجب ہونے کے بعد (العیاذ باللہ) وہ بدنصیب مرتد ہو گیا ہو، تو یہ زکوۃِ فطر اس پر سے ساقط ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اگر کسی شخص پر زکوۃِ مال واجب ہو چکی ہو اور وہ شخص اس زکوۃ کے واجب ہو چکنے کے بعد (العیاذ باللہ) مرتد ہو گیا ہو، تب بھی یہی حکم ہے۔ اب یہ بات بالکل منقح ہو گئی کہ کفر کی تاثیر ان دونوں کے ساقط کرنے میں بالکل ہی مساویانہ درجہ میں ہے۔ اس قاعدہ کو یہاں پر بھی منطبق فرمالیجئے اس طرح پر کہ چونکہ ان دونوں خراجوں (جزیہ اور خراجِ ارض) کا سبب صرف کفر ہے اور اسلام ان دونوں کے منافی ہے، تو جس طرح کہ جو چیز اسلام کی وجہ سے واجب وثابت ہوئی تھی، وہ اس کے منافی، یعنی: کفر کی وجہ سے ساقط ہو کر رہتی تھیں، ٹھیک اسی طریقہ سے جن دو خراجوں (جزیہ اور خراج ارض) کا سبب وجوبِ کفر ہے، وہ دونوں چیزیں کفر کے منافی، یعنی: اسلام سے ساقط ہو جائیں گی۔ بناء علیٰ ہذا یہ حکم دینا چاہیے کہ اسلام کی وجہ سے دونوں خراج بغیر کسی فرق کے ساقط ہو جایا کرتے، لیکن یہ بات دلائل و براہین سے ثابت کی جا چکی ہے کہ ان میں سے ایک (خراج ارض) اسلام کی وجہ سے ساقط نہیں ہوتا ہے، اس لیے یہی حکم دوسرے (جزیہ) کو بھی دیا جاوے گا۔

۲۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ زکوۃِ فطر اور زکوۃِ مال کا اس امر کی نظیر قرار دینا ہی صحیح نہیں ہے کہ ایک چیز کی دو قسموں میں سے اگر ایک میں کوئی چیز شرط ہو، تو ضروری نہیں کہ دوسری میں بھی شرط ہو، اس واسطے کہ زکوۃ فطر اور زکوۃ مال دونوں مساوات کا درجہ رکھتی ہی نہیں۔ خود

ان دونوں کے آپس میں افتراق موجود ہے، اس واسطے کہ زکوۃ فطر کی حالت اس امر میں تمام اقسام، زکوۃ سے بالکل جداگانہ ہے کہ اس کا تعلق ذمہ مُکلّف سے ہوتا ہے، اقسام زکوۃ میں سے کسی قسم کی زکوۃ کا تعلق مکلّف کے ذمہ سے نہیں ہوتا ہے، اس لیے وہ اگر اعتبار نصاب میں بھی زکوۃ مال سے جداگانہ شان رکھے، تو اس میں کیا تعجب ہے۔

اب دونوں خراجوں (جزیہ، خراج ارض) کی حالت پر نظر ڈالئے، تو کسی بات میں جدا جدا نظر نہیں آتے، بلکہ جس طرح ان دونوں کے وجوب کے لیے کفر کا وجود ضروری ہے، اسی طرح اسلام ان میں سے ہر ایک کے لیے منافی ہے، اس لیے اب ضروری ہے کہ ان دونوں خراجوں کا ایک ہی حکم رہنا چاہئے۔ بناءً علیہ بجز اس حکم کے ماننے کے اور کوئی چارہ ہی نہیں کہ ان میں سے اگر ایک اسلام کی وجہ سے ساقط ہوسکتا ہے، تو دوسرا بھی ساقط ہو جاتا ہے۔

۳۔ تیسرا جواب یہ ہے کہ زکوۃ فطر میں نصاب کے اعتبار کی بظاہر کوئی معقول وجہ بھی نہیں معلوم ہوتی ہے، اس واسطے کہ مکلّف کے پاس مال خواہ کتنا ہی زائد کیوں نہ ہو، مگر زکوۃ فطر کی مقدار اسی قدر واجب ہوگی جس قدر کہ ان لوگوں پر ہے، جو کم مال والے ہیں، مال کی کمی زیادتی کا کچھ بھی اثر زکوۃ کی کمی زیادتی پر نہیں پڑتا، چونکہ اس حالت میں نصاب کا اعتبار کرنا غیر مفید، بلکہ لغو تھا، اس لیے اس میں نصاب کا اعتبار ہی نہیں کیا گیا، لیکن زکوۃ فطر کے علاوہ زکوۃ کی دو قسمیں مال کی زیادتی اور کمی سے تعلق رکھتی ہیں، جیسے جیسے مال بڑھتا جاتا ہے، ویسے ویسے ان میں بھی زیادتی ہو جاتی ہے، اس لیے ان میں نصاب کا اعتبار کیا جانا ضروری ہے۔

لیکن ان دونوں خراجوں (جزیہ اور خراج الارض) کا حال جیسا کہ میں ابھی گذارش کر چکا ہوں، بالکل ایک سا ہے۔ کسی قسم کا کچھ فرق نہیں ہے، اس لیے ضروری ہے کہ وہ دونوں اسلام میں بھی برابر رہیں، اگر یہ ساقط ہوتا ہے، تو اس کو بھی ساقط ہونا چاہئے۔

آپ نے دوسرا اعتراض قتل اور غلام بنا لینے کی صورتوں کو پیش نظر کر کے کیا ہے، میں ان کو بھی اس قابل نہیں سمجھتا ہوں کہ ان کو لے کر اعتراض کیا جا سکے اور میرے خیال میں اس اعتراض کا جواب دو طریقہ سے ہوسکتا ہے:

اوّل: تو یہی کہ قتل اور غلام بنا لینا دونوں مختلف جنسیں ہیں اور جب ان دونوں میں

جنس کا اختلاف موجود ہے، تو اگر ان کے احکام میں بھی اختلاف ہو جائے، تو کیا نقصان ہے۔

دوم: یہ کہ اگر کسی شخص کو حالت کفر میں غلام بنایا گیا، تو اس کے بعد بحالت اسلام کوئی جدید بات نہیں کی جاتی، بلکہ وہی غلامی اپنے حال پر باقی رہتی ہے، یعنی: جو چیز کفر کی وجہ سے اوّلاً (بحالت کفر) ثابت ہو چکی تھی، اسی کو باقی رکھا جاتا ہے اور قتل کی شان اس سے بالکل جدا ہے، اس واسطے کہ وہ جس حالت میں ہوگی، ابتدائی عقوبت ہوگی۔ اب اگر کسی کو بعد اسلام کے سزائے قتل دی جائے، تو گویا اسلام میں اس پر ایک سزا ابتداءً واجب کی گئی، لہٰذا ان دونوں کا احکام میں اختلاف صرف مناسب ہی نہیں، بلکہ ضروری بھی ہے۔

لیکن ان دونوں خراجوں (جزیہ اور خراج ارض) کے مسئلہ میں تو اس پر بہت زیادہ غائر نظر کرنے کے بعد بھی اس سے زیادہ کسی نتیجہ پر نہیں پہنچا جا سکتا ہے کہ دونوں کی حالت ایک ہی ہے، کیونکہ اس میں اس سے زیادہ اور کیا ہوتا ہے کہ جس مال کا وجوب گذشتہ زمانہ میں اس پر ہو چکا ہے، اس کو اس وقت اس سے وصول کیا جاوے، کسی قسم کی کوئی نئی بات اس پر اس وقت واجب ہی نہیں کی جاتی ہے، اس لیے یہی حکم دیا جا سکتا ہے کہ اگر ان میں سے ایک ساقط نہ ہو، تو دوسرے کو بھی ساقط نہ ہونا چاہئے۔

سوم: تیسرا اعتراض بھی میرے نزدیک زیادہ قوی نہیں، اور میرے خیال میں اس کا جواب بھی دو طریقوں سے دیا جا سکتا ہے:

۱۔ یہی کہ یہ کیونکر تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ وجوب خراج کا سبب ایسا سبب ہے کہ اس سے بعد اسلام کے حقوق کا وجوب ہوتا رہتا ہے، میں اس کو تسلیم ہی نہیں کرتا ہوں، اس واسطے کہ خراج تو صرف اس وجہ سے واجب ہوا ہے کہ مالک زمین باوجود کافر ہونے کے زمین سے انتفاع پر قادر ہے اور عشر کا وجوب زمین پر محض حق خداوندی میں ہوا ہے، یعنی: اسلام کی وجہ سے اب یہ کیونکر صحیح کہا جا سکتا ہے کہ سببِ خراج ایسا ہے کہ اسلام اس کے منافی نہیں۔

۲۔ یہ کہ اگر اس صورت میں کوئی حق ایسا نکلتا ہے کہ جس کا تعلق اس سبب سے ہے کہ جو کہ خراج کے وجوب کا ہے، اس بنا پر مناسب ہے کہ جو کچھ اس پر مال کفر میں واجب ہو چکا تھا، وہ اب حالت اسلام میں بھی باقی رہے، تو اس مبحوث عنہا مسئلہ میں بھی بعینہ یہی صورت

ہونی چاہئے، اس واسطے کہ سبب جزیہ کے مثل سے حق واجب ہوتا ہے، حتیٰ کہ اس کا اثر بھی حالت اسلام کے بعد تک رہتا ہے، کیونکہ زکوۃ فطر آخر رقبہ ہی کے بدلہ میں تو ہے اور جزیہ بھی رقبہ ہی کے بدلہ میں ہے۔ بناءً علیہ یہی ہونا چاہئے کہ جو کچھ مالی محصول حالت کفر میں کسی شخص پر واجب ہوا ہو، وہ حالت اسلام میں بھی باقی رہے، اس لیے کہ ان دونوں میں اس وقت تک بھی کچھ فرق نہیں ہوا۔

ابوعبداللہؒ: میرے اس اعتراض کے پہلے جواب میں کہ زکوۃ کی دو قسمیں ہونے کے باوجود ایک قسم میں کچھ شرطیں ہیں اور دوسری میں کچھ، یہ فرمانا قابل غور ہے کہ یہ تو دلیل ہمارے لئے مفید ہے، نہ کہ مستدل کے، اس واسطے کہ دونوں زکوتیں اسلام کے اعتبار میں برابر ہی نکلتی ہیں۔ میں عرض کرتا ہوں کہ یہ بھی تو ناجائز نہیں ہے کہ دونوں خراجوں میں کفر ہی کا اعتبار کیا جاوے، لیکن استیفا اور وصول کرنے کے وقت دونوں کے احکام مختلف ہوجاویں، مثلاً: زکوۃ فطر اور زکوۃ مال دونوں اتنی بات میں تو مساویانہ درجہ رکھتے ہیں کہ ایک ہی حالت میں دونوں میں مال کا اعتبار کیا جاتا ہے، اس کے باوجود اعتبار کی کیفیت میں دونوں میں کھلا ہوا اختلاف موجود ہے، اس لیے کہ زکوۃ فطر میں تو یہ معتبر ہے کہ مکلّف کے پاس اس قدر مال ہو کہ وہ حوائج ضروریہ سے باقی بچنے کے بعد زکوۃ فطر کو ادا کر سکے اور اس کے سوا جس قدر اقسام زکوۃ ہیں، ان سب میں یہ معتبر ہے کہ مکلّف کامل نصاب کا مالک ہو۔ ٹھیک اسی طرح یہاں بھی کہا جاسکتا ہے کہ دونوں قسم کے خراج اتنی بات میں تو مساوی ہیں کہ ان میں سے ہر ایک میں کفر کا اعتبار کیا جاتا ہے اور جب تک کوئی شخص کافر نہیں ہوتا ہے، اس پر ان دونوں قسم کے خراجوں میں سے کوئی خراج واجب نہیں ہوتا ہے، مگر استیفا کے وقت ان دونوں کا حکم مختلف ہو جاوے، اس طرح پر کہ ایک تو باوجودیکہ مکلّف کفر سے علیحدہ ہو جاوے، پھر بھی باقی رہے اور دوسرے کے بقائے وجود کا مدار بقا علی الکفر ہو، جب تک اس کا کفر باقی رہے، وہ محصول بھی باقی رہے اور جب اس کا کفر زائل ہو جائے، وہ حق واجب بھی ساقط ہو جائے۔

اس کا دوسرا جواب بھی دیا جا سکتا ہے، وہ یہ کہ ان دونوں قسم کی زکوۃ میں کفر کا اثر صرف ایک ہی طریقہ کا ہے، اس لیے کہ ان دونوں کا وجوب بطور عبادت ہوتا ہے، نہ کہ بطور

عقوبت، اس لیے ان کا استیفا اور وصول کرنا کفر کے بعد جائز نہیں ہوسکتا ہے، اس واسطے کہ کافر کی کوئی عبادت صحیح بھی نہیں ہوتی ہے اور نہ اس کے ذمہ پر کسی عبادت کا وجوب ہوسکتا ہے اور مبحوث عنہا مسئلہ کی شان یہ نہیں ہے، اس واسطے کہ جزیہ بچوں پر بھی واجب ہوتا ہے، بڑوں ہی کی تخصیص نہیں، اس واسطے کہ کلام باری میں ہے:

﴿قاتلوا الذین لا یومنون باللہ والیوم الاٰخر ولا یحرمون ماحرم اللہ ورسولہ ولایدینون دین الحق من الذین اوتوا الکتٰب حتی یعطوا الجزیہ عن ید وھم صاغرون﴾

''لڑو ان لوگوں سے جو نہ اللہ کو مانتے ہیں اور نہ روزِ آخرت کو اور نہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں، جو حرام کر دی اللہ اور اس کے رسول نے اور نہ قبول کرتے ہیں سچا دین اور ان لوگوں میں سے ہیں، جن کو کتاب ملی ہے ، یہاں تک کہ جزیہ دیں اپنے ہاتھوں سے ذلیل ہوکر''۔

اخذِ جزیہ کے لیے صغار اور ذلت وہوان کو داخل کیا گیا اور مسلمان ہو جانے کے بعد یہ چیزیں کسی طرح داخل ہو ہی نہیں سکتیں، اس لیے کسی طرح ایسی چیز کا استیفا ان سے نہیں کیا جاسکتا ہے، جس کا وجوب ان پر علی سبیل الصغار والھوان ہوا ہو، اس واسطے کہ وہ اب ان لوگوں میں داخل ہی نہیں رہے، جن پر مسلمان کوئی ایسا حق ثابت کر سکیں کہ جس کے وصول کیے جانے میں تذلیل کو بھی داخل کیا گیا ہو، اسی لئے یہ صورت ممکن ہے کہ کسی جگہ مسلمانوں پر کوئی ایسی چیز واجب ہو جائے، جس کا نام اس محصول کا سا ہو جو کہ کفار پر واجب ہوتی ہے، مگر تذلیل وغیرہ کا اس میں شائبہ بھی نہ ہوگا۔ اس میں یہ بھی داخل ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اہل عراق پر بھی اس قسم کا محصول مقرر کیا تھا۔

(الرشید دیوبند)

مکالمات

گذشتہ ایام میں مختلف لوگوں کے درمیان بعض ایسی مفید دلچسپ گفتگوئیں ہوئیں ہیں کہ وہ کتابوں کے ذریعہ سے اس وقت تک منتقل ہوتی چلی آرہی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ملک میں ان کی اشاعت انشاء اللہ العزیز مفید ثابت ہوگی۔ اخلاق وادب، نیز مسائل علمیہ کا ایک بیش بہا ذخیرہ اس طرز سے اردو زبان میں آجائے گا۔(وافوض امری الی اللہ) ان گفتگوؤں کا عنوان ''مکالمات'' رکھا جاتا ہے۔ جس کے معنی ''باہمی گفتگو کے مضامین'' ہیں۔

مناظر احسن کشف اللہ سوءہ وغفرلہ

شاہ وگدا

یعنی: سلیمان بن عبدالملک اور ابوحازم کا مکالمہ

سلیمان بن عبدالملک بنی امیہ کا مشہور بادشاہ خلیفہ ہے، اس کی حالت اور خلفائے پیشین سے اچھی تھی، اکثر ارباب علم وفضل سے ملتا تھا، قسطنطنیہ پر ایک زبردست حملہ اس کے زمانے میں بھی ہوا، اس کی سلطنت کا رقبہ بہت وسیع تھا۔ کہا جاتا ہے کہ سلیمان جب مدینہ منورہ آیا، تو اس نے دریافت کیا کہ کیا یہاں کوئی ایسا بزرگ ہے، جسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت نصیب ہوئی ہو؟ لوگوں نے ابوحازم بن دینار کا تذکرہ کیا، یہ جلیل القدر صحابی اور حافظ حدیث ہیں، ذہبی نے تذکرہ الحافظ میں ان کا تذکرہ نہایت شاندار لفظوں میں کیا ہے، کھجوریں بیچا کرتے تھے اور اکثر کہا کرتے تھے کہ جن چیزوں کے ملنے کے بعد موت سے انسان ڈرنے لگے، ایسی چیزوں کی تمنا ہی نہ کرنی چاہئے۔ یہ فارسی النسل تھے، ان کی والدہ ایک رومی عورت تھیں۔ ۱۴۰ھ میں آپ کا انتقال ہوا ہے، بہر حال سلیمان نے آپ کو بلوایا اور اس طرح گفتگو شروع ہوئی:

سلیمان: ابوحازم! یہ کیا بے مروتی ہے، جسے میں دیکھ رہا ہوں؟

ابوحازم: مجھ میں آپ نے کیا بے مروتی دیکھی؟

سلیمان: مدینہ کے جتنے سر برآوردہ لوگ تھے، وہ ہم سے ملنے آئے، مگر تم نہیں آئے، کیا یہ صریح بے مروتی نہیں؟

ابو حازم: میں تم سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں، تم سچ کہو، اگر مجھ میں اور تم میں پہلے سے شناسائی ہوتی، تو کیا میں اس طرح تمہارے سامنے آسکتا تھا؟ سلیمان نے کہا کہ شیخ سچ کہتا ہے، اس کے بعد اس نے پوچھا:

سلیمان: ابو حازم اس کی کیا وجہ ہے کہ ہم موت کو ناپسند کرتے ہیں؟

ابو حازم: اس کی وجہ تو کھلی ہوئی ہے، تم لوگوں نے اپنی آخرت برباد کی ہے اور دنیا کو آباد کیا ہے، اس کے بعد ظاہر ہے کہ تم لوگ موت کو ناپسند کرو، اس لیے کہ آباد مقام سے کھنڈروں کی طرف منتقل ہونے کو ہر شخص ناپسند کرتا ہے۔

سلیمان: سچ کہتے ہو، اچھا اے ابو حازم! یہ بتاؤ کہ خدا کے پاس جانے کی کیا کیفیت ہوتی ہے؟

ابو حازم: نیکوکاروں کے جانے کی یہ کیفیت ہے کہ گویا پردیسی اپنے گھربار اہل وعیال کے پاس جارہا ہے اور بدکاروں کی مثال ایسی سمجھو کہ بھاگا ہوا غلام اپنے آقا کے روبرو آرہا ہے۔

سلیمان یہ سن کر رونے لگا اور بولا کہ اے ابو حازم! خدا کے یہاں میرا کیا حال ہوگا، کاش میں اسے جان لیتا!!!

ابو حازم: اے سلیمان! اس کے جان لینے کی آسان تدبیر ہے، اپنے نفس کو قرآن مجید پر پیش کر، جان لے گا کہ خدا کے ہاں تیرے لئے کیا ہے۔

سلیمان: قرآن میں وہ مقام کہاں پر ہے، جس پر ہم اپنے نفس کو پیش کریں؟

ابو حازم: خدا کا یہ قول: ﴿انّ الابرار لفی نعیم وان الفجار لفی جحیم﴾ ''نیک بندے ناز ونعمت میں ہوں گے اور بدکار جہنم میں''۔

سلیمان: ابو حازم! پھر خدا کی رحمت کہاں ہے؟

ابو حازم: ﴿قریب من المحسنین﴾ ''نیک بندوں کے قریب''۔[1]

---

[1]......اشارہ ہے طرف آیت: ﴿ان رحمة الله قریب من المحسنین﴾ کی۔۱۲

سلیمان: اچھا ابوحازم! یہ بتاؤ کہ سب سے زیادہ دانشمند شخص کون ہے؟

ابوحازم: جو حکمت استوار و مضبوط علم جانتا ہو اور دوسرے کو بھی سکھاتا ہو۔

سلیمان: اچھا سب سے زیادہ احمق کون ہے؟

ابوحازم: جس نے اپنی آخرت کو بیچ کر دوسروں کے لیے دنیا خریدی۔[1]

سلیمان: سب سے زیادہ مقبول دعا کس کی ہے؟

ابوحازم: خدا کی طرف ہمہ تن متوجہ ہونے والوں کی۔

سلیمان: ابوحازم تمہارا ان امور کے متعلق کیا خیال ہے، جن میں ہم ہیں؟ (یعنی: خلافت)

ابوحازم: مجھے اس کی تفصیل سے معاف رکھو (گویا اشارۃً کہہ گئے کہ ناگفتہ بہ حالت ہو رہی ہے)۔

سلیمان: تم کو نصیحت کی تبلیغ کرنی چاہئے۔

ابوحازم: سنو! کچھ لوگ ایسے ہیں، جو اس پر (خلافت) اس طرح قابض ہو گئے ہیں کہ نہ انہوں نے مسلمانوں سے کوئی مشورہ لیا اور نہ اجتماع منعقد ہوا، کچھ نہیں ہوا۔ اس کے بعد ان لوگوں نے محض دنیا طلبی کے نشہ میں مست ہو کر خونریزیاں کیں اور چل دیئے۔ (سلیمان سے پہلے بنی امیہ کے مشہور ظالم حجاج نے جو کچھ کیا تھا اور اس کے علاوہ بھی چند واقعات کی طرف اشارہ ہے) کاش میں جانتا کہ (مرنے کے بعد) انہوں نے کیا کہا اور ان سے کیا کہا گیا۔

ابوحازم اس کے بعد خاموش ہو گئے، امراءِ دربار میں سے ایک خوشامدی بولا کہ یہ کیا بے ہودہ گفتگو کر رہے ہو؟

ابوحازم بولے کہ جھوٹ بولتا ہے (یعنی: یہ گفتگو بے ہودہ نہیں ہے) اے شخص! اللہ تعالیٰ نے علماء سے عہد لیا ہے کہ حق کو خوب کھول کھول کر ظاہر کریں اور اسے کسی طرح نہ چھپائیں۔

اس کے بعد سلیمان بولا: حازم! آخر بتاؤ صلاح و نیکی پیدا کرنے کے کیا طریقے ہیں؟

ابوحازم: تکلف چھوڑ، وقار کے ساتھ رہ اور مروت کر۔

سلیمان: اس کے (یعنی: خراج کے) حاصل کرنے کا کیا طریقہ ہے؟

---

[1]...... کیونکہ دنیا کا حاصل کرنے والا جو کچھ حاصل کرتا ہے، غیروں کے لیے حاصل کرتا ہے، لیکن فقط اس قدر کہ جو اس نے کھایا اور پہنا۔۱۲

ابوحازم: حق کے ساتھ لے اور مستحقین پر خرچ کر۔

سلیمان: ابوحازم! تم میرے ساتھ رہو، مجھے تم سے فائدہ پہنچے گا اور تمہیں مجھ سے۔

ابوحازم: میں اس سے پناہ مانگتا ہوں۔

سلیمان: آخر کیوں؟

ابوحازم: میں اس سے ڈرتا ہوں کے میں تیری طرف کچھ مائل نہ ہو جاؤں، اس کے بعد خدا مجھے زندگی اور موت میں دوگنے عذاب چکھائے۔[1]

سلیمان: اچھا تو پھر کوئی نصیحت کرو۔

ابوحازم: اس سے ڈر کہ خدا نے جن مقاموں سے منع کیا ہے، وہاں تجھے وہ دیکھ نہ پائے، جہاں رہنے کا حکم دیا ہے، وہاں تجھے ڈھونڈا نہ جائے۔ (یعنی: ان مقاموں سے غائب نہ ہونے کی صورت میں تلاش ہوتی ہے)

سلیمان: ابوحازم میری بہتری کی دعا کرو۔

ابوحازم: اے خدا! اگر سلیمان تیرا دوست ہے، تو اسے دنیا و آخرت کی بھلائیوں کی بشارت دے اور اگر تیرا دشمن ہے، تو اس کی پیشانی کا بال پکڑ کر اسے بھلائی کی طرف کھینچ لے۔

سلیمان: کچھ اور نصیحت کرو۔

ابوحازم: میں مختصراً بیان کر چکا، اگر تم خدا کے دوست ہو، کافی ہے اور اگر اس کے دشمن ہو، تو پھر وعظ کا کیا حاصل، جو تیر بغیر نشانہ کے چلا جائے گا، اس سے کس چیز کی امید کی جاسکتی ہے......؟

اس کے بعد سلیمان نے آواز دی کہ "اے غلام! سو اشرفیاں لانا اور ہاتھ میں لے کر ابوحازم کی طرف بڑھا کر بولا:

سلیمان: ابوحازم! اسے لے لو۔

ابوحازم: مجھے اس کی ضرورت نہیں، مجھے دغدغہ ہے کہ کہیں یہ میری باتوں کا بدلہ نہ ہو۔ موسیٰ علیہ السلام جب فرعون سے بھاگ کر جاتے ہیں اور مدین کے باؤلی پر پہنچتے ہیں، تو انہوں نے دیکھا کہ دو لڑکیاں اپنے ڈنگروں کو لئے الگ کھڑی ہیں۔ موسی علیہ السلام نے

---

[1]......اشارہ آیت قرآن: ﴿لقد كدت تركن اليهم شيئا قليلا اذالا ذقناك ضعف الحياة و ضعف المماة﴾ ۱۲

ان سے پوچھا کہ تمہارا کیا حال ہے؟ لڑکیوں نے کہا ہم پانی نہیں پلا سکتیں، جب تک کہ تمام چرواہے نہ پلا لیں، ہمارا باپ بوڑھا اور مسن ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ سن کر ان کے ڈنگروں کو پانی پلایا اور اس کے بعد ایک درخت کے سایہ تلے جا کر ٹھہر گئے اور بولے: ﴿رب انی لما انزت الی من خیر فقیر﴾ ”اے پروردگار! تیری نازل کی ہوئی بھلائیوں کا میں محتاج ہوں“۔تو دیکھو انہوں نے اس کام کو چونکہ محض اللہ کے لیے کیا تھا، اس لیے اس پر اجر نہ طلب کیا، ادھر جب وہ لڑکیاں گھر پہنچیں، تو ان کے باپ نے کہا کہ تم اس قدر جلد کس طرح آ گئیں؟ لڑکیوں نے کہا کہ ایک بیچارہ نیک آدمی آ گیا تھا، اس نے ہمارے جانوروں کو پانی پلا دیا، بزرگ نے پوچھا کہ وہ اور کیا کہتا تھا؟ لڑکیوں نے کہا کہ: ﴿رب انی لما انزلت الی من خیر فقیر﴾ کہہ رہا تھا۔ بزرگ نے کہا کہ یقیناً وہ بیچارہ بھوکا معلوم ہوتا ہے، تم میں سے کوئی ابھی جائے اور اس سے جا کر کہے کہ میرا باپ تم کو اس لئے بلا رہا ہے کہ پانی پلانے کا اجر دے۔

حسب حکم ایک لڑکی آئی اور اس نے کہا کہ ابا تمہیں پانی پلانے کی مزدوری دینے کے لیے بلاتے ہیں۔

موسیٰ علیہ السلام نے یہ سن کر ایک چیخ ماری اور میدان اپنے کو ڈال دیا، اس کے اٹھے اور لڑکی کے پیچھے پیچھے چلے۔ جب دروازے پر پہنچے، تو کیا دیکھتے ہیں کہ کھانا رکھا ہوا ہے۔ بزرگ جن کا نام حضرت شعیب علیہ السلام تھا بولے کہ: ہاں! اے جوان شروع کرو۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: ”میں خدا کی پناہ مانگتا ہوں“۔ شعیب علیہ السلام نے کہا: کیوں؟ موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ: ”میں اس ایک گھرانے کا آدمی ہوں، جو اپنے دین کو زمین کے برابر چاندی و سونے سے بھی نہیں بیچ سکتے“۔ شعیب علیہ السلام نے فرمایا: ”خدا کی قسم ایسا نہیں ہے (یعنی: میں تمہیں مزدوری نہیں دیتا ہوں) بلکہ یہ تو ہماری اور ہمارے باپ دادا کی قدیم عادت ہے کہ لوگوں کو کھانا کھلاتے ہیں، مہمانوں کی مہمان نوازی کرتے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام یہ سن کر بیٹھ گئے اور کھانے میں مصروف ہو گئے، بہر حال اے سلیمان! اگر یہ اشرفیاں ان باتوں کا بدلہ ہیں، جو تو نے مجھ سے سنی ہیں، تو میں اپنے لئے مردار اور خون کھا لینے کو وقتِ ضرورت کے جائز سمجھتا ہوں،

لیکن ان اشرفیوں کو کبھی جائز نہیں سمجھتا۔

سلیمان کو ابو حازم کی باتیں پسند آئیں، خادموں میں ایک شخص بیٹھا ہوا تھا، اس نے کہا کہ امیر المومنین! کیا آپ پسند کرتے ہیں کہ ساری دنیا ابو حازم کی مانند ہو جائے؟

امام زہریؒ اس مجلس میں تھے۔ انہوں نے کہا کہ یہ ایسے آدمی ہیں کہ میں ان کا ہمسایہ ہوں اور تیس برس سے ان کے جوار میں رہتا ہوں، لیکن میں نے تو ان سے کبھی بھی بات نہ کی۔

اس پر ابو حازم نے کہا کہ تم نے خدا کو بھلایا، اس لئے مجھے بھی بھول گئے، اگر تم خدا کو دوست رکھتے، تو پھر مجھے بھی دوست رکھتے۔ امام زہری نے کہا: ''کیا تم مجھے برا کہتے ہو؟'' سلیمان نے زہری کے اس جملہ پر جواب دیا کہ انہوں نے کیا برا کہا؟ کیا ہمسایہ پر ہمسایہ کا حق نہیں ہے، پھر جو تم ان سے نہیں بولتے، یہ کس کا قصور ہے؟

ابو حازم نے اس کے بعد یہ تقریر شروع کی کہ بنی اسرائیل جب سیدھے راستہ پر تھے، تو اس وقت امراء علماء کے محتاج تھے اور علماء ان سے ملنے جلنے میں بخل کرتے تھے۔ اس کے بعد امراء علماء سے بے نیاز ہو گئے، جس کے نتیجہ یہ ہوا کہ قوم معصیت وتمرد پر جم گئی اور دنیا میں مشغول ہو گئی، آخر میں الٹ گئی۔ کاش! اگر ہمارے علماء بھی اپنے علم کی عزت کی حفاظت کرتے، تو امراء ان سے ڈرتے، خوف کرتے۔

زہری یہ سن کر بولے: ''گویا تم ہماری طرف اشارہ کر رہے ہو اور یہ مجھ پر تعریض ہے''۔

ابو حازم نے کہا: ''بس بات وہی ہے، جو تم نے سنی''۔

اس مکالمہ میں حضرت ابو حازم رحمۃ اللہ علیہ کی دینی جراءت کا جس قدر پتہ چلتا ہے، اس سے زیادہ سلیمان کی رواداری قابل غور ہے۔ ایک متقی عالم کی یہی شان ہونی چاہئے، جس کا نظارہ ابو حازم کی گفتگو میں نظر آتا ہے، لیکن بادشاہوں سے یہ بالکل بعید ہے کہ وہ اپنے متعلق ایسی باتیں سنیں اور پھر ناصح کی قدر وعزت کریں۔ ہمارے نزدیک اس مکالمہ سے زیادہ عبرت امراء وقت اور سلاطین عصر کو لینا چاہئے۔ کہا جاتا ہے کہ آج ابو حازم کے ایسے علماء نہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ آج سلیمان جیسا کوئی رئیس بھی نہیں۔ ہر شخص دوسرے پر نکتہ چینی کرتا ہے، لیکن اپنی اصلاح کا خواہاں کوئی نظر نہیں آتا۔

(ماہنامہ الرشید، لاہور)

مذہبی سوالات اور سائینس کی حدِ پرواز

مذہب کے اس بنیادی سوال (عالم کا نقطہ آغاز اور انجام) کو سائینس حل کر سکتی ہے، یا نہیں، اسکے لیے ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ سائینس کی حد پرواز کیا ہے؟ علماء سائینس نے اس علم کی حدود کو متعین کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے:

''سائنس کی بحث و تحقیق کا تعلق تمام تر فطرت کے واقعات اور مشاہدات سے ہے، جو ہمارے زیر تجربہ آسکیں، لیکن جو چیزیں ہمارے احساس اور مشاہدے کے دائرے سے خارج ہیں، سائینس کو انکے اقرار وانکار سے کچھ بحث نہیں''۔

ماہرین سائنس کا اعتراف

پروفیسر لیتیر جو فرانس کا مشہور ماہر سائینس دان ہے، لکھتا ہے: ''کائنات کے آغاز وانجام تک مشاہدے کی رسائی نہیں ہے، اس لئے ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ کسی ازلی، یا ابدی وجود کا انکار کریں، جس طرح ہمارا کام یہ بھی نہیں ہے کہ ہم اس کو ثابت کریں، ہمارا کام نفی واثبات دونوں سے الگ رہتا ہے''۔

پروفیسر ٹنڈل نے اس خیال کو ایک مثال سے سمجھانے کی کوشش کی ہے، اگر تم گھڑی دیکھو اس میں گھنٹے، منٹ، سیکنڈ کی سوئیاں نظر آئیں گی، یہ سوئیاں کیوں پھرتی ہیں اور ان کی حرکت کی باہمی نسبت جو ہمیں نظر آتی ہے، کیونکر قائم ہے؟ ان سوالات کا جواب بغیر گھڑی کو کھولے اور اس کے مختلف پرزوں کو اچھی طرح دیکھے اور ان کا دوسروں سے تعلق قائم کئے بغیر نہیں دیا جا سکتا ہے، جب یہ سب کچھ ہو لیتا ہے، تو ہم کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ سوئیوں کی یہ خاص حرکت گھڑی کی اندرونی ساخت اور مشین کا نتیجہ ہے، جو کوک کی قوت سے چل رہی ہے، سوئیوں کی یہ حرکت صنعت انسانی کا ایک کارنامہ ہے، لیکن بجنسہٖ یہی حال واقعات وحوادث فطرت کا ہے، عالم کی اس مشین کے اندر بھی ایک مخفی مشین کارفرما ہے اور

ایک خزانہ قوت ہے، جو اس مشین کو چلا رہا ہے، سائینس کا انتہائی کام اس مشین اور ذخیرہ قوت سے پردہ ہٹا کر یہ بتانا ہے کہ واقعات وحوادث انہی دونوں کے باہمی تعلق کا نتیجہ ہے، لیکن کارخانہ عالم کی یہ اندرانی مشین خود کیا ہے؟ اور کیسے بنی؟ اور اس گھڑی کو کس نے کوکا اور اس کی چلانے والی قوت کہاں سے آئی؟ یہ وہ سوالات ہیں، جن کا جواب سائینس کے بس سے باہر ہے۔

انسان صرف کچھ جان سکتا ہے، کسی چیز کی تحقیق وایجاد پر وہ قادر نہیں

خلاصہ یہ ہے کہ سائینس نہ تو قدرتی قوانین کو ایجاد کرتی ہے، نہ ان قوانین کی تمام کڑیوں کو سلجھا کر ہمارے سامنے پیش کرسکتی ہے، بلکہ حوادث وواقعات کے محض ان حلقوں کو ترتیب کے ساتھ ہمیں بتانے کی کوشش کرتی ہے، جو اس کے دائرہ احساس ومشاہدہ میں آجاتے ہیں، مثلاً: وہ آگ میں جلانے کی خاصیت پیدا نہیں کرتی، بلکہ صرف یہ بتاتی ہے کہ تجربے سے معلوم ہوتا ہے کہ آگ جلاتی ہے، وہ اسٹیم کو ایجاد (وجود بخشنا، تخلیق کردند) نہیں کرتی، بلکہ صرف اس حقیقت سے پردہ اٹھا دیتی ہے کہ جب آگ کا تعلق پانی سے ہوتا ہے ،تو یہ ایک قدرتی قانون ہے کہ وہ بھاپ بن جائے، بہر حال ہمارے سامنے جو کچھ قدرتی قوانین پھیلے ہوئے ہیں، ہم ان کو بنا نہیں سکتے، بلکہ صرف جان سکتے ہیں اور سائینس اس پر اتنا اور اضافہ کرتی ہے کہ اسی حد تک جان سکتے ہیں، جس حد تک مشاہد ہمارا ساتھ دے گا،لیکن یہ سوال کہ اس قوانین کا مقنن کون ہے،ان کا نقطہء آغاز کیا ہے اور ان کا آخری انجام کیا ہوگا؟ سائینس کے حدود سے اس کا جواب خارج ہے۔

ہکسلے نے سائینس کی اسی درماندگی کا اندازہ کرنے کے بعد بالکل سچ لکھا ہے کہ:

''وہ کسی چیز کی بھی کامل توجیہ نہیں کرسکتی، اسکے سارے اسباب اول سے آخر تک نہیں بتائے جاسکتے، کیونکہ انسان کا اعلیٰ سے اعلیٰ بھی توجیہ میں آغاز اشیاء کی جانب چند قدم سے آگے نہیں بڑھ سکتا''۔

حکیم اور عامی میک میں فرق

بہر حال انسان کی انتہائی پرواز سائینس کے نقطہءنظر سے صرف اسقدر ہے کہ کل نہیں ، بلکہ فطرت کے صرف ان قوانین کو وہ جان سکتا ہے، جو جو اس کی گرفت میں آجائیں، باقی رہا

یہ سوال کہ جب صرف محسوس قوانین کی واقفیت پر عام انسانی پرواز ختم ہو جاتی ہے، تو حکیم اور عامی میں کیا فرق رہا؟ تو بات یہ ہے کہ گو عامی کا علم بھی مشاہدات اور محسوسات ہی تک محدود رہتا ہے اور حکیم بھی اس دائرے کے آگے قدم نہیں رکھ سکتا، لیکن دونوں میں فرق یہ ہے کہ عامی آدمی کسی حادثہ، یا مظہر قدرت کو جب دیکھتا ہے، تو وہ اس کے اثرات کو دور نہیں لے جاسکتا، یعنی: ایک جزئی واقعے سے کلیہ نہیں بناسکتا اور حکیم ایک جزئی واقعہ کو دیکھ کر چونکتا ہے اور یہ دیکھنا شروع کرتا ہے کہ آیا یہ واقعہ اسی جزئیت تک محدود ہے، یا آگے بھی بڑھ سکتا ہے، پس اگر اسمیں کچھ وسعت نظر آتی ہے، تو چند جزئیات پر منطبق کرنے کے بعد اسی جزئیہ کو کلیہ کی شکل عطا کرتا ہے اور اسی کو قانون کے نام سے موسوم کرتا ہے، مثلاً: نیوٹن نے سیب کو گرتے ہوئے دیکھا، اس طرح ہر شخص دیکھتا ہے، لیکن وہ چونکا آخر کیوں گرتا ہے، اسکو محسوس ہوا کہ زمین کی کشش کا نتیجہ ہے، اب اس کشش کی خاصیت کو اس نے دوسری چیزوں میں ڈھونڈنا شروع کیا، بالآخر اس نے اعلان کیا کہ فضا میں جتنے کرّے تیر رہے ہیں، وہ سب جذب و کشش ہی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں، بہر حال نیوٹن نے فضائی کرّوں کی خاصیت کا ایک علم حاصل کیا، لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ وہ ان کرّوں کا موجب تھا، یا اس نے ان میں جذب و کشش کی خاصیت پیدا کردی تھی، جو قانون پہلے سے موجود تھا، صرف اسکا علم اس نے حاصل کیا، اس سے زیادہ نہ اس نے کچھ کیا اور نہ کرسکتا تھا، وہ خود کہتا ہے:

''عالم فطرت کی یہ نیرنگیاں (جذب و کشش) واجب الوجود کے ارادے کے سوا اور کسی شے سے ظاہر نہیں ہوسکتیں، وہ واجب الوجود جو ہر جگہ اور ہمیشہ موجود ہے اور یہی حال سائینس کے تمام مسائل اور اختراعات کا ہے، بھاپ سے کیتلی کے ڈھکنے کو اٹھتے ہوئے سبھی دیکھتے ہیں، جس طرح اسٹیفن نے دیکھا، لیکن اسٹیفن نے اس جزئی مشاہدہ سے ایک کلیہ پیدا کیا اور اس کلیہ کو فطرت کے دوسرے قوانین مثلاً: لوہے کی لچک، پہیوں کی گردش، اسی قسم کے میکانکی قوانین کے علم کے ساتھ وابستہ کردیا، اس نے اپنے کسی پیدا کردہ قانون کو نہیں، بلکہ قدرتی قوانین کو اس شکل میں نمایاں کیا ہے، جسے ہم ''ٹرین'' کہتے ہیں''۔

الغرض صنعت وحرفت والے قدرتی قوانین کے جزئیات سے کلیات کا علم حاصل کرتے ہیں، لیکن کسی چیز کی ایجاد (یعنی: اس کو وجود بخشنا) ایک غریب انسان کے بس کی

بات نہیں، وہ فقط "علّم ادم الأسماء کلھا" (سکھایا اللہ نے آدم کو سارے اسماء) کے اجمال کی تفصیل کرسکتا ہے اور یہی اسے دیا بھی گیا ہے۔

سائینس اور مذہب کے حدود

الحاصل جب سائینس کا سارا زور مشاہدات اور محسوسات پر ختم ہو جاتا ہے، تو خود اندازہ کرو کہ جن سوالات پر مذہب کی بنیاد قائم ہے، مثلاً: عالم کا نقطہ آغاز کیا ہے؟ جیسا کہ ہکسلے نے کہا تھا کہ سائینس کا قدم آغاز اشیاء کی جانب چند قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا، تو پھر آخری نقطے تک اس کی رسائی کیونکر ہو سکتی ہے......؟

پس سچ یہ ہے کہ سائینس جہاں اپنی تحقیقات ختم کر دیتی ہے، مذہب وہیں سے اپنا درس شروع کرتا ہے، سائینس صرف عالم شہادت (عالم محسوس) کے چند واقعات محسوسہ کو کلیات کی شکل میں پیش کر کے اپنا بازو ڈال دیتی ہے، محسوسات کے آگے قدم رکھتے ہی اس پر رعشہ طاری ہو جاتا ہے، وہ کچھ نہیں کہہ سکتی کہ آگے کیا ہے، اور مذہب انسان کا یہیں سے ہاتھ پکڑتا ہے اور غیب (عالم غیر محسوس) کے سارے اسرار کو اس کے سامنے بے نقاب کرتا چلا جاتا ہے، سائینس کچھ نہیں بتا سکتی کہ دنیا کی ابتداء کیونکر ہوئی، مذہب آتا ہے اور اس حقیقت سے پردہ اٹھا دیتا ہے، انسان مرنے کے بعد کہاں جاتا ہے اور اس پر کیا گزرتی ہے؟ سائینس اس کے جواب سے عاجز ہے اور مذہب اس کی تفصیل پیش کرتا ہے، دنیا کا آخری انجام کیا ہوگا؟ سائینس متحیر ہے کہ اس کا کیا جواب دے، مذہب آتا ہے اور اس حیرت کو مٹا دیتا ہے، سائینس یہ تو بتاتی ہے کہ عالم کس کے لئے ہے، لیکن خود انسان کس لئے ہے؟ اس مقصد کو متعین کرنے سے وہ عاجز ہے، مذہب آتا ہے اور اس مسئلے کو بھی صاف کر دیتا ہے، الغرض مذہب کا جس عالم سے تعلق ہے، سائینس کی ہدایت کا چراغ اس کے حدود تک پہنچتے ہی گل ہو جاتا ہے۔ میلن ایڈورڈ کہتا ہے اور سچ کہتا ہے کہ:

"عالم کے ان قوانین کی نسبت یہ کہنا کہ محض بخت واتفاق کے نتائج ہیں، یہ فرضی احتمالات اور عقلی گمراہیاں ہیں، جسے لوگوں نے محسوسات کا لقب دے رکھا ہے۔ فزیکل سائینس جاننے والا ہرگز اس قسم کا دعویٰ نہیں کرسکتا"۔

(بحوالہ الکلام مولانا شبلیؒ)

اس کے بعد عوام الناس کا یہ خیال کہ سائینس کی جدید تحقیقات نے مذہب کی بنیادیں ہلادی ہیں، جیسا کہ گینزرو نے غایت گستاخی کے ساتھ لکھا ہے کہ:

''ہم نے خدا کی عارضی خدمات کا شکریہ ادا کر کے اس کو سرحد پار پہنچادیا''۔

(نعوذ باللہ تعالیٰ شأنہ) کس درجہ جاہلانہ اور مضحکہ خیز ہے...! کسی[1] نے خوب کہا ہے کہ:

''اگر خشکی کی ٹرین سمندر کے جہاز سے ٹکرا سکتی ہے، تو سائینس بھی مذہب سے ٹکرا سکتی ہے''۔

مطلب یہ ہے کہ جب دونوں کی حدود جدا جدا ہیں، ایک کی تگ ودو محسوسات کے تنگ دائرہ تک محدود ہے اور دوسرا غیبی فضا کا شہباز ہے، تو ان دونوں میں تصادم کا کیا مطلب ہوسکتا ہے، حافظ شیرازیؒ سچ فرماتے ہیں۔

عاقلاں نقطۂ پرکار وجود اندوے
عشق داند کہ دریں بادیہ سرگردانند

خلاصہ یہ ہے کہ سائینس اور مذہب بالکل دو جداگانہ چیزیں ہیں، نہ ان دونوں میں اختلاف ہے اور نہ ہوسکتا ہے، ہم سائینس کے ذریعے آسمان کے تاروں کو گن سکتے ہیں، آفتاب کو ناپ سکتے ہیں، ہوا کو تول سکتے ہیں، سمندر کو خشک کر کے بادل بنا کر پانی برسا سکتے ہیں، بلکہ ممکن ہے کہ آئندہ مردوں کو زندہ کرنے کی تدبیر بھی معلوم ہوجائے، جیسا کہ حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ''احیاء موتی''[2] (مردے کو زندہ کردینے) پر بھی آدمی قادر

[1]:...... میری مراد مولانا عبدالباری ندوی پروفیسر جامعہ عثمانیہ سے ہے۔ مولانا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس منعقد سورت میں ایک مقالہ ''دینیات اور عقلیات'' کے عنوان سے پڑھا تھا۔ یہ رسالہ کانفرنس کی طرف سے شائع بھی کردیا گیا۔ درمیان سدا آہنی اسی رسالہ کو قرار دیا ہے۔ خاکسار نے بھی اس کتاب کے ابتدائی حصہ میں درج ہیں۔ ان کی معقول تعداد مولانا ہی کے مضمون سے نقل کی گئی ہے۔ ۱۲ منہ۔

[2]:...... دجال کی حدیثوں میں اس کا ذکر ہے کہ منجملہ اور باتوں کے وہ مردے کو بھی زندہ کرے گا، حدیثوں کا صحیح ذخیرہ دجال کی اس خصوصیت کہ چالیس دن کی مختصر مدت میں کرہ زمین کے شمال وجنوب مشرق ومغرب کی ہر آبادی میں پہنچ جائیگا۔ یعنی بعد مسافت کے مسئلہ کو گویا درجہ صفر تک پہنچادے گا۔ یا مون سون پر (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ہو جائے گا، بلکہ زندہ کرے گا، دوسرے لفظوں میں اس کو یوں بھی ادا کر سکتے ہیں کہ:

''انسان زندگی کے قانون سے بھی واقف ہو جائے گا''۔

اور سائینس والوں کا بھی بیان ہے کہ ہم نے ''تخم حیات'' (پروٹو پلازم) کا پتہ چلا لیا ہے، کیمیا والے کہتے ہیں کہ تخم حیات کاربن، آکسیجن، نائٹروجن کی باہمی ترکیب سے تیار ہوتا ہے، تو سائینس یہ سب کچھ کر سکتی ہے اور ہم اس کے منتظر ہیں کہ وہ ایسا کرے، کیونکہ ہمارے بہت سے ایمانی دعووں کی توثیق انہیں اکتشافات پر موقوف ہے، لیکن بایں ہمہ مذہبی سوالات کے حل میں سائینس اسی طرح عاجز رہے گی، جس طرح پہلے تھی اور اس وقت تک ہے، فرض کیجئے کہ کیمیائی عناصر کی ترکیب سے ہم نے زندگی کو پیدا کر بھی لیا، تو اس سے یہ مسئلہ کہاں حل ہوا کہ ان عناصر کی ترکیب سے زندگی کیوں پیدا ہو جاتی ہے، ٹھیک اس کی مثال ایسی ہے کہ زندگی کا راز کسی زمانے میں یوں حل کیا گیا تھا کہ نر و مادہ کے باہمی اختلاط کا یہ نتیجہ ہے، لیکن اس وقت یہ بھی سوال پیدا ہوتا تھا کہ اس اختلاط سے یہ نتیجہ کیوں پیدا ہوتا ہے، اب بھی یہ سوال اسی طرح باقی رہے گا کہ کاربن، آکسیجن، ہائیڈروجن، نائٹروجن کی باہمی ترکیب سے زندگی کیوں پیدا ہو جاتی ہے؟ کیا جو شخص اس سے واقف ہے کہ تخم کو مٹی میں ملانے اور پانی دینے سے پودا پیدا ہو جاتا ہے، کیا اس نے اس سوال کو حل کر لیا کہ پودا کیونکر پیدا ہوتا ہے؟ پروفیسر ٹنڈل نے بلفاسٹ کے لیکچر میں ایک موقع پر کتنی اچھی بات کہی کہ:

''لیکن کیوں؟ اس کا جواب ہمیشہ کے لیے اسی طرح ناممکن رہے گا، جس طرح کہ پہلے رہا ہے''۔

امجد حیدر آبادی نے بھی اس مضمون کو ایک شعر میں ادا کیا ہے۔

امجد ہر بات میں کہاں تک کیوں کیوں
ہر کیوں کی ہے انتہا خدا کی مرضی

(بقیہ گذشتہ صفحہ سے آگے) قابو یافتہ ہو کر جہاں چاہے گا پانی برسائے گا۔ آپ اگر غور کریں گے تو سائنس کے رجحانات ان چیزوں کی تکمیل کی طرف ہیں۔ ریل، موٹر، ہوائی جہاز، ٹیلی فون، ریڈیو وغیرہ کا حاصل بعد مسافت کی کمی کے سواء اور کیا ہے۔ بارش برسانے کی طرف ہیں۔ ریل، موٹر، ہوائی جہاز، ٹیلی فون، ریڈیو وغیرہ کا حاصل بعد مسافت کی کمی کے سوا اور کیا ہے۔ بارش برسانے کی جد و جہد بھی [illegible] ہے کہ سائنس کی دنیا میں جاری ہے۔ پھر کیوں نہیں کہا جا سکتا کہ سائنس [illegible] عروج ممکن ہے کہ دجال ہی کے ہاتھوں مقدر ہو''۔

الحاصل کسی شے کے آغاز کا پتہ چلانا اوراس کے آخری انجام تک پہنچنا سائینس کی رہنمائی میں ناممکن ہے، چند قدم چل کر اس کو اپنی نارسائی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے، علی الخصوص جب حواس اس کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں اور یہی حال انجام کا ہے، آئندہ کیا ہوگا ،موجودہ قوانین کا آئندہ کیا حال ہوگا ،اس کے آثار ونتائج کیا ہوں گے؟اس کا بھی کوئی قطعی جواب سائینس نہیں دے سکتی، وہی ہکسلے جس نے آغاز کے متعلق انسان کے جاہل ہونے کا اقرار کیا تھا،اب انجام کے متعلق بھی اسی اعتراف کا اظہاران الفاظ میں کرتا ہے:

''عالم تو بڑی چیز ہے، سائینس کا معمولی قانون یہ ہے کہ جو پتھر بے سہارا ہوگا،اس کو زمین پر گر پڑنا چاہئے ،لیکن ہمیشہ کیا یہی ضروری ہوگا....؟''۔

اس کے نزدیک یہ قانون قدرت نہیں ، بلکہ انسان کا وہمی اضافہ ہے،اس کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

''وہ ڈراؤنا لزوم اور ضروری ہونے کا قانون کیا ہے، جس نے لوگوں کو اس قدر خائف اور وحشت زدہ بنا رکھا ہے، سچ پوچھو،تو یہ ہمارے واہمہ کا گھڑا ہوا بھوت ہے، سائینس ہی کا یہ قانون ہے کہ جب پتھر بے سہارا ہوگا ،تو اس کو زمین پر گر پڑنا چاہئے ،لیکن آئندہ وہ ہمیشہ گر ہی پڑے گا،یعنی: اس کے خلاف ہونا ناممکن ہے، یہ ایک ایسی زائد شے کا اضافہ ہے، جس کا نہ تو مشاہدہ اور واقعات میں نشان ملتا ہے اور نہ کہیں اور سے اس کا پتہ چلتا ہے''۔

یعنی: یہ ایسا حکم ہے، جس کی شہادت ہمارے حواس نہیں دیتے۔

سائینس کی یہ رائے تو انجام کے متعلق تھی ، رہا آغاز اس کے متعلق میں نے چند اقوال پہلے بھی درج کئے ہیں ،لیکن آخر میں ہکسلے ہی کے قول کو پیش کر کے اس بحث کو ختم کرتا ہوں، وہ اپنی کتاب ''اصول ونتائج'' میں لکھتا ہے:

''وجود کی علت اولیٰ کا مسئلہ، میرے حقیر قویٰ کی دسترس سے باہر ہے، جتنی لایعنی ہرزہ سرائیوں کے پڑھنے کا مجھے موقع ملا، ان میں سب سے بدتر ان لوگوں کے دلائل ہوتے ہیں، جو آغاز عالم کے متعلق موشگافیاں کرتے ہیں، مگر ان لوگوں کے مہملات ان سے بھی زیادہ بڑھ جاتے ہیں، جو یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ کوئی خدا نہیں ہے''۔

(ماہنامہ الحق اکوڑہ)

سائنسی ایجادات کا سرچشمہ کون ہے؟

عملی وفکری قوتوں کا نتیجہ، یا قدرت کی کرشمہ پردازی؟

سورۂ کہف میں باغ اور کاشت رکھنے والے آدمی کو، یعنی: بسطی پیمانے پر جسے رزق دی گئی تھی، اسی کے متعلق کہنے والوں کی زبان سے یہ فقرہ جو کہلوایا گیا ہے۔

(لو لا اذ دخلت جنتك قلت ماشاء الله لاقوة الا بالله)

''اور کیوں نہ ہوا ایسا کہ جب تو اپنے باغ میں داخل ہوا، تو کہا ہوتا کہ جو کچھ ہے، سب اللہ کا چاہا ہے، نہیں ہے قوت، لیکن اللہ ہی سے''۔

جس کا حاصل یہی ہے کہ نعمتوں کو پالنے کے بعد آدمی کو چاہیے کہ واقعہ کے مطابق ان کے متعلق جو صحیح دانش اور علم ہو، اس کو اپنے سامنے سے اوجھل ہونے نہ دے، مثلاً: باغ والے کے سامنے اس کا باغ تھا، حکم دیا گیا کہ اس باغ میں جب جایا کرو، تو دو باتیں سوچا کرو، ایک تو یہ کہ جو کچھ ہے، سب اللہ کا چاہا ہوا ہے، اور دوسری بات یہ کہ قوت اور طاقت جو کچھ بھی جس کسی میں ہے، اس کا سرچشمہ حق تعالیٰ کی ذات مبارک ہے، ظاہر ہے کہ پہلی بات کا مطلب یہی ہوسکتا ہے کہ جن شکلوں میں نعمتوں کا ظہور ہوا ہو، ان کو دیکھ کر چاہیے کہ اس واقعہ کے احساس کو ہم اپنے اندر پیدا کرتے رہیں کہ ان کی آفرینش اور پیدائش سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے، بلکہ یہ سب کچھ قدرت کی کارفرمائیوں کا نتیجہ واثر ہے۔ باغ ہی کو دیکھئے، باغ کی زمین، باغ کے درخت، درختوں کی شاخیں، پتے، پھول، پھل، اسی طرح وہ سارے اسباب جنہیں باغ کی نشوونما، بارآوری میں دخل ہے، ان میں کوئی چیز بھی ایسی ہے، جسے آدمی پیدا کرتا ہے، باغ تو خیر باغ ہی ہے۔

انسانی مصنوعات اور قدرت کی کارفرمائی

ایسی چیزیں جنہیں ہم انسانی مصنوسات خیال کرتے ہیں، بلکہ جن مصنوعات کے متعلق عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ فلاں کی ایجاد ہے، مثلاً: ریل گاڑی اور اس کے انجن ہی کو لیجئے، سوچئے، انجن کے اجزاء لوہا، تانبا، پیتل، انجن کے فلزاتی وہنیرمی عناصر اور اس کے سوا

جو چیزیں اس کے بنانے میں استعمال ہوتی ہیں، کیا ان میں سے کسی ایک چیز کے پیدا کرنے والے ہم ہیں؟ اسی طرح انجن جن چیزوں سے چلتا ہے، بتایئے کہ آگ ہو، یا پانی، کیا آدمی ان کا پیدا کرنے والا ہے؟ پانی کو آگ پر چڑھانے سے اسٹیم پیدا ہوتی ہے، کیا پانی اور آگ میں یہ خاصیت آدمی کی رکھی ہوئی ہے؟ کھلی ہوئی بات ہے کہ یہ بھی قدرت کا بنایا ہوا قانون ہے، اسٹیم میں حرکت پیدا کرنے کی قوت ہے، کیا اس قوت کو آدمی نے پیدا کیا ہے؟ سوچتے چلے جایئے، اگر آپ حقیقت پر نظر جماتے ہوئے سوچیں گے، تو بالآخر ہر سوال کے جواب میں آپ کو وہی ''ماشاء اللہ'' کہنا پڑے گا، یعنی: سب اللہ کا چاہا ہوا ہے اور اسی کی قدرت کی یہ کرشمہ پردازیاں ہیں، یہ تو پہلے فقرے ''ماشاء اللہ'' کا مطلب ہوا، رہی دوسری بات، یعنی: ''لاقوۃ الا باللہ'' یہ اس وسوسہ کے ازالہ کی طرف اشارہ ہے، جو عموماً ایسے موقعہ پر دلوں میں پیدا ہوتا ہے، یا ہوسکتا ہے، خیال یہ گزرتا ہے کہ ہیں تو سب کچھ قدرتی پیداوار اور قدرتی قوانین ہی کے نتائج، لیکن انسان جب تک ان قوانین کا علم نہ حاصل کرے اور علم حاصل کرنے کے بعد اپنی محنت وتوجہ کو ان پر صرف نہ کرے، عقل کی ترکیبوں اور ذہن کی تجویزوں کو ان میں نہ لگائے، انجن کا وجود نہیں ہوسکتا اور انجن ہی کیا، باغ میں جب تک باغبانی کے قواعد اور قوانین کی پابندی نہ کی جائے گی، اس وقت تک جیسا کہ چاہیے اس کے پھلنے پھولنے کی کیا صورت ہوسکتی ہے اور اتنا حصہ ان چیزوں میں یقیناً آدمی کا ہے، اسی وجہ سے ان چیزوں کو انسانی مصنوعات وایجادات میں لوگ شمار کرتے ہیں، ورنہ اتنا احمق کون ہوگا، جو سمجھتا ہو کہ انجن کے لوہے، یا اس میں جو آگ جلتی ہے، جو پانی خرچ ہوتا ہے، ان چیزوں کا ایجاد کرنے والا اور پیدا کرنے والا آدمی ہے۔

علمی وعملی قوتوں کا خالق اللہ ہے

دراصل اسی کے متعلق اس دوسرے فقرے میں چاہا گیا ہے کہ ٹھیک حقیقت اور واقعہ کے بالکل مطابق اپنے علم کو کرلیا جائے، یعنی: یہ سوچنا چاہیے کہ بلاشبہ ان امور کے ظہور میں انسانی ترکیبوں اور تدبیروں کو دخل ہے، لیکن ہمیں اپنے آپ سے یہ پوچھنا چاہیے کہ ان ترکیبوں اور تدبیروں کا تعلق انسان کی جن علمی وعملی قوتوں سے ہے، خود ان قوتوں کا

پیدا کرنے والا کون ہے، کھلی ہوئی بات ہے کہ ہم جب خود اپنے پیدا کرنے والے نہیں ہیں ،تو ان قوتوں کے پیدا کرنے والے ہم کیسے ہو سکتے ہیں، جو ہمارے اندر پائی جاتی ہیں، بلکہ جو ہمیں پیدا کرنے والا ہے، ظاہر ہے کہ اسی کے ارادہ ومشیت سے ہماری ان قوتوں کا بھی تعلق ہے۔ ''لاقوۃ الا باللہ'' دراصل اسی واقعہ کی یافت کا نام ہے۔

اس کی شہادت

یوں بھی اگر سوچا جائے کہ جن ایجادات وانکشافات کو ہم اپنی اپنی دماغی قابلیتوں ،فکر وغور کی محنتوں کی طرف منسوب کرتے ہیں، کیا واقعی وہ ہمارے فکری نتائج ہوتے ہیں؟ میں آپ کے سامنے دو چیزیں پیش کرتا ہوں ،ایک واقعہ تو یہ ہے کہ جدید مصنوعات وایجادات ،یا انکشافات جن لوگوں کی طرف منسوب ہیں ،زیادہ تر میرا خیال ہے کہ اگر صد فی صد نہیں ،تو ۹۰ فیصد یہ وہی لوگ ہیں ،جنہیں باضابطہ تعلیم کا یا تو سرے سے موقع ہی نہیں ملا یا، کچھ تھوڑی بہت ابتدائی تعلیم کسی نے حاصل بھی کی ہے، یا تو عام طور پر اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقات کے مقابلے میں ان کی تعلیم صفر کی حیثیت رکھتی ہے۔اس بیسویں صدی کے موجد اعظم ایڈیسن ہی کو لیجئے ،اس بہرے موجد کی سوانح عمری سے کون واقف نہیں ،سوال یہی ہے کہ اگر آدمی کی فکری وعقلی قوتوں کے نتائج یہ ایجادات ہیں ،تو چاہئے کہ عقلی قوتوں کی تربیت کا جن لوگوں کو اعلیٰ تعلیم گاہوں میں موقعہ ملا، یا ملتا رہتا ہے، ان کا دماغ ایجاد کرنے میں سبقت کرتا لیکن جب واقع یہ نہیں ہے ،تو غور کرنے کی بات ہے کہ ان انکشافات وایجادات کو ہم کس چیز کا نتیجہ قرار دیں۔

دوسری بات اسی کے ساتھ جسے میں پیش کرنا چاہتا ہوں ،وہ یہ ہے شاید دوسرے بھی جانتے ہوں کہ ان ایجادات وانکشافات کے متعلق ایک عجیب انکشاف یہ بھی ہے کہ عموماً کسی ایک ایجاد کا خیال کسی ملک میں کسی شخص کے دماغ میں جب آیا تو ٹھیک انہی دنوں میں دیکھا گیا ہے کہ بالکل دور دراز ممالک کے رہنے والوں میں سے بھی کسی کے دماغ میں بھی ٹھیک انہی دنوں میں اس ایجاد کا خیال آیا۔ مصر کے مشہور عیسائی مجلّہ ''الہلال'' کی اشاعت ۱۹۲۲ء نومبر میں ایک مقالہ میں اسی ''توارد'' کے متعلق شائع ہوا ہے۔ استقراء اور

تتبع سے مقالہ نگار نے عہدِ حاضر کی ۱۴۳ ، ایجادوں کے متعلق ثابت کیا ہے کہ ایک ہی زمانے میں دومختلف ملکوں کے باشندوں کوان کا توارد ہوتا رہا ہے، مثلاً: امریکا میں ایک بات کسی کی سمجھ میں آئی، ٹھیک اسی ہفتے میں دیکھا گیا کہ انگلستان کا ایک آدمی بھی اپنے دماغ میں اسی کا خیال پا رہا ہے، آخر بتایا جائے کہ اس توارد کی کیا توجیہ ہوسکتی ہے..........؟!

(الحق اکوڑہ)



موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

انسانی فطرت کی لامحدود خواہشات کیسے پوری ہوں؟

طفلِ تسلی کی وہ جھوٹی شکل کیا انسان کی غیر مطمئن فطرت کو واقع میں مطمئن بنانے میں کامیاب ہوسکتی ہے؟ میرا مطلب یہ ہے کہ موجودہ نسلوں کو اس کی تھپکیاں دے دے کر کیا ہم چین کے ساتھ سلا سکتے ہیں کہ زمین کے اسی کرّہ پر آج نہیں تو کل ہماری آئندہ نسلوں کو ایسی زندگی میسر آنے والی ہے، جس میں چاہنے والے جو کچھ چاہیں گے، وہی پائیں گے۔ ایسے میکانکی آلات، نئی نئی ایجادات واکتشافات کا ظہور ہونے والا ہے کہ اس کے بعد محرومی کا یہ گلہ آدم کی اولاد کو باقی نہ رہے گا، مگر اس امکان کے تصور کی یہاں قطعاً گنجائش نہیں۔ ہاں! انسانی فطرت اور اس کے لامحدود مطالبوں کا امالہ ایک ایسی عجیب و غریب شکل میں مذہب کے ذریعہ سے ہوجاتا ہے کہ اس کی ساری بے چینیاں، چین کی اور ساری پریشانیاں سکون وعافیت کی سیڑھیاں بن جاتی ہیں۔

انسانی فطرت صبر اور سیری کی صفت سے محروم رکھ کر پیدا کی گئی ہے اور معاشی سرمایہ جس پیمانہ پر یہاں پیدا ہو رہا ہے، خواہ دیکھنے میں وہ جتنا بھی نظر آئے، لیکن قدرت کا یہ اٹل قانون ہے کہ مجموعی حیثیت سے بسط وفراخی کی کیفیت اس سے کبھی پیدا نہیں ہوسکتی، اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم میں کوئی ہو، ہر ایک یہی محسوس کر رہا ہے کہ اس کی چاہ پوری نہیں ہو رہی ہے، غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ تر ہماری اندرونی جھنجھلاہٹوں کا تعلق اسی صورتِ حال سے ہے، جسے دیکھئے، جہاں دیکھئے، جس طرف دیکھئے، یہی آواز آرہی ہے کہ۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

اسی چیز نے انسانی زندگی کو ایک طوفان بنا دیا ہے، ایسا طوفان کہ ہر جینے والا یہ کہتے ہوئے مر رہا ہے۔

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

ہمارے شاعروں نے اسی کی تصویر مختلف الفاظ میں کھینچی ہے، سیاست کی یہ قید ان کو کبھی غم کا پھندا اور بند نظر آتا ہے، اسی لئے:

''قید حیات و بند غم'' اصل میں دونوں ایک ہیں

کا فیصلہ کیا جاتا ہے، کبھی یہی غالب ''زندگی'' کو ''سوز'' اور ''سوز'' کو ''زندگی'' بتاتے ہوئے بالآخر اس حقیقت کے اعلان پر کہ ؎

غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے۔ زندگی کسی قالب اور کسی رنگ میں ہو، قالب کی نگاہوں میں وہ جلتی ہوئی ایک شمع ہے، کسی رنگ کی چمنی اس پر چڑھائی جائے، سبز ہو، یا سرخ، لیکن جب تک روشن ہے، جلے گی اور جب تک جلتی رہے گی، اسی وقت تک وہ روشن ہے، شیراز کے عارف کو تو کھل کر یہ کہنا پڑا کہ ؎

نہ گل از داغ غمت ست نہ بلبل درباغ
ہمہ را نعرہ زنان جامہ داراں می داری

(حافظ)

الغرض بے چینی اور اضطراب، کرب و تکلیف کی اسی کیفیت کا احساس موجودہ زندگی میں سب ہی کو ہو رہا ہے۔ انفرادی طور پر ہو سکتا ہے کہ اس میں استثنا بھی ہو، جیسے ہر کلیہ میں استثناء بھی ایک کلیہ ہے، لیکن اضطراب و بے چینی، کرب و تکلیف کے عام ہنگاموں میں ٹٹولنے والوں کو عموماً یہی کانٹا چھپا، یا چبھا ہوا نظر آیا ہے کہ سب، سب کچھ چاہتے ہیں، لیکن چاہنے والوں کی چاہ کو پوری کرنے کے لیے جو سرمایہ یہاں پیدا ہو رہا ہے، وہ ایک ایسے مقررہ محدود پیمانہ پر پیدا ہو رہا ہے، جس سے سب کی یہ چاہ پوری نہیں ہو سکتی، اکبر مرحوم نے فرمایا تھا ؎

یہ بات ہے صاف مجھ سے سن لے کتاب میں اسکو کیا پڑھے گا
حدودِ فطرت کے ہیں مقرر جو یہ گھٹے گا تو وہ بڑھے گا

لامحدود خواہشوں والی فطرت کا رخ ایسے محدود سرمائے کی طرف پھیر دیا گیا ہے، جسے دنیا کی کوئی طاقت لامحدود نہیں بنا سکتی، محدود پر لامحدود کا انطباق چونکہ نہیں ہو رہا ہے اور نہیں ہو سکتا ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ خواہشوں کے جس محدود حصہ کو تکمیل کا موقعہ مل جاتا ہے، اس وقت تو آدمی مسرور ہوتا ہے، لیکن نہ پورے ہونے والے ارمانوں کا جو قافلہ عدم کی راہ لے رہا ہے، اسی کا ماتم ہے، جس کے غم میں اولادِ آدم سوگوار ہے۔ مسکین شاعر نے کتنے دردناک پیرایہ میں کہا تھا۔

ہوئے ہیں دفن مرے ساتھ سینکڑوں ارماں
عدم کی راہ سے جاتا ہے قافلہ دل کا

پھر کیا کیا جائے؟ کیا چھوڑ دیا جائے، اسی حال میں آدمی کو تڑپتا پھڑکتا چھوڑ دیا جائے کہ۔

جنت بنا سکے گا ہرگز نہ کوئی اس کو
اکبر یونہی چلی ہے دنیا یوں ہی چلے گی

کہتے ہیں کہ "الیاس احدی الراحتین" "قنوط و مایوسی بھی ایک قسم کی راحت ہی ہے"۔ اسی قسم کی راحت جو ارمانوں اور امیدوں کے پورے ہونے سے ہوتی ہے، شعر کی دنیا میں ہو سکتا ہے کہ سن بھی لیا جائے، لیکن کامیابی کی مسرت اور ناکامی کی خاموش کھسیاہٹ حقیقت بینوں کی نگاہ میں ایک نہیں ہو سکتی۔ اگر راحت کی یہ دونوں شکلیں ایک ہی ہیں، تو تجربہ کر کے دیکھ لیا جائے، ایک کو دوسرے سے بدلنے کے لیے کیا کوئی تیار ہو سکتا ہے؟

یہ نہیں تو طفلِ تسلی کی وہ جھوٹی شکل کیا انسان کی غیر مطمئن فطرت کو واقع میں مطمئن بنانے میں کامیاب ہو سکتی ہے؟ میرا مطلب یہ ہے کہ موجودہ نسلوں کو اس کی تھپکیاں دے دے کر کیا ہم چین کے ساتھ سلا سکتے ہیں کہ زمین کے اسی کرّہ پر آج نہیں تو کل ہماری آئندہ نسلوں کو ایسی زندگی میسر آنے والی ہے، جس میں چاہنے والے جو کچھ چاہیں گے، وہی پائیں گے۔ ایسے میکانکی آلات، نئی نئی ایجادات و اکتشافات کا ظہور ہونے والا ہے کہ اس کے بعد محرومی کا یہ گلہ آدم کی اولاد کو باقی نہ رہے گا۔

ایسا ہوگا بھی، یا نہیں، اُسے تو جانے دیجیے، کم از کم جو قرآن کو خدا کا کلام[1] مان چکے ہیں، ان کے لیے تو اس مکان کے تصور کی جیسا کہ گذر چکا ہے قطعاً گنجائش نہیں، الرزق کی جن پیداواروں کے متعلق قدرت فیصلہ کر چکی ہے کہ عام بسط کی حالت جس سے پیدا ہو، اس پیمانے پر ان کی پیدائش یہاں نہ ہوگی، پھر پیدا کرنے والا جس سرمایہ کو محدود رکھنا چاہتا ہے، اسی کو وہ غیر محدود کیسے بنا سکتے ہیں، جنہوں نے نہ دنیا پیدا کی ہے، نہ دنیا والوں کو پیدا کیا ہے اور بالفرض مان بھی لیا جائے کہ آج نہیں تو کل ایسا ہو کر رہے گا، تو آنے والی نسلوں کے مطمئن ہو جانے سے یہ بتایا جائے کہ موجودہ نسلوں کی غیر تشفی یافتہ خواہشوں کو کیسے اطمینان بخشا جاسکتا ہے۔ زید کے تندرست ہو جانے سے غریب عمر کی بیماری کیسے اچھی ہو جائے گی، مستقبل کی ان بشارتوں میں آپ ہی بتایئے کہ حال والوں، یا ان کے لئے جو کڑھتے اور جھنکتے، چلاّتے اور کراہتے ہوئے، ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اب تک مرتے چلے گئے، مر رہے ہیں، مرتے چلے جائیں گے، ان مسکینوں کا تسکین کے ان مغالطوں میں کیا حصہ ہے؟

میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ ہندوستان کے رہنے والوں کی مشکلات کا صحیح حل اگر یہ واقعہ نہیں ہوسکتا کہ امریکہ، یا ارجنٹائن، برازیل، یا ٹمبکٹو کے باشندے ان مشکلات میں مبتلا نہیں ہیں، پھر جیسے ایک جگہ کے رہنے والوں کی خوشحالیوں سے دوسرے مقام والوں کی بدحالیوں کی تلافی نہیں ہوسکتی، تو ایک عہد کی نسلوں کی تلخیوں کا علاج آپ آنے والے

---

[1]:...... سورۂ بلد کی مشہور آیت ہے: ﴿لقد خلقنا الانسان فی کبد﴾ ''قطعاً ہم نے پیدا کیا ہے آدمی کو دردِ جگر میں''، پھر اس سے پہلے مکہ معظمہ کی اور مکہ معظمہ کے بھی اس زمانے کی جب رسول اللہ ﷺ وہاں زندگی گزار رہے تھے، قسم کھائی گئی ہے، اس کے بعد دوسری قسم ہے: ﴿ووالد وما ولد﴾ ''یعنی: اور قسم ہے والد کی اور جو پیدا ہوا''۔ قرآن کی قسمیں اس دعویٰ کی جس کا ذکر قسموں کے بعد ہوتا ہے، عموماً دلیلیں ہوتیں ہیں، آدمی کی موجودہ زندگی جگر خواری کی زندگی ہے، اس لیے یقیناً وادیٔ غیر ذی زرع، شہر مکہ کی زندگی ایک بہترین مثال ہے، پھر انسان کی فطرت کا یہ تجربہ کہ رسول اللہ ﷺ جیسے ہی خواہ پر اسی مکہ میں زندگی دوبھر کر دی گئی، اس سے بھی موجودہ زندگی کی حقیقت پر روشنی پڑتی ہے، خصوصاً اپنے سب سے بڑے محبوب شہر اور محبوب پیغمبر کو بھی جب اس قسم کی زندگی دی گئی، تو اس سے دوسرے سمجھ سکتے ہیں کہ موجودہ زندگی کی کیا حقیقت ہے، پھر یہ آدمی کا پیدا ہونا گُہر ہونے تک اس قطرہ کا حلقۂ ہائے صد کا نہنگ سے گزرنا، اور ابھی یہ تجربات ختم بھی نہیں ہو پاتے کہ صاحب زادے پھر گہر ہونے کے لیے قطرے کی شکل میں نمودار ہوتے ہیں، باپوں میں بیٹوں کی جو محبت فطرتاً رکھی گئی ہے، وہ زندگی کو پھر تلخ بناتی چلی جاتی ہے، لامتناہی سلسلہ ہے، ایک کے بعد دوسری کڑی نمودار ہو رہی ہے۔

دوسرے عہد کی نسلوں کی شیریں کامیوں کے وعدوں صرف وعدوں سے کیسے کرسکتے ہیں؟ آپ جہنم میں رہنے والوں کو یہ سنا سنا کر کیا خوش کرتے ہیں کہ ان کے پوتے جنت میں پیدا ہوں گے اور دوسروں کی مسرتوں ہی سے اگر ہم اپنی کلفتوں کے ازالہ میں کامیاب ہوسکتے ہیں، تو مستقبل کے مشکوک بے بنیاد اوہامی وعدوں کی کیا ضرورت ہے؟ آپ ہی کے سامنے اسی زمانے میں ہر جگہ، ہر علاقہ اور ہر خطہ میں تشفی یافتہ فطرتوں کی کیا کمی ہے، بتا چکا ہوں کہ انسان سکینت وطمانیت کی جس کیفیت کے لیے تڑپ رہا ہے، یہ مرہم تو ان تمام زندہ ہستیوں کو مفت بغیر کسی کدّ وکاوش، دردسری اور محنت کے حاصل ہے۔ جو انسان بن کر دنیا میں نہیں پیدا ہوئے ہیں، دوسروں کا اطمینان ہی اگر آپ کو مطمئن کرسکتا ہے، تو شاخساروں پر چہچہانے والی چڑیوں، جوئباروں میں تیرنے والی مچھلیوں، اور مرغ آبیوں، مرغزاروں میں کلیلیں بھرنے والے ہرنوں کو دیکھ دیکھ کر بجائے آئندہ نسلوں کے ادھار وعدوں کے اطمینان کی اس نقد دولت کو کیوں حاصل نہیں کرتے۔ مستقبل کے ''شنیدہ'' مواعید سے آپ کی فطرت اگر خنکی حاصل کرسکتی ہے، تو انسان کے سواہر دوسری زندہ ہستی ''دیدہ'' کی شکل میں آپ کے سامنے اسی وقت اسی کیفیت کو تقسیم کررہی ہے، جب دوسروں ہی کا سکون آپ کا سکون بن سکتا ہے، تو پھر دوسروں می خصوصیت پیدا کرنے کے کیا معنیٰ؟

خیر کہاں تک کہتا چلا جاؤں اور جنہوں نے قرآنی صداقتوں کے مطابق زندگی گذارنے کا عہد نہیں کیا ہے، سچی بات تو یہ ہے کہ میرا ان سے خطاب بھی نہیں ہے، فضا میں جو مغالطے پھیلا دیئے گئے ہیں، شعوری، یا غیر شعوری طور پر دیکھتا ہوں کہ مسلمانوں میں بھی ان کے جراثیم کسی نہ کسی طرح پیوست ہوتے چلے جارہے ہیں، اس لیے جہاں تک کہہ سکتا ہوں، کہہ دیتا ہوں، ورنہ ایک سیدھے سادھے مسلمان کے لیے یہی کافی ہے کہ الرزق، یا انسان کے معاشی ذخیروں کی پیدائش کا پیمانہ قرآن کی رو سے اس دنیا میں غیر مبسوط، یا غیر محدود شکل اختیار نہیں کرسکتا، اس کی عدم مبسوطیت اور محدودیت کا جو حال آج ہے، وہی کل بھی رہے گا، اور جب تک یہ حال ہے، الخیر کے حبّ شدید کے روگی اور ہلوعیت وعدم سیری و بے صبری کے عارضہ میں اس مبتلا انسان کی بے چین فطرت، اپنی لامحدود خواہشوں کو معاشی پیداواروں کے محدود سرمائے پر منطبق نہ پا کر ہمیشہ بے کلی اور بے چینی کی اس حالت میں

تڑپتی پھڑکتی رہے گی۔

قانون ازالہ کی راہوں سے علاج کرنے والوں نے آپ دیکھ چکے کہ معاشی زندگی کی اس پیچیدگی کو کتنی اہمیت دے رکھی ہے، زور آزمائیوں کی ساری تدبیروں کو وہ ختم کر چکے اور جو باقی ہیں، انہیں بھی ختم کر رہے ہیں، لیکن اسلام نے بجائے ازالہ کے امالہ کی جو راہ اس سلسلہ میں بھی اختیار کی ہے، وہ کتنی سادہ کتنی آسان کتنی سہل الوصول ہے، ایسی راہ کہ سننے کے بعد ممکن ہے کہ کہنے والے کہہ اٹھیں کہ یہ تو بالکل سامنے کی بات تھی، ایسی بات جس سے کون ناواقف ہے اور یہی میں بھی کہنا چاہتا ہوں کہ آسانیوں کو غلط کاروں اور غلط فہموں نے کیوں دشوار بنالیا، قدرت ظالم نہیں ہے، اپنے بندوں کے لیے وہ رحم اور صرف رحم ہی رحم ہے، کیا یہ سمجھ میں آنے کی بات ہے کہ سب سے زیادہ مکرم ومحترم بنا کر جو پیدا کیا گیا ہے، تمام تقویموں میں سب سے احسن، سب سے اچھی تقویم میں جو ڈھالا گیا، امانت اور خلافت کی خلعت سے جو سرفراز کیا گیا، ایک لمحہ کے لیے کوئی باور کرسکتا ہے کہ قصداً وارادۃً ایک ایسی زندگی اسی کے گلے میں لٹکا دی گئی، جو جہنم بن کر اسے لپٹ گئی، ایسی جہنم جس میں وہ جھلس رہا ہے، تڑپ رہا ہے، جل رہا ہے، بھن رہا ہے اور اس طور پر جل بھن رہا ہے کہ علاج کی ساری تدبیریں اس عذاب سے نکلنے اور نکالنے میں بے کار ثابت ہورہی ہیں، ذہنی ارتقاء اور عقلی عروج کا انتہائی زمانہ جس عہد کو انسانیت کے لیے ٹھہرایا جارہا ہے، اس عہد میں بھی آئندہ نسلوں کے متعلق استقبالی وعدوں کی جھوٹی طفل تسلیوں کے سوا علاج کی کوئی دوسری تدبیر اب تک کسی کی سمجھ میں نہیں آئی ہے اور نہ آنے کی امید ہے۔ بہرحال بجائے ازالہ کے امالہ کی جس عجیب وغریب تدبیر کو میں اسلام کی طرف جو منسوب کر رہا ہوں، آپ نے سمجھا؟ میں کیا کہہ رہا ہوں، کیا کہنا چاہتا ہوں؟

حقیقت تو یہ ہے کہ میں الدین، یا مذہب کے نظام ہی کو اسی امالہ کی واحد، بے خطا تدبیر سمجھتا ہوں، خود ہی سوچ لیجئے، مذہب کس چیز کا نام ہے؟ یہی نا کہ زندگی کے موجودہ دور کو جس کا نام قرآنی اصطلاح میں ''الحیوۃ الدنیا'' ہے، اسی ''الحیوۃ الدینا'' کو لامحدود قدرت وقوت رکھنے والے خالق کی مرضی کے مطابق اس لئے گذارنا، تاکہ خالق کی لامحدود قوتیں بھی انسانی مرضی کے مطابق ہوجائیں، یعنی وہی: ''رضی اللہ عنہم ورضو

اعنــــہ"۔ "راضی ہو گیا اللہ ان سے اور راضی ہو گئے وہ اللہ سے" جس کا قرآنی خلاصہ ہے، جن لوگوں سے زیادہ اعتماد انسانیت کی تاریخ میں کسی کو حاصل نہیں ہوا، یعنی: حضرات رسل علیہم السلام ان ہی کی اعتمادی حقیقتوں کو ذریعہ بنا کر ہر ملک اور ہر قرن میں جو چیز مذہب کے نام سے پیش ہوتی رہی ہے، کون نہیں جانتا کہ اس کا حاصل یہی ہے، مذہب جس چیز کا نام ہے، یہ تو اس کا حاصل ہوا، لیکن آپ نے یہ بھی سوچا کہ لامحدود خواہشوں سے لب ریز فطرت کے ساتھ مذہب کے اس پیغام کو جوڑنے کا نتیجہ کیا نکلا؟

کوئی سمجھے، یا نہ سمجھے، لیکن ہوا یہی کہ دنیا کی معاشی پیداواروں کی محدودیت و عدم مبسوطیت کی وجہ سے لامحدود مطالبوں والی انسانی فطرت میں بے چینی اور بے اطمینانی کے جو انگارے دہک رہے تھے، مذہب کے اس پرزے کو جوڑنے کے ساتھ ہی محدود سے ہٹ کر انسانی فطرت کا رخ لامحدود کی طرف اچانک پھر گیا، انسانی فطرت کے مطالبے نہ پوری ہونے والی تمناؤں کی شکل اختیار کر کر کے آدمی کو جو تڑپا رہے تھے، شاداب بڑھتی ہوئی امیدوں اور ارمانوں کے پھول بن بن کر دہیں جہاں آگ صرف آگ بھری ہوئی تھی، شگفتہ و تروتازہ تختوں سے بھرا ہوا باغ بن گیا، جس سے زیادہ بھروسہ کسی دوسرے پر نہیں کیا جا سکتا، حتیٰ کہ خود اپنی آنکھوں، اپنے کانوں پر بھی انہیں ان ہی غیر مشکوک قطعی علمی ذرائع (رسل اللہ) کی راہوں سے انسانی فطرت اور اس کے لامحدود مطالبوں کا امالہ ایک ایسی عجیب وغریب شکل میں مذہب کے ذریعہ سے ہو جاتا ہے کہ اس کی ساری بے چینیاں چین کی اور ساری پریشانیاں سکون و عافیت کی سیڑھیاں بن جاتی ہیں۔ فطرت کے ان لامحدود مطالبوں کے استعمال کی صحیح قدرتی راہ یہی ہے، ان مطالبوں کو ہمارے اندر بھرنے والے نے اسی استعمال کے لیے بھرا تھا، پھر جو ہاتھ سے پاؤں کا اور پاؤں سے ہاتھ کا کام لے کر دکھ اور اذیت محسوس کرتا ہے، اس کا الزام استعمال کے غلط طریقوں کو اختیار کرنے والوں پر ہے، نہ کہ اس پر جس نے ہاتھ اور پاؤں کی نعمتوں سے ہمیں سرفراز فرمایا ہے۔ مذہب اسی امالہ کا ذریعہ اور صحیح آسمانی مشورہ ہے۔ یوں تو یہ بالکل ایک واضح اور کھلی ہوئی بات ہے، لیکن بدیہات پر بھی کبھی تنبیہ کی جاتی ہے۔ قرآن پڑھئے، ان تنبیہوں کے اشارے بھی اس میں آپ کو ملیں گے۔

(ماہنامہ الحق)

واقعہ معراج

نکتہ کی دو باتیں

از: رئیس التحریر **حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی**ؒ
صدر شعبہ تبلیغ دینیات جامعہ عثمانیہ حیدر آباد
ولادت: ۱۳۱۰ھ فراغت: ۱۳۲۳ھ وفات: ۱۳۷۵ تدفین: اپنے وطن گیلان بہار میں

جس چیز کو ایک طرف سے دباؤ گے، تو دوسری طرف سے اس کا ابھرنا ناگزیر ہے، آخر جو نیچے کو دبایا گیا اور مسلسل نہایت بے دردی سے دبایا گیا اور وہ دبتا ہی چلا گیا، کس قدر عجب بات ہے کہ لوگ اسی کے متعلق پوچھتے ہیں کہ وہ ''معراج'' میں اوپر کی طرف کس طرح چڑھا، کیوں چڑھتا گیا؟ آخر حد درجہ جسے نیچے دبایا گیا، اسے حد درجہ اوپر ابھرنا چاہئے تھا، اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟

معراج کے موقع پر آسمانی سیر میں پہلے آسمان پر حضرت آدم، دوسرے پر عیسیٰ و یحیی، تیسرے پر ادریس، چوتھے پر ہارون، پانچویں پر یوسف، چھٹے پر موسیٰ اور ساتویں پر ابراہیم علیہم السلام سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقت ہوئی، ہزار ہا پیغمبروں میں سے کل سات پیغمبروں اور ان میں بھی حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہو کر معمارِ کعبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زیارت پر آپ کی ملاقات کیوں ختم ہوگئی؟

اگر غور کیا جائے، تو نکتہ کی یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے جس طرح اپنے وطن جنت سے نکل کر دنیا کی ہجرت کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ (وطن) سے نکل کر مدینہ پہنچے، مدینہ میں یہودی فتنے نے آپ کو اسی طرح گھیرا، جس طرح حضرت عیسیٰ و حضرت یحیی علیہما السلام ان میں گھرے، حضرت ادریس علیہ السلام کتابت کے موجد تھے، غزوۂ بدر کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں میں نوشت وخواند کو مروج کیا، حتی کہ ہر خواندہ قیدی سے دس بچوں کو لکھنا سکھا دینا فدیہ مقرر ہو، پیغمبروں میں حضرت

ادریس علیہ السلام کے بعد آپ نے سلاطین کے نام خطوط روانہ کئے، آگے جس طرح حضرت ہارون علیہ السلام بنی اسرائیل میں ہر دلعزیز تھے، آنحضرت ﷺ ان میں محبوب تھے، پھر جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنے وطن ثانوی مصر میں جو اقتدار حاصل ہوا، وہی حضور ﷺ کو اپنے دور ہجرت مدینہ طیبہ میں چند سالوں کے بعد حاصل ہو گیا، پھر جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے وطن فلسطین پر مصر سے حملہ کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے وطن مکہ پر حملہ کیا اور اس کو مشرکوں کے اقتدار سے آزاد کرایا، حضرت ابراہیم علیہ السلام بانیٔ کعبہ تھے، آپ ﷺ نے کعبہ پر قبضہ کر کے پھر اس کو حضرت ابراہیم علیہ السلام بانیٔ کعبہ کی مسجد بنا دیا اور اسی پر زندگی ختم ہوگئی"۔

"النبی الخاتم"

از مولانا مرحوم، ص: ۵۵، ۵۲،

مکتبہ رشیدیہ لاہور



فہرست تصانیف سید محمد اکبر شاہ بخاری

علمائے دیو بند کے شاندار کارنامے	مقالات مفتی جمیل احمد تھانویؒ
اکابر علمائے دیو بند	چالیس بڑے مسلمان (2 جلد)
تذکرہ اولیاء دیو بند	خطبات اکابر (5 جلد)
کاروانِ تھانویؒ	خطبات احتشام (6 جلد)
فیضانِ تھانویؒ	بیس علمائے حق
اکابرین مجلس صیانۃ المسلمین پاکستان	اکابرین وفاق المدارس پاکستان
سلسلۂ اشرفیہ کے سو بڑے علماء	تذکرہ شیخ الاسلام پاکستان علامہ شبیر احمد عثمانیؒ
خطبات مفتی اعظمؒ	خطبات شیخ الاسلام پاکستان علامہ عثمانیؒ
مقالات مفتی اعظمؒ	حیات مولانا احتشام الحق تھانویؒ
معارف مفتی اعظمؒ	حیات علامہ ظفر احمد عثمانیؒ
مفتی اعظم پاکستان اور ان کے ممتاز تلامذہ وخلفاء	مقالات علامہ ظفر احمد عثمانیؒ (2 جلد)
مفتی اعظم پاکستان اکابر و معاصر کی نظر میں	مقالات ترمذیؒ (مفتی عبد الشکور ترمذی)
چند عظیم شخصیات (تاثرات مفتی اعظمؒ)	مقالات حکیم الاسلام قاری محمد طیبؒ
خطبات علامہ ادریس کاندھلویؒ	ذکر طیب (قاری محمد طیبؒ)
حیات علامہ ادریس کاندھلویؒ	خطبات طیبات (قاری محمد طیبؒ)
مفتی محمد حسن امرتسریؒ اور ان کے خلفاء	تذکرۃ الشیخ (مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ)
ذکر خیر محمد جالندھریؒ	معارف شیخ الحدیث مولانا زکریا کاندھلویؒ
یاد شریف جالندھریؒ	تحریک پاکستان اور علمائے دیو بند
تذکرہ خطیب الامتؒ	تحریک پاکستان کے عظیم مجاہدین (تاریخی دستاویز)
ذکر متین خطیب	پچاس مثالی شخصیات

حضرت مولانا اظہرؒ سہلٹی

مقالات گیلانیؒ (سے مناظر احسن گیلانیؒ)

مقالات سید بدر عالم میرٹھیؒ

سیرت بدر عالمؒ

پاک وہند کے نامور علماء ومشائخ

پچاس جلیل لقدر علماء

خطبات ومقالات مفتی عبدالقادرؒ

مقالات مفتی عبدالحکیم سکھرویؒ

مقالات ومضامین مولانا شمس الحق

خطبات ومقالات مولانا نذیر احمدؒ

خطبات مالک کاندھلویؒ

حیات مالک کاندھلویؒ

سید محمد اکبر شاہ بخاری

خادم مدرسہ اشرفیہ احتشام العلوم جام پور

ضلع راجن پور (پنجاب)